سرورق پہلے والا ہے، بیک ٹائٹل پر دیا گیا میٹر ۲۰۱۴ء کا ہے

حیدر قریشی کی اب تک کی کتابیں

(یہ کتابیں مختلف شعری،نثری اور نثری وشعری مشترکہ کلیات کے کتابی اور انٹرنیٹ ایڈیشنز میں شائع ہو چکی ہیں)

تخلیقی ادب

سلگتے خواب (غزلیں)
عمرِ گریزاں (غزلیں،نظمیں اور ماہیے)
محبت کے پھول (ماہیے)
دعائے دل (غزلیں،نظمیں)
درد سمندر (غزلیں،نظمیں،ماہیے)
زندگی (غزلیں،نظمیں،ماہیے)
روشنی کی بشارت (افسانے)
قصے کہانیاں (افسانے)
میری محبتیں (خاکے)
کھٹی میٹھی یادیں
فاصلے قربتیں (انشائیے)
سوئے حجاز (عمرہ وحج کا سفرنامہ)

....

تنقید و تبصرے

حاصلِ مطالعہ — **تاثرات** — **مضامین اور تبصرے**
ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت
ڈاکٹرگوپی چند نارنگ اور ما بعد جدیدیت
ستیہ پال آنند کی ”.....بودنی نابودنی“

....

اردو ماہیا تحقیق و تنقید

اردو میں ماہیا نگاری.....اردو ماہیے کی تحریک.....
اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما
اردو ماہیا..........اردو ماہیے کے مباحث

....

حالاتِ حاضرہ (انٹرنیٹ کالموں کے مجموعے)
منظر اور پس منظر — **خبر نامہ**
ادھر اُدھر سے — **چھوٹی سی دنیا** (صرف ای بک)
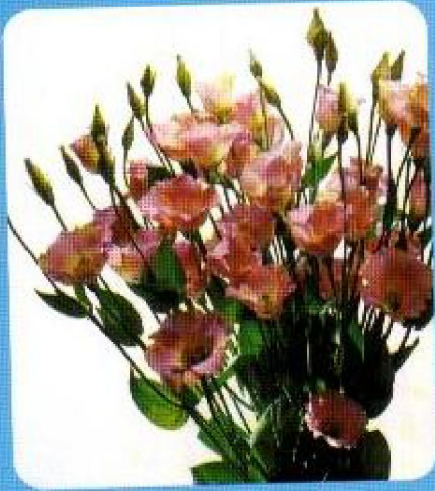
سروَر ادبی اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

جدید ادب

www.jadeedadab.com

شمارہ:7 (جولائی تا دسمبر2006ء)

رابطہ کرنے کے لئے اور تخلیقات بھیجنے کے لئے ایڈریسز

1-Haider Qureshi Rossertstr.6 , Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany.

2-Prof. Nazar Khaleeq H.No.396, Model Town-B, Khanpur-64100,(Pakistan)

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر ان ای میل ایڈریسز پر بھجوائیں۔شکریہ!

hqg786@arcor.de اور khaleeqkhanpur@yahoo.com

فہرست

ضروری اعلان

جدید ادب کی بیشتر فائلز تیار ہو چکی تھیں لیکن بالکل آخری مرحلہ میں کمپیوٹر کی خرابی کی وجہ سے ساری فائلز ضائع ہو گئیں۔ان میں سے چند فائلیں دوسری سی ڈی میں محفوظ کی ہوئی تھیں، سوانہیں تھوڑی محنت کے بعد تلاش کر لیا گیا۔جو دوست انٹرنیٹ کے ذریعے رابطے میں تھے،ان سے بھی میٹر دوبارہ منگا لیا گیا۔تاہم جن سے بروقت رابطہ نہیں ہو سکا یا جن سے انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ نہ تھا، وہ ساری منتخب شدہ نگارشات اس شمارہ میں شامل کرنا ممکن نہ تھا۔اس لئے وہ تمام احباب جن کی نگارشات اس شمارہ میں شامل نہیں ہو سکیں،ان سب سے معذرت کرنے کے ساتھ درخواست ہے کہ اب اگلے شمارے کے لئے اپنی نئی اور غیر مطبوعہ نگارشات بھیج دیں۔شکریہ!

''لکھنے کے لئے ایک اضطراب اور بے چینی بہت ضروری ہے۔۔۔۔کشف کے بڑے سے بڑے تجربے کے بعد بھی ایک کسک، ایک بے چینی تو موجود رہتی ہے۔لکھنا بھی ایک مکاشفہ ہی ہے۔لکھنے والا مطمئن ہو جائے تو صورت حال کا غلام بن جاتا ہے۔اس کے اندر در باری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے لفظوں سے وہی کام کرتا ہے جو بھانڈ اپنی حرکتوں سے کرتا ہے۔تفریح اور حظ آفرینی میں ایک فرق ہے۔لکھنے والا اپنی ہر تحریر میں خود موجود ہوتا ہے۔میں اپنے ہر کردار کے اندر بھی ہوں اور اس سے باہر بھی۔ایک اضطراب مجھے لئے لئے پھرتا ہے''

اقتباس از **تمنا بے تاب** خودنوشت **ڈاکٹر رشید امجد** صفحہ نمبر ۲۷۵

گفتگو! مغربی ممالک میں جہاں جہاں اردو کے چرچے ہیں،ان کے حوالے سے اردو زبان اور ادب کی بین الاقوامیت کا چرچا کیا جاتا ہے۔اگر تو واقعتاً اردو زبان اور ادب بین الاقوامی حیثیت اختیار کر رہے ہیں تو بڑی خوش بختی کی بات ہے۔لیکن اگر حقائق کچھ اور ہیں تو پھر خوش فہمیوں پر کچھ کہنا بے کار ہے۔

اس موضوع سے متعلق چند بنیادی سوالات کے جواب تلاش کرنے پر صورت حال بہتر طور پر واضح ہو سکے گی۔

کیا مغربی ممالک میں مقیم اور اردو سے محبت کرنے والوں کی نئی نسلیں اردو سے اس حد تک منسلک ہیں کہ اردو لکھنا اور پڑھنا جانتی ہیں؟اس سلسلے میں جو بھی قابلِ قدر کاوشیں ہوئی ہیں ان کا اب تک کیا نتیجہ نکلا ہے؟اعداد و شمار کی زبان میں وضاحت کی جا سکتی ہے۔

کیا مغربی ممالک میں مقیم اردو والوں کی نئی نسل میں سے وہاں رہتے ہوئے اردو شعر و ادب سے کوئی تخلیقی نوعیت کی وابستگی سامنے آئی ہے؟یعنی کیا مغربی ممالک میں نئی نسل میں سے کوئی شاعر اور ادیب سامنے آیا ہے؟

اگر ان دونوں بنیادی سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو اردو کی بین الاقوامی حیثیت کے دعووں کے باوجود صورتحال تشویشناک دکھائی دیتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان اور انڈیا سے مغربی ممالک میں آ بسنے والے شاعر اور ادیب ہی یہاں ادبی سرگرمیوں کا سبب ہیں۔اس میں مزید اضافہ اُن ''غیر شاعروں'' کی تعداد سے ہو رہا ہے جو شاعر نہ ہو کر بھی نقد ادائیگی کر کے لکھے لکھائے اور چھپے چھپائے شعری مجموعے حاصل کر کے شاعر بن رہے ہیں۔

اگر اس نوعیت کے شعراء کی تعداد میں اضافہ ہونا اور پاکستان اور انڈیا میں ان سے اپنے مفادات وابستہ رکھنے والی ''شاعرگر'' ادبی شخصیات کے مفادات کا پورا ہونا اردو ادب کا فروغ ہے تو پھر بے شک یہاں اردو ادب فروغ پا رہا ہے وگرنہ مغربی ممالک میں اردو کے سلسلے میں ہونے والی زیادہ تر سرگرمیاں محض ثقافتی قسم کے میلے ٹھیلے جیسی ہیں۔

مغربی ممالک میں مقیم وہ شاعر اور ادیب جو بیرون ملک آنے سے پہلے سے اپنی ادبی شناخت رکھتے تھے، ان سے ہٹ کر باقی شاعروں اور ادیبوں کی عمومی صورتحال دیکھی جائے تو اس نام نہاد عالمی اردو ادب سے ''شاہ عالمی لاہور'' کا اردو ادب کہیں زیادہ معیاری دکھائی دیتا ہے۔ہمارے معاشرے کے متعدد دوسرے شعبہ ہائے حیات کی طرح یہاں بھی اب نمبر دو قسم کے لوگ غلبہ پانے لگے ہیں۔کتنا اچھا ہو کہ اردو اور ادب سے سنجیدہ وابستگی رکھنے والے شعراء و ادباء اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کھل کر بات کر سکیں۔

جدید ادب کے وسائل کے سلسلے میں نہ پہلے کبھی لکھا ہے نہ اب لکھنا ہے،بس اتنا بتانا ہے کہ بعض مالی مجبوریوں کے باعث اگلا شمارہ جنوری ۲۰۰۷ء کی بجائے (بشرطِ زندگی) جولائی ۲۰۰۷ء میں لا سکیں گے،البتہ اس کی ضخامت چار سو صفحات سے کم نہیں ہوگی۔انشاءاللہ!

حیدر قریشی

جدید ادب

حمدیہ

عمر خیام اور صبا اکبرآبادی

(**نوٹ:** صبا اکبرآبادی نے 74 -1973 کے دوران عمر خیام کی بارہ سو سے زیادہ رباعیات کا اردو رباعی میں ترجمہ کیا ہے، 1975 میں صرف ایک سو رباعیات کا ترجمہ Fitz Gerald کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ ''دستِ زرفشاں'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس کو ادبی حلقوں میں بیحد سراہا گیا۔ صبا صاحب کی رباعیات کا یہ ترجمہ بھی ان کے ذخیرۂ ادب کی طرح غیر مطبوعہ ہے۔ **نذر خلیق**)

جز ہست خدا نیست یقین میدانم　　از دفتر کائنات این می خوانم
چون دیدۂ دل بہ نورِ حق بیناشد　　شد ظلمت کفر محو در ایمانم　　**خیامؔ**

جز ذاتِ خدا کچھ نہیں جانا میں نے　　کل دفترِ کائنات چھانا میں نے
کی دیدۂ بینا سے تلاشِ ایماں　　تاریکیِ کفر کو نہ مانا میں نے　　**صباؔ**

نے عقل بغایت جلال تورسد　　نے فکر بہ کُنہ لا یزال تورسد
در کنہِ کمالات نرسد ہیچ کسے　　گو غیر تو تا کبنہ کمالِ تورسد　　**خیامؔ**

کیا عقل ترے جلال تک پہنچے گی　　کیا فکر حدِ محال تک پہنچے گی
کیا تیرے کمالات کو سمجھے کوئی　　بس بات ترے کمال تک پہنچے گی　　**صباؔ**

کو دل کہ بداند نفسے اسرارش　　کو گوش کہ بشنود دمے گفتارش
معشوقہ جمال می نماید شب و روز　　کو دیدہ کہ تا برخورد از دیدارش　　**خیامؔ**

وہ دل ہے کہاں سمجھے جو اُس کے اسرار　　وہ کان کہاں سنیں جو اس کی گفتار
وہ تو شب و روز جلوہ آرا ہے مگر　　آنکھیں کس کی ہیں کر سکیں جو دیدار　　**صباؔ**

کب تک مرے مولا

شاذ تمکنت (مرحوم)

اِک حرفِ تمنّا ہوں، بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مرے مولا
اے دِل کے مکیں دیکھ یہ دل ٹوٹ نہ جائے
کاسہ مرے ہاتھوں سے کہیں چھوٹ نہ جائے
مَیں آس کا بندہ ہوں بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مرے مولا
سر تا بقدم اپنی مرادوں کو سنبھالے
جاتے ہوئے تکتے ہیں مجھے قافلہ والے
میں لالۂ صحرا ہوں بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مرے مولا
اے دستِ طلب کیوں تری باری نہیں آئی
کہنا مرے آقا کی سواری نہیں آئی
تصویروتماشا ہوں بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مرے مولا
ممکن نہیں یہ آنکھ تری دید کو ترسے
ہر رنگ میں دیکھوں تجھے دیوار سے، دَر سے
میں تو ترا رستہ ہوں بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مرے مولا
اے کاشفِ اسرارِ نہانی ترے صدقے
اب شاذ کو دے حُکمِ روانی ترے صدقے
ٹھہراہُوا دریا ہُوں بڑی دیر سے چُپ ہوں
کب تک مرے مولا

نعتیہ رباعیات

صبا اکبرآبادی (مرحوم)

اللہ کی رحمت ہے محمدؐ کے لئے
تکمیلِ رسالت ہے محمد کے لئے
ہوتے نہ محمد تو نہ ہوتا کچھ بھی
کونین کی خلقت ہے محمد کے لئے

ہر نور میں تحلیل تمہارا جلوہ
ہر سورۂ تنزیل تمہارا جلوہ
اسلام کے ارکان ، تمہاری سیرت
اسلام کی تکمیل تمہارا جلوہ

ہے دینِ خوش انجام تمہارے دم سے
قرآں کے ہیں احکام تمہارے دم سے
اے صلِ علیٰ ہے یہ تمہارا اعجاز
اسلام ہے اسلام تمہارے دم سے

آداب و عقیدت کے مقامات ہیں اور
آثارِ امامت کے مقامات ہیں اور
کیا سدرہ ہے کیا عرش و حجابِ عظمت
انوارِ نبوت کے مقامات ہیں اور

رستہ حسینؑ کا

عتیق الرحمن صفیؔ (گجرات)

حالات کر رہے ہیں تقاضا حسین کا
بس حل ہے اس کا ایک ہی جذبہ حسین کا
مسلم! ترے وجود کی ہے اس میں ہی بقا
چُپ چاپ پھر سے چُن لے تُو رستہ حسین کا
کرب و بلا کا واقعہ پھر سے ہے رونما
ہے کوئی جو نبھائے گا دعویٰ حسین کا
مثلِ مہِ تمام ازل تک رہے گا نام
ابدی حقیقتوں میں یوں زندہ حسین کا
کب رک سکا ہے ظلم سے بھی حق کا راستہ
گرچہ تھا راہ ظلم نے روکا حسین کا
یا رب عطا ہو پھر ہمیں وہ سوزِ آگہی
ہم مٹ رہے ہیں بھول کر نامہ حسین کا
حق بات ہو گی جب بھی کبھی لوگ لیں گے نام
ہر دور میں رہے گا یوں چرچا حسین کا
جب جب ہوا ہے ظلم صفیؔ بے کسوں پہ تو
دل نے دعا میں بارہا سوچا حسین کا

دُعا

عاکفؔ غنی (فرانس)

مجھ پہ بارانِ الطاف کر دیجیے
داغِ عصیاں مرے صاف کر دیجیے

میرے وجدان میں کیجیے روشنی
کیجیے چاروں اطراف کر دیجیے

رحمتِ خاص کا میں طلبگار ہوں
میرے جُرموں کا اتلاف کر دیجیے

علم و فن کے دیوں سے کروں روشنی
مجھ میں بیدار اوصاف کر دیجیے

میں گنہ گار ہوں میں سیہ کار ہوں
بارِ عصیاں میں اخفاف کر دیجیے

خیر لکھ دیجیے میرے شر کی جگہ
میری قسمت میں احراف کر دیجیے

اپنے فضل و کرم سے مرے قلب کو
مرکزِ نورِ ایلاف کر دیجیے

دعا

زاہد آزاد جھنڈانگری (نیپال)

تو میرے حق میں کوئی نیک فال دے مولا
کبھی تو بخت مِرے کو اجال دے مولا

نہ کوئی چاند ،نہ سورج ہو اس قدر روشن
مِرے عمل کو وہ حسن و جمال دے مولا

خزاں رتوں میں بھی دیکھوں گلاب کھلتے ہوئے
مِری نظر کو تو ایسا کمال دے مولا

مجھے نہ کبر ہو،بھٹکوں نہ راہ سے تیری
میں ڈگمگاؤں اگر تو سنبھال دے مولا

عمل کے نور سے مٹ جائے ظلمتِ باطل
دلوں سے بغض و حسد کو نکال دے مولا

بہارِ زہد کے جلووں سے جی اٹھا زاہدؔ
بہشت جس سے خریدوں وہ مال دے مولا

یا رسول اللہ ﷺ

حیدر قریشی

ابھی جو آپ سے دل نے کہا ہے یا رسولؐ اللہ
وہ سب کچھ آپ نے سُن ہی لیا ہے یا رسولؐ اللہ
زمیں ہے تنگ اور کرب و بلا ہے یا رسولؐ اللہ
بنا محشر کے اک محشر بپا ہے یا رسولؐ اللہ
ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یا رسولؐ اللہ
ہمارے ہی گناہوں کی سزا ہے یا رسولؐ اللہ
یقیناً شامتِ اعمال اس انجام تک لائی
خدا ناراض، دنیا بھی خفا ہے یا رسولؐ اللہ
ابھی نہلا گئے ساتوں سمندر خشک آنکھوں کو
ابھی بھی میل اندر جا بجا ہے یا رسولؐ اللہ
ابھی کچھ اور بھی چشمِ کرم کا لطف فرمائیں
ابھی بھی ذہن،دل سے کچھ جدا ہے ، یا رسولؐ اللہ
کسی زہد و ریاضت کے نتیجہ کی نہیں حالت
یہ سر بارِ گنہ سے جھک گیا ہے، یا رسولؐ اللہ
زباں کی لغزشیں اللہ تعالیٰ بخش دے شاید
کہ اب وردِ زباں صلِّ علیٰ ہے یا رسولؐ اللہ
نئی تختی سجائی ہے، درِ دل پر ابھی حیدرؔ
اور اس تختی کے اوپر لکھ لیا ہے یا رسولؐ اللہ

ڈاکٹر رشید امجد (راولپنڈی)

پاکستانی ادب کے نمایاں رجحانات

قیام پاکستان کے وقت ترقی پسند تحریک پورے دم خم کے ساتھ موجود تھی اور اچھا لکھنے والوں کی ایک موثر تعداد اس سے وابستہ تھی۔ ترقی پسند تحریک نے موضوعات ہی کو وسعت نہیں دی بلکہ بیانیہ حقیقت نگاری میں بھی متنوع تجربات کے دروازے کھول دیئے۔ نئی ادبی بحثوں اور عام طبقے کی نمائندگی نے تفہیم و ترسیل کے نئے معیار متعارف کروائے۔ افسانے میں شہری زندگی کے ساتھ ساتھ دیہاتوں کی زبوں حالی اور کسانوں کے مسائل نیز ان کے رہن سہن اور کردار واطوار کی عکاسی نے اردو کہانی کا موضوعاتی کینوس بہت وسیع کر دیا۔ شاعری میں بھی محبت کے روایتی مضامین کے پہلو بہ پہلو معاشرتی و سیاسی مسائل کا ذکر ہونے لگا، یوں ترقی پسند تحریک نے ادب کے موضوعاتی دائرے کو معاشرے کی نچلی سطح تک پھیلا کر ادب اور زندگی کے رشتوں کو وسیع اور مضبوط کر دیا۔ موضوعات کے اس تنوع نے اسلوب و اظہار پر بھی اثر ڈالا اور حقیقت نگاری میں اظہار و انداز کے نئے پیرائے وجود میں آئے۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ رومانی تحریک کے اثرات بھی قائم رہے لیکن بیسویں صدی کی دوسری، تیسری اور چوتھی دہائی کے برعکس رومانیت پسندوں کے یہاں بھی ترقی پسند تحریک کے اثرات کی وجہ سے ایک تبدیلی آئی اور معاشرتی شعور گہرا ہوا۔ تیسری اور چوتھی دہائی کی نئی ادبی بحثوں، مغربی افکار کے پھیلاؤ اور نئے اسالیب (جس کا زیادہ اظہار نظم میں ہوا) نے بھی اپنا اثر ڈالا اور ترقی پسند اور رومانیت پسند دونوں لکھنے والوں کے یہاں اسلوب و انداز اور اظہار کی تبدیلیاں ہوئیں۔ حلقہ ارباب ذوق اگرچہ باقاعدہ تحریک نہ تھی لیکن ایک رجحان اور رویئے کے طور پر اس کے اثرات بھی گہرے ہیں۔ اوّل اوّل حلقہ کو ترقی پسند تحریک کا ردعمل سمجھا گیا لیکن حلقہ کے ابتدائی جلسوں ہی میں بعض ترقی پسندوں کی شرکت نے اسے غلط ثابت کیا۔ حلقہ موضوعات کی حد بندی کا قائل نہ تھا، وہ صرف ادبی و فنی اقدار اور جمالیاتی اقدار کی پاسداری کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس کی بحثوں میں مغربی افکار کے اثرات نمایاں تھے۔ جنگ عظیم دوم کے دوران اور بعد میں جو اقتصادی اور معاشرتی ابتری پیدا ہوئی اس کا اثر اخلاقیات پر بھی پڑا۔ جنگ عظیم دوم کے عالمی پس منظر میں ہونے والی شکست و ریخت کا اثر برصغیر پر بھی پڑا۔ اقتصادی بحران، بیروزگاری اور سماجی عدم تحفظ نے نئے نئے موضوعات کو متعارف کروایا۔ ان نئے مسائل

نے اظہار و اسلوب پر بھی اپنے اثرات ڈالے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ ساری ادبی صورتحال اسی طرح رہی البتہ موضوعاتی طور پر چار پہلو زیادہ نمایاں ہوئے۔

اوّل: فسادات کا المیہ، محرومی اور انسانی جانوں کے ضیاع پر دکھ اور غم

دوّم: ہجرت کا دکھ، پرانی زمین اور آبائی گھروں کی یاد جس نے ایک نئی طرح کی تنہائی اور مایوسی کو جنم دیا۔

سوم: نئی مملکت کے بارے میں ٹوٹتے خواب کہ کچھ عرصہ بعد ہی احساس ہونے لگا کہ جس بڑے مقصد کے لیے اتنی بڑی قربانی دی گئی ہے وہ ابھی دور ہے اور لوٹ کھسوٹ ہی کا ایک نیا نظام وجود میں آ گیا ہے۔

چہارم: کچھ خوش فہمیاں جن کی بنیاد پر ہجرت کے سارے عمل سے مطمئن ہونا تھا۔

یہ چاروں رویّے مختلف طریقوں سے موضوعات کا حصہ بنے۔ فسادات کا المیہ واقعاتی سطح پر افسانے میں کئی اچھی کہانیوں کا موضوع بنا۔ شاعری میں یہ صرف تاثر اور احساس کی حد تک اظہار پایا۔ ہجرت کا دکھ اور تنہائی افسانے اور شاعری دونوں میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوئی۔ دوسرے دونوں رویّے یعنی نئی مملکت کے بارے میں ٹوٹتے خواب اور خوش فہمی زیادہ تر شاعری کا موضوع بنے۔ اس دوران پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی تحاریک کا ذکر بھی سننے میں آیا لیکن پاکستانی ادب کی تعبیر کرنے والے تخلیقی سطح پر کوئی قابل ذکر کام نہ کر سکے اور یہ موضوع صرف تنقیدی بحثوں تک ہی محدود رہا۔ اسی طرح اسلامی ادب کی بات کرنے والے بھی ادبی معیار اور جمالیاتی اقدار کی اعلیٰ سطح کو نہ چھو سکے اور اسلامی ادب لکھنے والے کبھی بھی ادباء کی فہرست میں شامل نہ ہو سکے۔ ان کی حیثیت دوسرے درجے کے ان لکھنے والوں ہی کی رہی جن کا ذکر قابل ذکر تنقید میں کبھی نہ آ سکا۔ قیام پاکستان سے 60ء تک کا زمانہ موضوعاتی اور فنی سطح پر روایت کے تسلسل کا زمانہ ہے۔ بیانیہ حقیقت نگاری اور زبان و بیان کے وہی سانچے، اپنی روایتی ہیئت و تکنیک کے ساتھ مقبول رہے اور پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے نئے لکھنے والے بھی اسی ڈگر پر چلتے رہے جس کا آغاز بیسویں صدی کی پہلی دوسری دہائیوں میں ہوا تھا۔

ساٹھ کی دہائی میں موضوعاتی اور فنی دونوں سطحوں پر بڑی تبدیلیاں آئیں۔ بعض انتہا پسند ترقی پسندوں کے رویّے نے تحریک کے بارے میں ایک منفی ردعمل پیدا کیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی نے تنظیمی ڈھانچے کو ختم کیا تو تحریک کی مرکزیت بھی متاثر ہوئی، دوسری طرف پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کا نعرہ لگانے والے خود تو تخلیقی سطح پر کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ البتہ ان کے سارے استدلال اور قوت ترقی پسندوں کے خلاف اعتراضات پر صرف ہوئی۔ اس سے بھی ترقی پسندوں کے بارے میں ایک عمومی منفی رویہ پیدا ہوا۔ تیسری طرف سیاسی حالات کی ابتری نے بھی ایک قومی بے سمتی کو جنم دیا۔ چنانچہ ساٹھ کی دہائی میں جو نسل سامنے آئی اس نے خود کو اعلانیہ غیر نظریاتی کہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترقی پسند تحریک کی وجہ سے خارجی حقیقت نگاری کا جو رجحان پروان چڑھا تھا وہ داخل کی طرف مڑ گیا۔ کردار سائے بن کر بے نام ہوئے اور ٹھوس واقعات کی بجائے خیال اور

آئیڈیا کہانی میں اہم ہوئے۔شاعری میں بھی جوافسانے کے مقابلے میں داخلی احساسات کی زیادہ ترجمان ہوتی ہے۔داخلیت پسندی گہری ہوکرنفسیاتی دروں بینی اوردوسری ذات کی تلاش کی محرّک ہوئی۔نئی لسانی تشکیلات، استعارہ سازی کا نیا تصور، علامت وتجرید کی بحثیں موضوعات پر حاوی ہوگئیں۔ہیئت وتکنیک کے نئے تجربوں اور اسلوب واظہار کے نئے انداز نے تفہیم وترسیل کے مسائل پیدا کردیئے۔ایک حوالے سے دیکھا جائے تو یہ دہائی ترقی پسند تحریک کے ردعمل کا زمانہ ہے۔موضوعات کا دائرہ سمٹ گیا اور ہیئت وتکنیک اوراسلوب واظہار کے نئے تجربوں کی راہیں کھلیں۔معاشرتی سطح پر یہ بے سمتی اور عدم فکر کا زمانہ ہے۔سیاسی نظام کی جگہ لینے والا مارشل لائی نظام بھی ناکام ہوگیا تھا اورصورتحال کو بدلنے کے تمام دعوے غلط ثابت ہوگئے تھے۔اس بے سمتی نے ایک مجموعی لاتعلقی کوجنم دیا۔جس کے نتیجے میں نظریات کی اہمیت کم ہوگئی اور تکنیک وڈھانچہ جاذب نظر بن گئے۔ افسانے میں علامت وتجرید نے پرانے ڈھانچے کویکسر بدل دیا، انتظار حسین نے اگرچہ داستانی لہجے اور کرداروں کی مدد سے روایت کوقائم رکھنے کی ایک سعی کی لیکن انورسجاد کے نئے انداز نے نوجوان نسل کوزیادہ متوجہ کیا۔نظم میں افتخار جالب کے حوالے سے ایک پوری نسل اس راہ پرگامزن ہوئی۔غزل نے اگرچہ اپنی مخصوص ہیئت وتکنیک اور اظہار کی وجہ سے زیادہ اثر قبول نہ کیا لیکن کسی نہ کسی حدتک اس کے اظہار کے انداز بھی بدلے۔اس دور کی ساری ادبی بحثیں جدیدیت کے اسی نئے تصور کے گردگھومتی ہیں۔حلقہ ارباب ذوق کی نشستوں میں بھی انہی نئی تشکیلات اورہیئت وتکنیک کے نئے تجربوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ساٹھ کی دہائی کے دوران ایک اہم رویہ اوررجحان زمین کی اہمیت کے حوالے سے سامنے آیا۔اس کے محرک وزیرآغا تھے۔اپنی دھرتی سے وابستگی کے اس احساس اور رویے نے پاکستانی ادب میں پہلی بار اپنی زمین کی اہمیت کا احساس پیدا کیا جو 65ء کی جنگ کے بعد اور مضبوط ہوا۔ شروع میں اسے دھرتی پوجا کہہ کررد کرنے کی کوشش کی گئی لیکن 65ء کی جنگ کے بعد دھرتی کی محبت ایک زندہ حقیقت بن گئی۔ادبی قومیت کی ایک بحث جیلانی کامران نے بھی شروع کی لیکن اس ادبی قومیت میں مقامی زمین کی اہمیت نہ تھی اس لیے یہ مقامی ادبی قومیت کی بجائے عربی عجمی قومیت کی ایک بدلی صورت تھی۔وزیرآغا کی ادبی قومیت اپنی دھرتی، اس کے مظاہر اور ثقافت سے منسلک تھی اوریہی ادبی قومیت پاکستانی ادب کی بنیادی اساس بھی ہے۔وزیرآغا ادب میں نئے تجربوں اور نئے اسلوب کے حامی تھے، اس لیے انہوں نے اظہار کے نئے رویوں کو خوش آمدید کہا اوراپنے تنقیدی مضامین میں ان کی بہتر توجیحات پیش کیں اور نئے لکھنے والوں کو پروموٹ کیا۔

ستر کی دہائی کے آغاز ہی میں معاشرتی اور سیاسی طور پر مارشل لاء کے خلاف ایک بڑے ردعمل نے سمت اورنظریے کی بحثوں کو پھرتازہ کردیا۔اعلانیہ خودکوغیرنظریاتی کہنے والوں نے نظریہ کی بات شروع کردی۔ افتخار جالب نے استعارے کی شاعری کومنافقت کی شاعری کہہ کراپنی نئی لسانی تشکیلات کے سارے تصور کو دھندلا دیا۔وہ تمام نئے لکھاری جو ذات کے تشخص اور دوسری ذات کی تلاش کے سحر میں ڈوبے ہوئے تھے باطن سے

خارج کی طرف مڑے تو ترقی پسندی کا آغاز ہوا گویا ایک حوالہ سے ترقی پسند تحریک کا احیاء ہوگیا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اب نوترقی پسند موضوع کے ساتھ ساتھ فن کی جمالیاتی اقدار اوراظہارواسلوب کی خوب صورتی اور ہنرکاری کے بھی قائل تھے۔افسانہ، نظم اورغزل کے حد سے بڑھے تجریدی اورعلامتی رویہ میں ایک اعتدال آیا۔جس طرح قومی سفراندر سے باہر کی طرف مڑا تھا اسی طرح فنکار کا رخ بھی باطن سے خارج کی طرف ہوا۔انتہا پسند اسلوبی رویّے ایک متوازن انداز میں تبدیل ہوئے۔ساٹھ اورستر کے دوران بعض نئی اصناف کوبھی فروغ ملا۔ان میں انشائیہ، نثری نظم اور ہائیکو قابل ذکر ہیں لیکن نثر میں نئی نسل کی زیادہ توجہ افسانے اورشعر میں نظم اورزیادہ تر غزل کی طرف ہی رہی۔

فنی سطح پر ساٹھ اورستر کی دہائیوں میں جونمایاں تبدیلیاں ہوئیں ان میں اول تو نئی لسانی تشکیلات کے اثرات ہیں۔جن کے تحت فارسی مزاج کی بجائے اردو کا پاکستانی مزاج وجود میں آیا۔تراکیب سے گریز اوراضافتوں سے بچنے کی شعوری کوششوں نے شاعری کی زبان کوخاصا تبدیل کیا۔غزل کی پرانی لغت میں نئے الفاظ کی شمولیت نے بھی غزل کی زبان کو وسعت دی۔امیجز ، پیکرتراشی اور تمثیل کاری نے پرانے استعاراتی نظام کو یکسر بدل دیا۔ افسانوی زبان میں شعریت کے چٹ نے بیانیہ کے مقابلہ میں ایک نئی زبان کی تخلیق کی۔علامت واستعارہ کے ساتھ ساتھ افسانوں میں امیجز اور تمثیل کاری نے معنوی دبازت میں اضافہ کردیا۔داستانی انداز اوراسطوری علامتوں نے بھی افسانے کی زبان پرخاصا اثر ڈالا۔افسانے کے بعد امیجز کا سب سے زیادہ استعمال غزل میں ہوا۔ستر کی دہائی میں جب باطن کا سفر پھر خارج کی طرف مڑا تو زبان وبیان پر بھی اس کے اثرات پڑے۔دبیز علامتوں کی بجائے اکہری اورقدرے واضح علامتیں استعمال ہونے لگیں۔غزل میں غیراضافتی ترکیب سازی کے عمل نے بڑی سہولتیں پیدا کردیں۔زبان وبیان اورموضوع کی ہم آہنگی نے ابلاغ اورترسیل کی بحث کوبھی ختم کردیا۔اس میں کسی حدتک نئے ادب کی پذیرائی کوبھی دخل تھا۔دس سالوں میں مسلسل پڑھنے سے قاری کی بھی کسی حدتک تربیت ہوگئی اور لکھنے والوں کے یہاں بھی ہنرمندی اورفنی ریاضت نے آسانیاں پیدا کردیں اورابلاغ کا جو بہت سارا مسئلہ عجزبیاں کا پیدا کردہ تھا کسی حدتک دور ہوگیا۔

اسی کی دہائی میں پھر مارشل لا آگیا جس کے دوران 1979ء میں بھٹو کو پھانسی دی گئی۔ان دونوں باتوں کا شدید ردعمل ہوا اورنثر ونظم دونوں میں اتنی تخلیقات سامنے آئیں جنہیں جمع کرنے کے لیے کئی جلدوں کی ضرورت ہے۔یہ مزاحمتی ادب کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔مارشل لاء کے صرف آٹھ ماہ بعد ہی مزاحمتی ادب کا پہلا مجموعہ ''گواہی'' شائع ہوگیا۔اس کے مرتب ڈاکٹر اعجاز راہی نے اسے بارش کا پہلا قطرہ کہا۔اس میں چودہ کہانیاں شامل تھی۔یہ آواز دیکھتے ہی دیکھتے شعروادب کی ایک توانا روبن گئی۔اظہار پراس کے اثرات یہ ہوئے کہ اب بیان میں قدرے کھلاپن آگیا۔کہیں کہیں بیانیہ بھی اختیار کیا گیا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اب اس میں

سادہ بیانیہ کی بجائے ایک دبازی اور نیم استعاری انداز بھی شامل ہو گیا۔نوے کی دہائی اور بعد کا عرصہ بھی اسی غیر مستحکم سیاسی نظام کی وجہ سے بحران ہی کا زمانہ تصور کیا جائے گا۔اس دوران چار منتخب اسمبلیوں کی برطرفی در پردہ آمریت اور نہ نظر آنے والی حکومت کے احساس کو پختہ کرتی رہی۔موضوعات واظہار وانداز میں کوئی واضح تبدیلی نہ آئی اور یہ عرصہ کسی حد تک ستر کی دہائی کا تسلسل ہی دکھائی دیتا ہے۔

قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصہ بعد پاکستانی ادب اور پاکستانی ثقافت کی بحثیں زور وشور سے شروع ہو گئی تھیں۔حسن عسکری اور ممتاز شیریں نے ''نیا دور'' میں اس مسئلہ کو اٹھایا اور مسلسل مضامین لکھے لیکن تخلیقی سطح پر وہ اور ان کے ہمنوا پاکستانی ادب کی کوئی مثال پیش نہ کر سکے۔دوسری طرف اسلامی ادب کے دعویداروں نے بھی شد ومد سے اسلامی ادب کے خطوط واضح کئے لیکن ان کی تخلیقات فنی اقدار اور جمالیات سے اتنی نیچے تھیں کہ وہ ادب میں شامل نہ ہوسکیں۔ترقی پسند تحریک کے خلاف جتنے محاذ بنے ان کی بحثیں چاہے کتنی بھی بے جان ہوں لیکن ان محاذوں میں کچھ ایسے بڑے لکھنے والے شامل تھے جن کی تخلیقات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔افسانے میں منٹو اور ممتاز مفتی جیسے بڑے لکھنے والے خود کو اعلانیہ ترقی پسندوں کے مخالف کہتے تھے۔اس دور میں حلقہ ارباب ذوق کی بحثوں میں بھی ترقی پسند تحریک پر خاصے وزنی اعتراضات ہوئے۔تنقیدی حوالے سے یہ بری بحثوں کا دور ہے اور تخلیقی میدان میں بھی نظم ونثر دونوں میں بڑے اہم نام سامنے آتے ہیں۔ساٹھ کی دہائی میں یہ ساری نظریاتی بحثیں غیر نظریاتی دور میں داخل ہوگئیں۔1958ء کے مارشل لاء نے خراب سیاسی نظام کو سنبھالنے کی بجائے اسے طرح طرح کے مسائل سے دوچار کر دیا۔ایک سیاسی اور فکری خلا پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں معاشرتی سفر کا رخ خارج سے باطن کی طرف مڑا۔موضوعات کی بجائے فنی اور لسانی بحثوں نے اہمیت حاصل کی اور انداز واظہار میں ترسیل وابلاغ کے مسائل نے جنم لیا۔1960ء کے قریب نئی لسانی تشکیلات کی بحث نے نظم کو زیادہ اور اس کے بعد افسانے کو متاثر کیا۔غزل پر یہ اثر قدرے کم پڑا۔موضوعاتی طور پر یہ دروں بینی کا دور ہے۔

مارشل لاء کے اثرات آہستہ آہستہ سرایت کر کے معاشرے کی اندرونی پرت تک پہنچ گئے۔خوف ارور بے سمتی کی فضا نے داخلیت اور نئی مابعد الطبیعاتی فکر کو جنم دیا۔دوسری شخصیت کی دریافت، باطنی شکست و ریخت، ایک شخصیت میں کئی شخصیتوں کی تلاش اور مجمع میں تنہائی کا احساس نمایاں موضوع بن گئے۔ستمبر 65ء میں قومی شناخت کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوا۔اس جنگ نے وطن پرستی اور زمین کی اہمیت کے جذبوں کو بیدار کیا۔دفاع پاکستان کے حوالے سے ایک نیا موضوع سامنے آیا جس کا زیادہ اور عمدہ اظہار شاعری میں ہوا۔خصوصاً نظم میں 1968ء کی عوامی تحریک نے نظریاتی بحث کو دوبارہ تازہ کر دیا اور نوترقی پسندی کی اصطلاح مقبول ہونے لگی۔فرد کی بجائے اب اجتماع اور خارج کی باتیں بھی ہونے لگیں لیکن یہ پرانی حقیقت نگاری کی تجدید نہ تھی بلکہ خارجی حقیقت نگاری اور باطنی دروں بینی کا ایک نیا امتزاج تھا جسے ستر کی دہائی کی نسل نے آگے بڑھایا۔سقوط ڈھاکہ کا

المیہ بھی ایک موضوع بنا۔اس کے اثرات غزل پر زیادہ ہوئے کہ ایمائیت واشاریت میں زوال کا یہ لمحہ ایک بڑی معنویت کا استعارہ بنا۔نظم اور افسانے میں شاید اس کا اثر براہ راست نہیں ہوا لیکن مجموعی قومی فکر میں ایک مایوسی اور بددلی نے ایک ایسی فضا کو جنم دیا جس کا اثر ادب پر بھی پڑا۔

1977ء کے مارشل لاء نے بے سمتی اور منافقانہ رویے کو پھر فروغ دیا۔گیارہ سالہ آمریت میں مزاحمت کا ایک نیا دور اور نیا لب ولہجہ وجود میں آیا۔1985ء کے بعد نیا سفر تو شروع ہوا لیکن ایک حوالے سے یہ بھی پرانے سفر ہی کی بازگشت تھی۔بارہ سالوں میں چار منتخب اسمبلیوں کی ٹوٹ پھوٹ نے جمہوری عمل کا اعتبار ختم کر دیا۔ایک مجموعی لاتعلقی نے بے حسی اور مایوسی کے رجحانات کو فروغ دیا۔اس کی چھاپ ادب کی سبھی اصناف پر دکھائی دیتی ہے۔

اس ساری بحث کی فنی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو یوں ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب نظم نئے فکری اور فنی تجربوں سے گزر رہی تھی دو رویے واضح طور پر سامنے آئے تھے۔ایک ن م راشد اور دوسرا میراجی کے یہاں۔راشد پرانی بحور کو نئے آہنگ سے بدلنا چاہتے تھے اور قوافی کے خلاف تھے لیکن قافیہ کی تمام تر مخالفت کے باوجود وہ بعض اوقات صرف قافیہ کے شوق میں نیا مصرعہ لے آتے تھے اس لیے صوتی اور غنائی اعتبار سے ان کا مصرعہ غزل کے مصرعہ کے قریب رہتا ہے اس کے برعکس میراجی کی نظم میں قوافی کا استعمال نسبتاً کم ہوا ہے ان کی نظم ایک وحدت ہے وہ Running Lines کی نظم ہے جس میں ہر مصرع اگلے مصرع میں ختم نہیں ہوتا بلکہ قافیہ کے ذریعے اپنے دائرے کو مکمل کرتا ہے۔میراجی کی نظم کا غنائی نظام مختلف ہے اور ان کا مصرع غزل کے مصرع کے مقابلے میں ست رو اور غنائی طور پر قدرے روکھا روکھا سا ہے۔پچھلے بچاس برسوں میں یہ دونوں روایتیں موجود رہی ہیں۔پہلی روایت میں نظم پر غزل کے غنائی اثرات نمایاں ہیں۔اس کی مثال فیض ہیں اور یہ مزاج اختر حسین جعفری اور کئی دوسرے شاعروں کے ہاں موجود ہے۔اسے راشد کی روایت کا تسلسل کہنا چاہیے۔دوسری روایت میراجی کی ہے جہاں مصرع دوسرے مصرع سے مربوط ہے اور اس کی غنائیت غزل سے مختلف ہے اس کا تسلسل مجید امجد اور وزیر آغا کے یہاں ہے۔اس کے علاوہ پرانی ہیئتوں میں پابند نظم میں بھی لکھی جاتی رہی ہے لیکن اس کا دائرہ زیادہ تر پرانی نسل کے شاعروں تک محدود ہے۔نئی نسل کے یہاں یہی دو رویے ملتے ہیں۔ان پچاس برسوں میں غزل کے فنی اور ہیئتی ڈھانچے میں کوئی بڑا تغیر رونما نہیں ہوا البتہ غزل کی زبان، اظہار اور انداز و اسلوب پر جدیدیت کے اثرات ضرور پڑے۔مصرعہ بندی، لفظوں کی نشست و چناؤ پر فارسی اثرات خاصے کم ہوئے۔امیجز کے استعمال اور غیر اضافتی ترکیب سازی نے غزل کی معنویت کو گہرا کیا۔آزاد غزل کے کچھ شور کے باوجود غزل کا مجموعی فنی ڈھانچہ برقرار رہا۔غزل میں عصری صداقتوں کا اظہار، نئے افکار، نئے انکشافات اور غزل کی لغت میں نئے الفاظ کی شمولیت نے غزل کی پسندیدگی کے گراف کو قائم رکھا۔

ان پچاس برسوں میں نظم کے بعد جس صنف نے سب سے زیادہ نئے اثرات قبول کئے وہ افسانہ ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے بعد تو افسانہ نئے ہیئتی، تکنیکی اور اسلوبی تجربوں سے آشنا ہوا۔ اسی دوران اگرچہ بیانیہ اور خارجی حقیقت نگاری کی روایت بھی چلتی رہی لیکن نئی نسل کے زیادہ افسانہ نگاروں نے تجرید، علامت اور امیجز کے امتزاج سے اردو افسانے کو ایک نئے ذائقے اور شناخت سے روشناس کرایا۔ مونولاگ، آزاد تلازمہ خیال اور مکالماتی انداز نے افسانے کے فکری کینوس کو وسیع کیا۔ ریاضی کی علامتوں، دائروں اور جیومیٹری کی اشکال کے استعمال سے تکنیک و ہیئت کے نئے تجربے ہوئے۔ ان نئے تجربوں نے کہیں کہیں تہ دار ابہام بھی پیدا کیا لیکن ستر کی دہائی تک آتے آتے ان سارے تجربوں میں ایک اعتدال آ گیا۔ غیر تخلیقی انداز سے سائنسی، فلسفیانہ اور فکری مواد کو پیش کرنے کا رویہ بہت حد تک کم ہو گیا۔ دوسری طرف بیانیہ حقیقت نگاری کا انداز بھی بدل گیا اور اس میں بھی خارجیت کے ساتھ ساتھ ایک داخلی دبازت آ گئی۔

پاکستانی ادب کے پچاس سال اس کی تاریخ بھی ہیں اور شناخت بھی۔ پچھلے چند برسوں سے پاکستانی ادب کی شناخت کا مسئلہ پھر تازہ ہوا ہے لیکن یہ بحث پرانی بحث سے مختلف ہے کہ اس وقت اس بحث کا مطلب ترقی پسندوں کے خلاف محاذ بنانا تھا لیکن اب یہ بحث پاکستانی ادب کی حقیقی شناخت کا مسئلہ ہے کہ اردو کی دوسری بستیوں میں لکھے جانے والے ادب سے پاکستانی ادب کیسے اور کیوں مختلف ہے اور ہم اس سارے ادب کو اردو ادب کہنے کی بجائے پاکستانی ادب کیوں کہنا چاہتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ فکری، تہذیبی اور لسانی تینوں حوالوں سے پاکستانی ادب کی اپنی ایک شناخت ہے۔ لسانی حوالوں سے دیکھا جائے تو پاکستانی اردو اپنے علاقائی اثرات اور دوسری پاکستانی زبانوں کے تال میل سے اس اردو سے بہت مختلف ہے جو اس وقت بھارت میں لکھی اور بولی جا رہی ہے۔ پاکستانی اردو کا اپنا ایک مزاج اور لہجہ وجود میں آ چکا ہے۔ یہ مزاج ذخیرہ الفاظ، تلفظ، لہجے اور زبان کی نئی تہذیبی روایت کی وجہ سے بھارتی اردو کے مزاج اور لہجے سے قطعی مختلف ہے۔ ہماری اردو نے پنجابی، سندھی، بلوچی، اور پشتو سے جو اثرات قبول کیے ہیں انہوں نے ایک نئے لہجے کو جنم دیا ہے جو خالصتاً پاکستانی لہجہ ہے چنانچہ اس زبان میں لکھا جانے والا ادب لسانی حوالوں سے الگ پہچان رکھتا ہے۔ دوسری بات فکری شناخت کی ہے۔ ہماری فکری روایت کی بنیادی علامتیں ہمارے ملی جذبوں اور امت مسلمہ کے تاریخی سفر سے وابستہ ہیں۔ جذباتی اور فکری طور پر ہمارے ڈانڈے اپنی مرکزیت ہی سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہندی لہجے، ہندی روایات ور ہندی دیومالائی استعاروں کی بجائے ہمارے یہاں مسلم کلچر اور تاریخ کے حوالے سے زیادہ توانا ہیں جنہوں نے ہماری علیحدہ فکری روایت کو قائم رکھا ہے۔ ہماری سوچ کا انداز ہمارے اجتماعی خواب دوسروں سے مختلف ہیں۔ چنانچہ اس فکری تناظر اور ہیئت و تکنیک اور زبان و بیاں کے حوالے سے لکھا جانے والا ادب پاکستانی ہے۔ تیسری بات تہذیبی اثرات کی ہے۔ تہذیب کی اس بحث میں پڑے بغیر کہ کسی جگہ کی تہذیب کن عوامل سے مل

کر وجود میں آتی ہے یہ بات بالکل واضح ہے کہ پاکستانی تہذیب اپنی علاقائی تہذیبوں، اجتماعی سوچ، نظریہ حیات اور اجتماعی خوابوں سے مل کر بنی ہے۔ پاکستانی ثقافت کی یہ صورت جو مجموعی فضا بناتی ہے وہ پاکستانی ہے اور ہمارے اردو ادب میں اس فضا کا اظہار اسے پاکستانی پچ دیتا ہے۔ مذہبی حوالہ بھی اپنی جگہ اہم ہے، دنیا بھر کا بڑا ادب اس حوالے سے خالی نہیں بلکہ عالمی ادب کے بعض ادب عالیہ کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی مذہبی وابستگی موجود ہے۔ سیاسی سماجی مسائل کی جو صورتیں ہمیں تیسری دنیا کے ممالک سے جوڑتی ہیں اور الگ بھی کرتی ہیں ان کے اثرات بھی ہمارے ادب پر پڑے ہیں اور موضوعاتی طور پر ان سے ایک شناخت قائم ہوئی ہے۔ زبان کے ورتارے، فارسی اثرات سے دور ہو کر اردو کے خالص پاکستانی رنگ اور لغت میں نئے الفاظ کی شمولیت، جذبات و احساسات کے اظہار میں عقیدے کے پہلو اور مجموعی فضا کے اثر نے پاکستانی ادب کو ایک الگ تشخص عطا کیا ہے۔ یہ علیحدہ تشخص، مزاج اور ذائقہ ہی پاکستانی ادب کو اردو زبان میں لکھے جانے والی دوسری تخلیقات سے الگ کرتا ہے بلکہ اسی طرح جیسے انگریزی زبان میں لکھے جانے والے ادب میں بھی برطانوی ادب، امریکی ادب یا افریقہ میں انگریزی زبان میں لکھے جانے والے افریقن ادب کی مختلف صورتیں موجود ہیں۔

پاکستان میں تخلیق ہونے والے اردو ادب نے پچیس ہی سال کے مختصر عرصہ میں ان۔۔۔ رجحانات کا کسی نہ کسی حد تک مظاہرہ ضرور کیا۔ مثلاً موجود کے اقرار کا رویہ اس ارضی وابستگی کی صورت میں نمودار ہوا جسے تمام اصنافِ ادب میں بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مگر پھر اس کا ردِعمل بھی ہوا۔ وہ یوں کہ سرزمین پاکستان ازمنۂ قدیم ہی سے ایک زرعی معاشرے کی مظہر رہی ہے۔ مگر جب پاکستان بننے کے بعد صنعتی ترقی ہوئی، شہر بڑے ہوئے، معاشی اور معاشرتی مسائل نے شدت اختیار کی، میکانکی زندگی اپنے مشینی عفریتوں کے ساتھ ظاہر ہوئی اور فرد کو اپنے سلاسل میں جکڑنے لگی تو اس کے ہاں اس بند خول کو توڑ کر باہر آنے یا کم از کم خول میں روزن تعمیر کرنے کی خواہش ضرور جوان ہونے لگی۔ یہ گویا اظہارِ ذات کی وہ خواہش تھی جس نے ہمارے فنکار کو اس بات پر مائل کیا کہ وہ موجود (مادہ) کی دیواروں کو عبور کر کے 'جوہر' کی تلاش کرے۔۔۔۔۔۔ علامتی افسانے کے رجحان نے تجریدی افسانے کو بھی کروٹ دی۔ بعینہ جیسے علامتی شاعری نے 'نثری نظم' کو تحریک دی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تجریدی افسانہ اور 'نثری نظم' ایک ہی شے کے دو نام تھے۔ اس فرق کے ساتھ نثری نظم کو نظم کے انداز میں اور تجریدی افسانہ کو افسانے کے پیرائے میں لکھا جاتا تھا۔ ورنہ اصلاً دونوں نثر میں شاعری کی سطح پر پہنچنے کی کوششیں تھیں'

(**ڈاکٹر وزیر آغا** کا اقتباس از مضمون **پاکستان کا عصری ادب**

بحوالہ کتاب نئے تناظر مطبوعہ ۱۹۸۱ء)

محمد اظہر (مظفر گڑھ)

غالب کی شاعری کے عوامی رنگ

غالب دنیا کے عظیم شاعر ہیں۔ کسی طرح بھی شیکسپ Shakespeareء سے کم نہیں۔ ان کے خیالات اور معانی کی گہرائی بعض اوقات عام قاری پہ بہت بھاری ہوتی ہے۔ میں ان کی شاعرانہ عظمت کو کسی طرح بھی ثابت کرنے نہیں جارہا کیوں وہ تو عالم شش جہات میں ایک حقیقت ہے۔ میں تو ان کی شاعری کی ایک عامی و عوامی جہت سے آپ کو متعارف کروانا چاہتا ہوں۔ مثلاً ان کی شاعری میں آموں کی تعریف، چکنی ڈلی اور بیسنی روٹی کا ذکر، دال کا ذکر، آتش بازی کا ذکر اور اس سے بھی بڑھ کر جنوری (January)، وکٹوریہ (Victoria)، ریل (Rail)، گورنمنٹ (Government)، افسر (Officer)، میکلوڈ (Mclod)، اور گلاس (glass) وغیرہ کا ذکر اس امر کا آئینہ دار ہے کہ مرزا غالب جو 15 فروری 1869 کو فوت ہوئے (جنگ آزادی کے بعد 12 سال تک زندہ رہے۔ جنگ آزادی جسے انگریزوں نے غدر کہا 1857 میں ہوا) نے ان 12 سالوں میں دلی کی بربادی اور اپنی بربادی کے باوجود انگریزوں کے لیے بھی قصیدے لکھے اور ان کی عمومی شاعری میں انگریزی الفاظ کو استعمال تک کیا جاتا رہا۔ ظاہر ہے مرزا کو انگریزی زبان تو نہ آتی تھی تاہم انگریزی نام اور الفاظ کا استعمال بھی حیران کن ہے۔

<u>مثنوی در مدح آم (آموں کی تعریف)</u>

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ مرزا غالب کو آم بہت پسند تھے، آموں کا ذکر ان کی شاعری میں کئی بار آیا ہے لیکن دیوان غالب میں آموں کی تعریف میں ایک طویل مثنوی بھی شامل ہے۔ یہ شائد کم ہی لوگ جانتے ہوں اس مثنوی کے چند اشعار حاضر خدمت ہیں۔

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے ۔۔۔ خامہ، نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مرد میداں ہے ۔۔۔ ثمر و شاخ، گوئے چوگاں ہے

اسی مثنوی میں غالب آم کا دوسرے پھلوں مثلاً انگور اور نیشکر سے تقابل بھی کرتے ہیں۔

نہ چلا جب کسی طرح مقدور ۔۔۔ بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی نا چار جی کا کھونا ہے ۔۔۔ شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے ۔۔۔ آم کے آگے نیشکر کیا ہے
اور دوڑایئے قیاس کہاں ۔۔۔ جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

پھر آموں کی تعریف میں غالب یوں بھی کہتے ہیں۔

صاحبِ شاخ وبرگ و بار ہے آم ۔۔۔ ناز پروردۂ بہار ہے آم
انگبیں کے بہ حکمِ ربّ النّاس ۔۔۔ بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مُہر گلاس

اب دیکھئے کہ گلاس (glass) ظاہر ہے انگریزی زبان کا لفظ ہے اس زمانے میں مرزا غالب نے یہ سیکھ لیا تھا اور اپنی شاعری میں استعمال بھی کر دیا۔ دہلی اور اس کے گرد و نواح میں 1857ء سے پہلے تو انگریزوں کے چند ہی خاندان رہتے تھے۔ غالب جو کہ غدر کے بعد صرف 12 سال زندہ رہے انگریزی کے الفاظ بھی سیکھ چکے اور اس پرطُرہ یہ کہ انہیں اپنی شاعری میں بھی استعمال کرنے لگ گئے تھے۔ یہ غالب کی ہشت پہلو علمی شخصیت کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک اور جگہ ''خطِ منظوم بنام علائی'' یعنی ایک خط اپنے دوست نواب علائی کے نام لکھتے ہوئے پھر آم کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم
کہ دہلی کو چھوڑیں لوہار و کو جائیں
سو اناج کے جو ہیں مطلوب جاں
نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں

اس منظوم خط سے غالب کی پھلوں اور خاص کر آم سے رغبت ظاہر ہوتی ہے۔ روزمرہ کی عام باتوں کو بھی انہوں نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

<u>مثنوی در مدح ڈلی۔</u>

چکنی ڈلی ایک قسم کی چھالیہ ہوتی ہے جسے دودھ میں پکاتے اور اُمراء مٹھاس کے لیے منہ میں رکھتے تھے اس مثنوی کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے، اسے جس قدر اچھا کہیے

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ، اسے کیا کہیے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجئے فرض
اور اس چکنی سُپاری کو سُوَیدا کہیے

<u>بیسنی روٹی</u> بیسنی روٹی کی تعریف میں ایک قطعہ یہ ہے۔

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے — مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خُلد سے باہر — جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

<u>روزہ اور افطاری</u> تہی دستی و تنگ دستی سے غالب ہمیشہ تنگ رہے۔ روزے کبھی رکھ بھی لیتے کبھی چھوڑ بھی دیتے۔ روزہ اور افطاری کے بارے میں ان کے تاثرات سنیئے۔ اس میں مزاح بھی ہے اور ان کی افتادِ طبع بھی۔

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو — اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

ایک اور رُباعی اس موضوع پر یوں ہے۔

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں؟ — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ میرا ایمان ہے غالب! لیکن — خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

غالب نے زندگی کے ہر پہلو پر شاعری کی ہے روایتی شاعرانہ عنوانات کے علاوہ روزمرہ کی زندگی پر بھی۔

<u>دال</u>

دال ویسے تو غریبوں کا کھاجا ہے۔ دال کبھی سستی اور کم قیمت ہوا کرتی تھی اور غریب آدمی کی پہنچ میں بھی تھی۔ اب تو خیر سے دال بھی ایک مہنگی چیز ہے۔ بادشاہ بھی کسی خاص طریقے سے دال پکواتے تھے۔ ذائقہ میں بہت ہی اچھی ہوتی اور ''شاہی دال'' بھی کہلاتی تھی اس ضمن میں یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جم جاہ نے دال — ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث وجدال — ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ایک قصیدہ میکلوڈ انگریز گورنر کے نام:

اس قصیدہ میں غالب نے بہت کچھ کہا ہے۔ اس کے مطالعے سے پتہ لگتا ہے کہ جیسے لدھیانہ کے کسی اخبار نے غالب کے بارے میں کوئی ایسی خبر لگا دی کہ جس سے انگریزی دربار میں ان کی پہلی سی عزت نہ رہی۔ اس قصیدہ میں وہ اس اخبار نویس کے خلاف لکھتے ہیں جس نے ان کو انگریز بہادر کی نظرِ عنایت سے محروم کیا اور بہت

سے الفاظ ایسے استعمال کرتے ہیں کہ جن سے ان کے اپنے گرد و پیش کے بارے میں علم کا پتہ چلتا ہے۔ اس قصیدے کے چند اشعار لکھ رہا ہوں۔

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام — فرمانروائے کشور پنجاب کو سلام
جم رتبہ میکلوڈ بہادر کے وقت رزم — ترک فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام
اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی — تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم — نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا انتظام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں — استاد ہو گئے لب دریا پہ جب خیام
آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب — تھا بارگاہ خاص میں خلقت کا اژدھام
وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خوان ہو — شاہان عصر چاہیے لیں عزت سے اس کا نام
خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور — بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام

اب اس قصیدہ میں لفظ نمبر بھی Nmber ہی ہے اس کا اس وقت کا مطلب عہدہ وغیرہ تھا جیسے ''نمبردار'' چلا آ رہا ہے۔ اس وقت لودھیانہ سے اخبار نکل رہے تھے اور یہ وقت وہی 1857ء کے بعد اور 1869ء تک کا ہے۔ جنوری (January) کا لفظ Rail کا لفظ، گورنمنٹ کا لفظ یوں استعمال کیا جانا ثابت کرتا ہے کہ مرزا غالب نے ان لفظوں کے مطالب کو سیکھ لیا تھا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ حیران کر دینے کے لیے کافی ہے، غالب جو کہ اردو، عربی اور فارسی دان تو تھے انہوں نے انگریزی کے الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔

<u>1857ء کا دلی ''خط منظوم بنام علائی'' میں۔</u>

1857ء میں دلی کو انگریزوں نے برباد کر دیا۔ انگریز حاکموں نے مسلمانوں کو جا بجا پھانسیاں دیں۔ درختوں کے ساتھ مسلمانوں کی لاشیں ہفتوں لٹکتی رہیں اس وقت غالب دہلی میں موجود تھے۔ ایک منظوم خط اپنے دوست نواب علائی کے نام لکھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بس کہ فعّالِ مایُرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

☆☆☆

ڈاکٹر انور محمود (اسلام آباد)

کافکا کی کہانی ''بالکونی پر'' کے اسلوبی اور فکری زاویے

جرمن ادیب فرانز کافکا کی کہانی "Auf der Galerie" (بالکونی پر) ایک نہایت ہی مختصر کہانی ہے جو صرف دو پیروں پر مشتمل ہے لیکن اس کے باجود یہ اپنے اندر اسرار و رموز کے خزانے چھپائے ہوئے ہے اور ایک ایسی گتھی ہے جسے سلجھانا نہایت ہی دشوار کام ہے۔ یہ کہانی کافکا کی جرمن زبان کے استعمال پر مکمل مہارت، نثر میں اس کے کمالِ فن اور اس کی باریک بین نگاہوں سے زندگی کے مشاہدات کو فن کے سانچے میں ڈھالنے کی زندہ مثال ہے۔ پیشتر اس کے ہم اس کہانی کو زیرِ بحث لائیں ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔:

''جب کوئی لاغر، ٹی بی کی مریضہ گھڑ سوار فنکارہ سرکس میں ایک جھولتے ہوئے گھوڑے پر سوار لہراتی ہوئی، پیار کرتی ہوئی، کمر کو بل دیتی ہوئی انتھک تماشائیوں کے سامنے ایک چابک لہراتے ہوئے بے رحم رِنگ ماسٹر کے اشارے پر کئی مہینوں تک بغیر کسی وقفے کے دائروں میں گھمائی جائے اور جب یہ کھیل غیر مختتم سازوں اور پنکھوں کے شور کے درمیان لا انتہا مبہم مستقبل میں دم توڑتے اور پھر نئے سرے سے شروع ہوتے ہوئے تحسین آمیز تالیوں کے شور میں جو کسی بھاپ سے چلنے والے ہتھوڑوں سے کم نہ ہو جاری و ساری رہے تب شاید ایک بالکنی میں بیٹھا نوجوان تماشائی لمبی سیڑھیوں کی تمام سطحوں کو تیزی سے عبور کرتا ہوا نیچے اتر کر سرکس کے پنڈال میں آئے گا اور ماحول سے مطابقت پیدا کرتی ہوئی سازوں کی دھنوں کے درمیان پکارے گا ''رک جاؤ''۔

لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے ایک خوب صورت سرخ و سفید لڑکی پردوں کے پیچھے سے جنہیں وردیوں میں ملبوس فخر مند ملازم کھولتے ہیں نمودار ہوتی ہے۔ سرکس کا ڈائریکٹر بڑے وفا شعارانہ انداز میں اس کی توجہ کا متلاشی ہے اور جانوروں کے سے انداز میں اس کی اور سانس لیتا ہے اور پھر نہایت ہی محتاط انداز میں اسے اٹھا کر چتکبرے گھوڑے پر بٹھانے میں اس کی مدد کرتا ہے جیسے کہ وہ اس کی ہر چیز سے پیاری پوتی ہو جو کسی خطرناک سفر پر روانہ ہونے والی ہو اور وہ روانگی کے لیے چابک کا اشارہ دینے کا فیصلہ نہ کر سک رہا ہو۔ بالآخر وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے ایک زناٹے کے ساتھ یہ کام کر گزرتا ہے۔ منہ کھولے وہ گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑتا جاتا ہے۔ گھڑ سوار کی چھلانگوں کا اپنی تیز نگاہوں سے پیچھا کرتا ہے جس کے فن کی مہارت اس کے لیے ناقابلِ یقین ہے۔ انگریزی الفاظ میں اس کو تنبیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے؛ رنگ پکڑے سائیسوں کی غصے میں سرزنش کرتا

ہے۔ اور نہایت محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے؛ بڑی جمپ سے پہلے ہاتھ اٹھا کر سازندوں کو خاموش ہونے کی التجا کرتا ہے؛ بالآخر لڑکی کو کانپتے ہوئے گھوڑے سے اتارتا ہے اس کے دونوں رخساروں پر پیار کرتا ہے اور تماشائیوں کا پرجوش خراج تحسین بھی اس کو ناکافی محسوس ہوتا ہے جب کہ وہ لڑکی خود اس کا سہارا لیے اپنے پاؤں کی انگلیوں کے سروں پر کھڑی، گرد کے غبار میں گھری، اپنے بازو پھیلائے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے اپنی خوش قسمتی میں پوری سرکس کو شریک کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ یہ ایسا ہے بالکنی والا تماشائی اپنا چہرہ جنگلے پر رکھتا ہے اور اختتامی مارچ کے دوران جیسے وہ کسی گہرے خواب میں ڈوبا ہوا ہو۔ رو دیتا ہے۔ اس کا ادراک کئے بغیر۔''

کافکا نے یہ کہانی غالباً ۱۹۱۷ء میں تحریر کی اور یہ پہلی بار ۱۹۱۹ء میں کہانیوں کے مجموعے "Ein Landarzt" میں شائع ہوئی1۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کافکا نے یہ کہانی رابرٹ والزر (Robert Walser) کی کہانی "Lustspielabend" سے متاثر ہو کر لکھی جس میں ایک تماشائی سرکس کی بالکنی سے سٹیج پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کر کے انہیں بیان کرتا ہے۔ کافکا بھی اپنی اس کہانی میں پہلے سرکس کے سٹیج پر کمالات دکھانے والی ایک گھڑ سوار عورت اور اس کے فن کی تصویر کشی کرتا ہے اور اس کے بعد سرکس کی بالکنی میں بیٹھ کر اس تماشے کو دیکھنے والے شخص کے ردعمل کو بیان کرتا ہے لیکن یہ تصویر کشی اور تماشائی کا ردعمل ہر دو پیراگرافوں میں مختلف زاویوں سے پیش کیا جاتا ہے۔

پہلا پیرا ایک ایسے جملے پر مشتمل ہے جو ''جب'' سے شروع ہوتا ہے اور سرکس میں ہونے والے کھیل کی ایک فرضی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس میں گھڑ سوار عورت ایک بیمار اور مجبور عورت کے طور پر سامنے لائی جاتی ہے جو ایک ظالم رنگ ماسٹر کے رحم و کرم پر ہے اور اس کے اشاروں پر ایک مشین کی طرح کئی کئی مہینوں تک بغیر کسی وقفے کے اس کھیل میں حصہ لینے پر مجبور ہے۔ اس کی بیزاری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ تماشائیوں کی تالیاں بھی اس کے لیے ہتھوڑوں سے کم نہیں۔ اس صورتحال کو جانچتے ہوئے شاید کوئی بالکنی میں بیٹھا تماشائی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے اور تیزی سے سرکس کے اکھاڑے میں آ کر کھیل کو روکنے کے لیے کہے۔

دوسرے پیرے میں اس فرضی خیال کی نفی کی گئی ہے اور گھڑ سوار عورت کو ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کے آگے نہایت مہربان اور باادب سرکس کا ڈائریکٹر بچھا جا رہا ہے اور اس کا اس طرح خیال رکھتا ہے جیسے وہ ایک نہایت نازک شے ہو اور ذرا سی بداحتیاطی سے اس کے ٹوٹنے کا احتمال ہو۔ یہ گھڑ سوار عورت اپنے فن پر نازاں ہے اور تماشائیوں کے خراجِ تحسین کو خوش دلی سے قبول کرتی ہے لیکن اس صورتِ حال میں سرکس کی بالکنی پر بیٹھا تماشائی بجائے خوش ہونے کے کسی گہرے خواب میں ڈوبا، رو دیتا ہے اور بظاہر اس کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔

اس طرح یہ کہانی دو متضاد پیروں پر مشتمل ہے جو ایک ہی مواد کو دو مختلف زاویوں سے پیش کر رہے

ہیں۔ بظاہر پہلے پیرے میں صورتحال کو گھڑ سوار عورت کے زاویے سے پیش کیا گیا ہے جس میں اس کے اندرونی کرب کی عکاسی کی گئی ہے اور ظاہری شان وشوکت اور تماشائیوں کی واہ واہ محض ایک دھوکا نظر آتا ہے اور اس کی انتہا مبہم مستقبل میں حدِ نظر تک معدوم دکھائی دیتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے اس پیرے میں جملہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا اور پورے پیرے پر محیط ہے۔ اس کے برعکس دوسرے پیرے میں زاویہ نگاہ تبدیل ہو جاتا ہے اور سرکس کے کھیل کی ظاہری شان وشوکت کی تصویر کشی کی جاتی ہے جیسے کہ یہ سب کچھ تماشائیوں کو نظر آ رہا ہوتا ہے۔ ان دو متضاد زاویوں کی عکاسی دونوں پیروں میں استعمال کئے گئے متضاد الفاظ اور جملوں میں بھی ہوتی ہے۔ مثلاً:

پہلا پیرا	**دوسرا پیرا**
لاغر، ٹی بی کی مریضہ	خوبصورت سرخ وسفید لڑکی
چابک لہراتا ہوا بے رحم رِنگ ماسٹر	سرکس کا ڈائریکٹر وفا شعارانہ انداز میں اس کی توجہ کا متلاشی
کئی مہینوں تک بغیر کسی وقفے کے دائروں میں گھمائی جائے۔	جیسے کہ وہ اس کی ہر چیز سے پیاری پوتی ہو جو کسی خطرناک سفر پر روانہ ہونے والی ہو
تحسین آمیز تالیوں کا شور جو کسی بھاپ سے چلنے والے ہتھوڑوں سے کم نہیں، وغیرہ وغیرہ	تماشائیوں کا پرجوش خراجِ تحسین بھی اس کو ناکافی ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ

کہانی کا عنوان اس بات کا متقاضی ہے کہ سرکس کی بالکنی کے تماشائی کی نگاہ اور اس کے ردِعمل سے سرکس کے کھیل کو پرکھا جائے لیکن اس تماشائی کا دونوں پیروں میں متضاد ردِعمل قارئین کے لیے ایک معمے سے کم نہیں۔ پہلے پیرے میں وہ اس کھیل کو ظالمانہ سمجھتے ہوئے باقی تماشائیوں سے الگ تھلگ عملی قدم اٹھاتا ہے جب کہ دوسرے پیرے میں سرکس کی شان وشوکت کے باوجود وہ باقی تماشائیوں کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کرنے کے بجائے آخر میں رو دیتا ہے اور قاری یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ بالکنی کا تماشائی روتا کیوں ہے؟ Scholz کے مطابق تماشائیوں کو جو کہ عام لوگ ہیں جو کچھ بظاہر نظر آتا ہے وہ اسی کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ جبکہ بالکنی والا تماشائی ان عام لوگوں سے مختلف ہے اور اس میں وہ کچھ دیکھنے کی صلاحیت ہے جو ایک عام آدمی نہیں دیکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے اس ظاہری شان وشوکت کے پیچھے چھپا حقیقی کرب اور ظاہر کی اصلیت اس پر آشکار ہو چکی ہے جس نے اس کو رونے پر مجبور کر دیا2۔ اگر اس استدلال کو تسلیم کر لیا جائے تو دوسری کہانی میں پیش کیا گیا زاویہ نگاہ حقیقی پس منظر کو واگزار نہیں کر رہا بلکہ ایک فریب نظر کی عکاسی کرتا ہے۔ متعدد نقاد اس نقطہ نظر کو تسلیم کرتے ہوئے پہلے پیرے میں بیان کی گئی فرضی کہانی کو اصل میں حقیقت کا عکس قرار دیتے ہیں3۔ اس سلسلے میں کافکا کی Janouch کے ساتھ گفتگو کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے4۔

اور یہ کہ اصل حقیقت ہمیشہ غیر حقیقی ہوتی ہے اور ایک Ilusion ہے5، اس لیے جو چیز ایک فرضی کہانی کے طور subjunctive mode میں لکھی گئی ہے وہ اصل حقائق ہیں۔ نتیجتاً کہانی میں لکھے گئے الفاظ ''یہ ایسا ہے'' اپنے اصل معانی کھو بیٹھتے ہیں یہ الفاظ قاری کو فریب دینے کے مترادف ہیں۔ اگر ہم دوسرے پیراگراف میں حقیقت کے روپ میں بیان کئے گئے واقعات کو ایک Illusion کے طور پر تسلیم کر لیں تو بالکنی کے تماشائی کا رونا دراصل حقیقت اور فریب نظر کی کشمکش میں سچائی کو جان لینے کے باوجود کچھ نہ کر سکنے میں اس کی بے بسی کا اظہار ہے۔6

بعض نقاد اوپر بیان کئے گئے نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک دونوں مناظر میں سے کوئی بھی واضح طور پر illusionary یا واضح طور پر حقیقی نہیں ہے۔ اس صورت حال میں تماشائی کے رونے کی تشریح Boa ان الفاظ میں کرتی ہے۔

"The man perhaps weeps because he recognises that he is not seeing through the surface to the underlying truth, but is himself caught up in a fiction."7

لہٰذا دونوں تشریحات متنازع فیہ ہیں اور حقیقت اور illusion میں تفریق پر اتفاق رائے مفقود ہے۔ یہی چیز حقیقی دنیا پر بھی صادق آ رہی ہے۔ اگر ہم سرکس کو اس دنیا کے لیے ایک علامت کے طور پر سمجھیں تو یہ کافکا کے لیے ایک ایسی پہیلی ہے جو تضادات سے بھرپور ہے۔ Glasser کے مطابق اس دنیا میں ظاہر و باطن، چیزوں کی ظاہری ہیئت اور ان کی اصلیت ناقابل جدا حد تک باہم آمیختہ ہیں کہ ان کے ابہامات اور اشتباہات کا ادراک کرنا نہایت ہی دشوار کام ہے۔8

کافکا کے ادب پاروں میں قنوطیت پسندی کا پہلو جابجا نظر آتا ہے جس کا اظہار وہ دنیا کی حقیقتوں کو مسخ کر کے اور واقعات میں الجھاؤ پیدا کر کے کرتا ہے۔ نتیجتاً کافکا کی کہانیاں جو بظاہر نہایت مختصر اور آسان نظر آتی ہیں قارئین کے ذہنوں میں ایک الجھاؤ کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں اور ان میں بے یارو مددگاری کا احساس جنم لیتا ہے۔ کافکا کے نزدیک انسان کا اس دنیا میں وجود ایک لمبی اور اندھیری سرنگ کی مانند ہے جس کا داخلی دروازہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے اور اس کا خارجی دروازہ ماورائے رسائی حد تک دور ہے جہاں سے آنے والی ایک ننھی سی جھلملاتی روشنی کی کرن اس کے وجود کا پتہ دیتی ہے9۔ یہی ننھی سی روشنی شاید اس کے لیے امید کی موہوم سی کرن ہے، جو زیر بحث کہانی کے پہلے پیرے میں بالکنی کے تماشائی کے جرأت مندانہ اقدام کی شکل میں نمودار ہوتی ہے لیکن اس کی انسان سے ماورائے رسائی حد تک دوری اپنے اندر مایوسی کا پہلو پنہاں کئے ہوئے ہے جو کہانی کے دوسرے پیرے میں بالکنی کے تماشائی کے مایوس کن ردعمل میں جاں گزیں ہے۔***

حوالہ جات

ا۔ Scholz1991 ص ۵۸

۲۔ایضاً ص ۶۱

۳۔دیکھیے Emrich 1965 ص ۳۶ اور Binder 1966 ص ۱۹۴

۴۔Scholz11991 ص ۶۱

۵۔Politzer 1975 ص ۲۰۸

۶۔Scholz 1991 ص ۶۲

۷۔Boa 1991 ص ۴۸۹

۸۔Glaser 1962 ص ۴۲،۴۳

۹۔Floto 1979 ص ۷۷

کتابیات

Binder, Hartmut (1966): Motiv und Gestaltung bei Franz Kafka, Abhandlungen zur Kunst-,Musik- und Literaturwissenschaft, 37, H. Bouvier Verlag Bonn.

Boa, Elisabeth (19919): |Kafka's "Auf der Galerie": a resistant reader. In: Deutsch Vierteljahrsschrift for Literaturwissenschaft und Geistesgeschichte (DVjs) 3 (1991), pp.486 -501.

emrich, Walter (1965): Franz Kafka. Frankfurt am Main: Athenaum Verlag.

Floto, Christian(1979): Basisinterpetationen for den Literatur- und Deutschunterricht der Sekundarstufen Band I. Hollfeld: C. Bange Verlag.

Glaser, Hermann (1962): Franz Kafka. Auf der Galerie. In: Interpretationen moderner Prosa. Frankfurt am Main: Verlag Moritz Diesterweg, pp. 38 - 46.

Politzer, Heinz (Hrsg.) (1975): Das Kafka-Buch. Eine innere Biographie in Selbstzeugnissen. Frankfurt am Main: Fischer Taschenbuch Berlag,

Scholz, ingeborg (1991): Erlauterungen zu Franz Kafka: Erzahlungen II. Hollfeld: C. Bange Verlag.

☆☆☆

سمجھ لو کہ جو شے نظر آئے اور یہ کہے میں کہاں ہوں،
کہیں بھی نہیں ہے
سمجھ لو کہ جو شے دکھائی دیا کرتی ہے اور دکھائی نہیں دیتی ہے
وہ یہیں ہے!

میرا جی کی نظم **جزو اور کُل** سے اقتباس

ڈاکٹر محمد علی صدیقی (کراچی)

ایک منفرد شاعر۔صبا اکبرآبادی

صبا اکبرآبادی ہمارے عہد کے ایک ایسے ہمہ جہت،خوش گو اور خوش سیرت شاعر تھے جنہوں نے ایک طرف اردو مرثیہ کو فکری اعتبار سے اپنے عہد کے ساتھ وابستہ کیا، دوسری جانب اردو کے دامن میں خیام،خسرو، حافظ اور غالب کی فارسی رباعیات کا سارا ذخیرہ انڈیل دیا اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ غزل گوئی ایسا پیراہن تو نہیں ہے جو ہر غزلگو کے جسم پر سجے اور موزوں لگے۔صبا صاحب کی غزل گوئی میری رائے میں کلاسیکی غزل کی تمامتر شیرینی اور لطافت کے ساتھ ہمعصری دور کی تلخ حقیقتوں کی صورت گری سے مشابہہ ہے۔صبا صاحب غالباً اپنی نسل کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے غزل گوئی کے ذریعے غزل پر ممکنہ اعتراضات کا کامیابی کے ساتھ بطلان کیا ہے اور زشت وخوب کی وہ حدِ فاصل واضح سے واضح تر کر دی جس کے عدم ادراک سے غزل کے بارے میں بہت سے غزل کے مخالف نقادوں نے غیر ضروری اور سراسر چونکا دینے اور یورپی تنقید کے کافی گھسے پٹے بلکہ پامال جملوں کی جگالی کی تھی۔

مجھے صبا اکبرآبادی کی غزل کے جس رخ نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ ان کی غزل ایک صاحبِ اسلوب شاعر کی غزل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص شعری مزاج کی حامل چھلنی سے چھن کر شعری احساس کو قابلِ اعتبار جذبہ اور ہر قابلِ اعتبار جذبے کو ہمارے سماج کی خلقی اور صحت مند روایات کے ساتھ یک سوئی سے ہم آہنگ کر کے اظہار پاتی ہے۔

ہمارے ہاں کے متعدد شاعر موزوں کلام اور بسا اوقات اچھا کلام پیش کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے اشعار میں شعری مزاج کی یکسانیت نظر نہیں آتی ہے۔درست ہے کہ ہر احساس اور ہر جذبے کا نفسِ مضمون جدا ہوتا ہے،شاعر کے لئے یکسو رہنا مشکل ہوتا ہے،وہ زندگی کے مسائل پر غور کرتا رہتا ہے،کبھی خوشی،کبھی ملال،کبھی اضطراب اور کبھی طمانیتِ قلب،کبھی اپنے محبوب سے واصل ہونے کی تڑپ میں دامنِ احتیاط خیر باد کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور کبھی باہمہ اور کبھی بے ہمہ۔غرضیکہ اُسے متنوع احساسات سے واسطہ پڑتا ہے اور وہ ان احساسات کو شعری پیکر میں ڈھالتا رہتا ہے،لیکن شعری مزاج ہی وہ انفرادیت ہے جو اس کے اشعار کے

لئے مزاج پیما کا کردار ادا کرتا ہے۔جن شاعروں کے یہاں یہ وصف نہیں ملتا وہ مزاجاً ''ہرجائی'' ہوجاتے ہیں اور اگر ایسا ہو تو پھر یہ کہنا بجا ہوتا ہے کہ "A Roling Stone Gathers no Mass"(یعنی ایک لڑھکتا ہو پتھر) اُس وصف سے عاری ہوتا ہے جسے بھاری بھرکم وجود کہہ سکیں۔

شعری مزاج کی بحث فی زمانہ پسِ پشت جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ٹھیک ہے کہ جب بعض قارئین نقاد متن (Text) کی تکثیریت (Plurality) اور اضافیت (Relativity) کے قائل ہونے پر مائل ہوں تو پھر شعری مزاج کی اہمیت بھی لامحالہ متاثر ہوگی، حالانکہ متن کی اضافیت کے نظریہ کی پشت پناہی میں صحیح مفاہیم تک رسائی کے عمل میں بھی شاعر کے منفرد مزاج کو ایک اہم جگہ مل جانی چاہئے۔ایک مشہور فرانسیسی نقاد کا قول ہے "فن شعری مزاج کے آئینہ کے ذریعہ مطالعہ کی جانے والی زندگی کا نام ہے۔"Art is life seen through a temperament اِس قول نے دو پہلوؤں پر زور دیا ہے کہ فن بذاتِ خود زندگی کی ترجمانی نہیں بلکہ زندگی کی تخلیق ہے۔شاعر اپنے مخصوص احساس کے تعارف کے ساتھ ساتھ اپنے مزاج یعنی اپنی منفرد شخصیت کا تعارف کراتا ہے۔یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک منظر سو فوٹوگرافروں کے Lenses کے ذریعہ ایک نہیں رہتا، سو منظروں میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

ہر فوٹوگرافر کا زاویہء نظر، روشنی اور سائے سے نمٹنے کا نظام اور کسی منظر کی جزئیات میں زیادہ اہم اور غیر اہم جزئیات کے ادراک کا انداز جدا ہوتا ہے۔ارسطو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ آرٹ فطرت کی نقل نہیں بلکہ اس پر اضافہ یا اسے زیادہ خوبصورت بنانے کا عمل ہے، شاید یہ تعریف شاعری پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے۔

اگر کسی مضمون نے متعدد شعرا کے یہاں اظہار پایا ہے تو اہم بات یہ ہوگی کہ یہ کس خاصیت کے شعری مزاجوں کی چھلنی سے گزر کر ہم تک آئے ہیں۔اگر ادب میتھیو آرنلڈ کے خیال میں زندگی کی تنقید ہے تو پھر ہر شاعر زندگی کو اپنے انداز میں دیکھنے پر مکلّف ہے اور یہی Conditioning لائقِ مطالعہ ہے۔ایسے پیمانے پر شاعر اور شاعری پر گفتگو زیادہ مناسب رہتی ہے اور وہ یوں کہ شاعری کے بارے میں نقاد کے خیالات اُسی وقت زیادہ پایہ اعتبار کو پہنچ پائیں گے جب وہ شاعر کے مطمحِ نظر یا زندگی کے بارے میں اُس کے تنقیدی شعور کو بھی قرار واقعی اہمیت دے۔جب شاعر کا یہ دعویٰ تسلیم کرلیا جائے کہ وہ زندگی کا ناقد ہے تو پھر نقاد کی تنقید شاعر کے تنقیدی زاویہء حیات سے متصادم نہ ہونی چاہئے تاوقتیکہ شاعر اپنے نمائندہ مزاج اور فکر کی حدود سے باہر نہ چلا گیا ہو۔یہ صورتِ حال نہ صرف ممکن ہے بلکہ بعض اوقات شاعر اپنے شعری مزاج سے روگردانی کرتا ہے اور ہم اسے آنکھ مچولی کا کھیل Escapades کہہ سکتے ہیں۔

صبا اکبرآبادی کی شاعری "ذاتی تجربات" پر زور دیتی ہے۔آپ کہیں گے کہ بیشتر شعرا کے ساتھ یہی معاملہ ہے لیکن اِس صورتِ حال کو شعری مزاج کی یکسوئی کے آئینہ میں دیکھا جائے تو اکثر و بیشتر دعویٰ کے ساتھ دلیل کا تال میل دکھائی نہیں دیتا۔جب تک قارئین شاعر کے ذاتی تجربات کو محسوس کرنے کے لئے ضروری قوتِ ادراک سے

آراستہ نہ ہوں اس وقت تک شاعری سے لطف اندوزی تو ایک طرف رہی، دیگر شعرا کے تجربات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کی منزل بھی نہیں اور یوں ہماری بیشتر تنقیدی نگارشات چار و ناچار ظنّیات یا رائے زنی کے ذیل میں آجاتی ہیں اور اِس درجہ موضوعی (Subjective) ہوجاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ جن نقادوں نے مسلّمہ طور پر بڑے شعرا کو اپنے تنقیدی پیمانوں پر انحصار کرتے ہوئے قرار واقعی اہمیت نہیں دی تھی، وہ ایک کم اہم شاعر کے بارے میں اِس درجہ رطب اللسان کیوں نظر آتے ہیں کہ ان کی تنقیدی معروضیت معرض بحث میں آجائے۔تنقیدی نگارشات اس لئے اضطراری فیصلوں کے خانے میں نہیں آنا چاہئے۔

صبا اکبرآبادی کی شاعری کے مطالعہ کے لئے۔اور ہر شاعر کے کلام کے مطالعہ کے لئے۔سب سے پہلی شرط اس شاعری سے قریبی تعلق کی ضرورت ہے۔جب تک زیرِ مطالعہ شاعر کو قارئین اپنے مزاج کی مختلف کیفیات میں نہیں پڑھیں گے اس وقت تک مفاہیم کی نازک تہیں اور رنگ نارسیدہ رہیں گے جن کی تخلیق کیلئے فن کی بساط پر ندرتِ خیال کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

میں نے صبا اکبرآبادی کے بیشتر کلام کا مطالعہ کیا ہے۔مگر یہ مختصر مضمون لکھتے وقت میں نے اُن کی غزل کا صرف ایک مجموعہ ''چراغِ بہار'' پیشِ نظر رکھا ہے، اور میں اسی مجموعے کے حوالے سے اپنی معروضات پیش کروں گا۔

سب سے پہلے میں صبا صاحب کی شعری زبان کے بارے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ صبا اکبرآبادی کے یہاں زبان اور بیان کی سادگی اور پُرکاری کا ہنر لائقِ تقلید ہے۔میں نے شعوری طور پر دقّت پسند شاعروں کا کلام بھی دیکھا ہے اور شعوری طور پر آسان اور غیر مبہم زبان لکھنے والوں کا بھی، لیکن ان حضرات کا شعوری اندازِ نظر ان کے مزاج سے متصادم تھا، میر فارسی زدگی کا شکار ہوسکتے تھے اور طرزِ بیدل میں ریختہ کہتے تو کوئی قیامت نہ آجاتی۔ان کا تذکرۂ شعرا بھی فارسی میں ہے اور خطوط بھی، لیکن ان کی شاعری سے پتہ نہیں چلتا کہ ان کا شعری مزاج فارسی زبان کے خمیر سے یک جان تھا۔یہی حال نظیرا کبرآبادی کا ہے وہ فارسی زبان پر مکمل عبور رکھنے کے بعد بھی اردو/ہندی زبان کے رسیا تھے۔غالب کا مزاج ہی فارسی اور وہ بھی قبل از اسلامی دور کی فارسی سے متشکل ہوا تھا اور کوئی تعجب نہ ہوتا کہ وہ اردو کی جانب اپنی زندگی کے آخری دور میں متوجہ ہوئے اور وہ بھی شاید اس وجہ سے کہ حکومتی اداروں میں 35 18 سے اردو زبان کا عمل دخل بڑھنے لگا تھا۔غالب کی شاعری کے اولین دور کی شاعری، کہ مسلم ضیائی کے مرتبہ غالب کے ''منسوخ دیوان'' میں موجود ہے۔گواہ ہے کہ طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا اوروں کے لئے مشکل ہو تو ہو غالب کے کیلئے مشکل نہ تھا۔

صبا صاحب کے اسلاف غالب کے ننھیالی عزیز تھے اور ۱۳ سال کی عمر میں غالب کی سادہ اور سلیس اردو شاعری اِس امر کا ثبوت ہے کہ وسطی ایشیائی خاندان پر فخر و مباہات کا خوگر غالب اردو/ہندی کو مادری زبان کہہ سکنے کے قابل صبا اکبرآبادی کے خاندان کے ساتھ ہم رشتہ ہونے کی وجہ سے ہی ہوئے صبا اکبرآبادی کی زبان شرفائے آگرہ کی

زبان تھی جو دہلی کے شاہجہاں آباد ہونے سے پہلے ہندوستان کا پایہ تخت تھا۔میر اور غالب کے خاندان ہی پر کیا موقوف دہلی کے بیشتر اکابر نے آگرہ ہی سے مراجعت کی ہے۔

صبا اکبر آبادی کی زبان قابل رشک حد تک میر تقی میر کی زبان سے میل کھاتی ہے،البتہ ناسخ۔۔میر کی شعری صحت کے حسن الفاظ کو غیر فصیح یا ضرورت سے زیادہ عوامی لہجہ کا نمائندہ تھے،وہ مرورِ ایّام سے صبا اکبر آبادی کے یہاں خود بخود نکھر گئے ہیں اور اِس طرح صبا کی زبان صحیح معنوں میں عصری دَور کے معیارِ قبولیت پر پورا اترتی ہے لیکن اِس زبان کی سج دھج وہی ہے جو عہدِ موجود کی زبان سے ذرا سی مختلف لیکن ممتاز ہے۔مثال کے لئے یہاں ایک غزل اور چند دوسری غزلوں کے اشعار دیکھئے۔

بات کو تول رہا ہو جیسے عشق لب کھول رہا ہو جیسے
بارہا قید میں گزرا یہ گماں کوئی در کھول رہا ہو جیسے
ہمہ تن گوش ہوا جاتا ہے دل حُسن سچ بول رہا ہو جیسے

اُن سے دوری میں ہوئیں یوں باتیں دل سے دل بول رہا ہو جیسے
اُس کے آتے ہی یہ محسوس ہوا وقت پَر تول رہا ہو جیسے
دلِ بے قدر مجھے یوں ہے عزیز کبھی انمول رہا ہو جیسے
شاخ پر کھلتا ہے غنچہ ایسے زخم لب کھول رہا ہو جیسے
تیرے اشعار میں پایا ہے صبا لفظ خود بول رہا ہو جیسے

ظلمت ونور نے بتایا ہے رات اپنی ہے دن پرایا ہے
میں اُسے دیکھ بھی نہیں سکتا کوئی اِتنا قریب آیا ہے
پسِ دیوارِ یار بیٹھا ہوں کیا خبر دھوپ ہے کہ سایا ہے

جس طرف جاؤں وہی قیدِ عناصر سامنے مجھ کو اُس زنداں میں رکھا جس کا دروازہ نہ تھا
تمہاری انجمن آرائیوں میں میری تنہائیوں کی داستاں ہے
ہے تری یاد خود فراموشی کس کو سوچیں ترے خیال کے بعد
ہر نفس پر ہے احتمالِ اجل یوں جو گزرے یہ زندگی تو کیا

صبا اکبر آبادی اپنے زمانے کی آویزشوں اور اتھل پتھل سے واقف تھے اس لئے کڑھتے ہیں، اپنے

اسلاف اور اپنے اخلاف کے دور میں کافی فرق پاتے ہیں اور اِسے نئے دور کی ''ترقی'' کے بجائے پستی سے تعبیر کرتے ہیں اور پھر ایک ثقافت کی پسپائی پر اِس نوع کا ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔

دل میں کب تک رہے امید کا ویران محل اب تو یہ کُہنہ عمارت بھی گرا دی جائے
میری غرقابی کی تاریخ ہے ساحل پہ رقم اب تو یہ ریت کی تحریر مٹا دی جائے
تیرگی کو کہاں تلاش کروں ہر اندھیرا چراغ میں گم ہے
دل ٹوٹ کے اب شہر کی صورت ہی نئی ہے آئینہ نظر آتے ہیں دیوار بھی در بھی

صبا اکبر آبادی کی شاعری میں موجودہ دور میں پائی جانے والی ناامیدی کی تمثالیں (Images) افقِ ذہن پر ابھرتی رہتی ہیں اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ صبا اکبر آبادی نے اپنے فن سے زندگی کی تنقید کا کام بھی لیا ہے، اور وہ اس گومگو کی کیفیت کو بہت منفرد انداز میں شاعری کا پیرہن دیتے ہیں۔شاعری مسائل کا حل نہ ہوتے ہوئے بھی خود ایک سوال ہے،سوچنے اور سمجھنے کے نئے زاویئے فراہم کرتی ہے۔صبا اکبر آبادی کی شاعری عصری حسیت کا فرض بہت عمدگی کے ساتھ ادا کرتی ہے اور ناامیدی کی فضا میں بھی امید کا دیا جلاتی ہے۔یہاں یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ رواں دواں، سادہ زبان استعمال کرنے والے صبا کے یہاں فکری انجماد بھی نہیں ہے، اس لئے کہ تازہ ہوا کے لئے ان کے ذہن کے دریچے کھلے رہتے ہیں۔

کم سرِ دامنِ قاتل نہیں ہونے پاتے خون کے داغ ہیں زائل نہیں ہونے پاتے
شہرِ افکار میں چلتی ہی رہی تازہ ہوا ذہن پابندِ سلاسل نہیں ہونے پاتے
میری آشفتہ سری قید سے مایوس نہ ہو سر سلامت ہے تو دیوار میں در بھی ہوگا
ناخدا کی فکر کیا، طوفاں سے کرلو دوستی خود بخود لگ جائے گی کشتی کنارے دوستو

کہاں یہ عالم تھا کہ آئینہ دیوار و در تھا اور ایک عالم یہ ہے کہ سر سلامت ہے تو دیوار میں در بھی ہوگا۔یعنی امکانات کا در سعیءپیہم کی ضربات کا محتاج ہے اور یہی زندگی کی تنقید کا وہ فریضہ ہے جو صبا اکبر آبادی کی شاعری میں تغزل کے ساتھ ساتھ اِس دور کے ''کوہ کن'' سے سنگلاخ زمین سے جوئے آب نکالنے کی دعوت دے رہا ہے۔یہ ان کی منزل کا آخری سرا نہیں ہے۔اگر شاعر کا کام شہرِ تمنا کی تزئین ہے تو پھر یہ لامتناہی کاوش بھی چاہتا ہے۔

کیا نقوشِ قدم تھے راہوں میں شوق آمادہءسفر ہی رہا

آپ نے دیکھا کہ صبا اکبر آبادی نے ''انقلاب'' کو مبدل ''بہ شوق'' کس خوبصورتی سے کیا ہے۔یہی وہ خوبی ہے جو صبا اکبر آبادی کو ہمارے زمانے کے منفرد اور اہم غزل گوؤں کی فہرت کا ممتاز شاعر بناتی ہے۔

ڈاکٹر انیس صدیقی (گلبرگہ)

ناظم خلیلی: اک لُٹا لُٹا یا قَصرِ ادب!

ریاست کرناٹک میں اردو شعروادب کی تاریخ جن صاحبانِ فضل وکمال کے کارناموں سے روشن ہے ان میں ناظم خلیلی کا نام نہایت ممتاز ومعتبر ہے۔

ناظم خلیلی عمر میں مجھ سے کئی سال بڑے ہیں۔اس لئے میں انہیں اپنا بزرگ دوست مانتا ہوں۔اگر وہ عمر میں مجھ سے کئی سال چھوٹے بھی ہوتے تو بھی میں ان کی خوش فکری وخوش مزاجی ،خوش پوشی وخوش قامتی ،خوش صورتی وخوش ذوقی اور خوش خلقی وخوش گفتاری کی بناء پر انہیں اپنا بزرگ دوست ماننے میں تامل نہ کرتا۔

ناظم خلیلی کا غائبانہ تعارف کم وبیش پچیس سال قبل محترم حسن رضا مرحوم نے مجھ سے شہر رائچور کے ذہین باذوق اور خوش فکر شاعر وافسانہ نگار کی حیثیت سے کروایا تھا۔جس کے نتیجے میں میں نے ناظم خلیلی کو اپنے ادبی رسالہ ''نوائے عصر'' کے لئے جس کی میں ادارت کیا کرتا تھا قلمی معاونت کی درخواست کرتے ہوئے خطوط لکھے۔ جواباً انہوں نے اپنی گراں قدر تخلیقات سے نوازا اور وہ ''نوائے عصر'' کے شماروں میں شائع بھی ہوئیں۔لیکن ناظم خلیلی سے پہلی شخصی ملاقات ابھی ایک سال قبل روزنامہ ''دور حاضر'' کے دفتر میں ہوئی۔مدیر دور حاضر جناب حامد اکمل نے جب میرا تعارف ان سے کروایا تو فوراً انہیں بیس برس پرانی خطوط کے ذریعے ہوئی آدھی ادھوری ملاقاتیں یاد آئیں اور بے اختیار انہوں نے مجھے گلے سے لگالیا۔اس دوران روزنامہ دور حاضر کی جانب سے مجھ خاکسار پر اک گوشۂ ادب کی ترتیب کا کام زیر نگرانی ڈاکٹر محمد غضنفر اقبال مرتب گوشہ ادب چل رہا تھا۔ناظم خلیلی سے بھی جب انہوں نے اس ذیل کچھ تحریر کرنے کی درخواست کی تو ناظم خلیلی نے اگلے ہی دن ایک خوبصورت نظم مجھ سے متعلق قلمبند کی۔اس نظم کو جس کا عنوان انہوں نے انیس صدیقی: شخصی خدوقلمی خال! رکھا تھا کافی سراہا گیا۔پھر یہ ملاقاتیں جو کبھی فون پر اور کبھی بالمشافہ ہوتی تھیں بڑھتی گئیں اور بے غرض ہونے کے سبب رفتہ رفتہ دوستی میں تبدیل ہوتی گئیں۔گذشتہ تین دہائیوں سے زیادہ عرصے سے انتہائی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ تخلیقی سفر میں مگن ناظم خلیلی ۳۰ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو اتر پردیش کے ضلع بجنور کی ایک بستی نگینہ کے علمی ومذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ذہنی وفکری تربیت کا آغاز وہیں ہوا اور تعلیم کی بارگاہ میں پہلا قدم بھی انہوں نے وہیں رکھا۔پھر ان کے والد بزرگوار کو ملازمت کے سلسلے میں نقلِ مکانی کرنی پڑی۔اور ناظم خلیلی اپنے والدین اور بھائی بہن کے ہمراہ حیدرآباد سے ہوتے ہوئے رائچور منتقل ہوگئے۔تعلیم کا منقطع سلسلہ پھر شروع ہوا۔لیکن یہ نصابی وتعلیمی تعلق زیادہ عرصہ تک قائم

نہ رہ سکا۔بی۔اے سالِ دوئم تک کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد نامساعد گھریلو حالات تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنے میں مانع ہوئے۔حالات کی حوصلہ شکنی اور مالی دشواریوں پر قابو پانے کے لئے انہوں نے ادھر ادھر چھوٹی موٹی ملازمتیں تک کیں۔لیکن ناظم خلیلی نے بالیدگیٔ شعور کی منزلیں اپنے ذوقِ جستجو اور ذہنی وفطری ریاضت کی بنیاد پر ہی طئے کیں جسے انفرادی مطالعہ اور شوقِ کتب بینی نے اور انگیز کیا۔

اس طرح انہوں نے نہ صرف اردو بلکہ انگریزی زبان پر بھی نام نہاد سند یافتہ لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عبور حاصل کیا۔اپنی غیر معمولی انگریزی استطاعت کو انہوں نے ذریعۂ معاش بناتے ہوئے ''واصف ٹیوٹوریل'' کے نام سے انگریزی ٹیوشنوں کی شروعات کی۔ان پچیس برسوں میں بلالحاظ مذہب وملت سیکڑوں طلباء وطالبات ناظم خلیلی کی انگریزی استعداد سے مستفید ہوئے۔اور آج شہر رائچور میں ناظم خلیلی کی مقبولیت اور محبوبیت انگریزی کی ایک مثالی استاد کی حیثیت سے ہے۔اس درمیان رائچور کے ایک امدادی مدرسہ میں حاصل ہوئی ملازمت سے ان کی زندگی کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ناظم خلیلی نے اپنے ٹیوشن اور ملازمت کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ شہر رائچور کی علمی،ادبی، تعلیمی اور سماجی زندگی سے اپنے آپکو وابستہ رکھا۔وہ ہر محفل میں نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ناظم خلیلی جہاں اپنے اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہنے والے انسان ہیں وہیں بے حد آئیڈلسٹ بھی۔خود بھی صاف ستھرے انسان ہیں اور اپنے آس پاس کے لوگوں کو بھی صاف ستھرا دیکھنا چاہتے ہیں۔راست گوئی بے باکی اور نفاست وشائستگی ان کی شخصیت کی بنیادی صفات ہیں۔ان کا گفتگو کا سلیقہ اور نشست وبرخاست وہم نشینی کے آداب ہمیں قدیم لکھنوی تہذیب کی یاد دلاتے ہیں جو عہد حاضر کے صارف سماج میں محصور انسانوں میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ناظم خلیلی عام معمولاتِ زندگی میں بے حد بااخلاق اور بامروت انسان ہیں لیکن جہاں زبان کے غلط استعمال کا معاملہ ہو وہ بے مروت ہوجاتے ہیں۔بھری محفل میں لفظ کے غلط استعمال پر ٹوک دیتے ہیں۔غلط شعر، غلط محاورہ اور غلط تلفظ ان پر برا اثر ڈالتا ہے۔خاص طور پر اساتذہ اور شعراء کی اس خامی کو وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کرتے۔

ایک اور بات جو ناظم خلیلی کو عام اردو شعراء وادبا سے ممیّز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ناظم خلیلی عہد حاضر میں سائنس اور ٹکنالوجی کی روز افزوں ترقی سے باخبر رہنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔سائنس کے مختلف النوع علوم میں ہو رہی جدید ترین تحقیقات وتجربات کی روشنی میں برق رفتاری سے تبدل سے دوچار دنیا کے مستقبل کا تصور اور اس کے زیر اثر آنے والے سماج کی ممکنہ تشکیل پر تبادلۂ خیال ناظم خلیلی کا محبوب موضوع گفتگو ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ فنکار اور اس کے فن کے درمیان کافی فاصلہ ہوتا ہے۔ضروری نہیں کہ اگر کوئی فنکار اپنے فن میں بلند ہے تو وہ انسان کے طور پر بھی بڑا ہو۔لیکن ناظم خلیلی اس معاملے میں مختلف ہیں۔ان کی ذاتی شخصیت ،ان کی فنکارانہ شخصیت کے ساتھ اس طرح تحلیل ہوگئی ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی حدِ فاصل نظر نہیں

آتی۔ وہ جتنے اچھے شاعر وافسانہ نگار ہیں۔ اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ شخصیت اور فن کے اس اتصال نے ناظم خلیلی کے فن کو تو نکھارا ہی ہے۔ لیکن انسان کی شکل میں بھی انہیں ایک طرح کی شان اور خود اعتمادی کی صلاحیت عطا کی ہے۔ ناظم خلیلی فن وذات اور قول وعمل کے اعتبار سے دوہری زندگی گذارنے کے قطعی قائل نہیں۔ ان کی شخصیت ادبی سیاستوں سے پاک اور ان کا مزاج ہوس شہرت بیجا سے بے نیاز ہے۔

ناظم خلیلی کی شخصیت کا ایک جوہر ان کا رجائی ہونا بھی ہے۔ زندگی کے نہایت ناموافق اور حوصلہ شکنی حالات میں بھی وہ امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ ۱۹۹۶ء کے بعد ان کی زندگی میں کئی نشیب وفراز آئے۔ تیرہ سالہ خوشگوار ازدواجی زندگی کا خاتمہ ناگزیر وجوہات کے سبب طلاق پر ہوا۔ پھر ۲۰۰۲ اور ۲۰۰۴ء میں دو جاں سوز سڑک حادثوں سے دوچار ہوئے۔ (لیکن دونوں دفعہ بفضل خدا وہ بھر پور صحت کی طرف لوٹے)۔ آخر کار ایک اور واقعہ ان کی زندگی میں ایسا پیش آیا کہ انہیں اپنے ہی شہر رائچور کو عارضی طور پر خیر باد کہہ کر گلبرگہ آنا پڑا۔ عمر کے اک بڑے تفاوت کے باوجود ان ہی کی اک شاگردہ نے رومانی انداز میں ان کی طرف پیش قدمی کی اور باوجود انکے کافی سمجھانے کے وہ انکی زندگی کا ایک جز بن گئی۔ لیکن قسمت چونکہ دونوں کے حق میں نہ تھی اس لئے معاملات اچانک الٹتے چلے گئے اور انہیں حالات کو مزید بگڑنے سے روکنے کے لئے نقلِ مکانی کرنی پڑی۔ گلبرگہ کے کئی اک ادباو شعراء انہیں ادبی طور پر تو بڑی حد تک جانتے ہی تھے انکی خوش اخلاقی وخوش ذوقی اور انکی علمی قابلیت کو دیکھ کر انہوں ناظم خلیلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ یہاں کی ادبی وعلمی مجلسوں میں باقاعدہ شریک ہونے لگے۔ نہ انہوں نے اپنی نصابی قابلیت کے تعلق سے کبھی کسی سے کوئی جھوٹ کہا تھا اور نا ہی کسی سے اپنی پریشانیوں کی نوعیت ہی چھپائی تھی۔ قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری، کے مصداق علم دوست حضرات نے انہیں آگے بڑھ کر اپنے سینے سے لگالیا اور گلبرگہ یونیورسٹی کے کئی اک علمی مقابلوں میں انہیں بحیثیت جج بھی مقرر کیا۔ آلام ومصائب کے ہجوم میں بھی وہ مایوس اور ناامید نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنی شخصیت کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچائے رکھا۔ اور ماضی کے کھردرے نقوش مٹا کر زندگی میں نئے رنگ بھرنے کے وہ ہمیشہ خواہاں نظر آئے۔ ناظم خلیلی کے والد علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم اے تھے اور ایک نہایت عالم وفاضل شخصیت کے حامل ہونے کے علاوہ ایک بہت باکمال دینی شاعر بھی تھے۔ ناظم خلیلی نے انہی موروثی صلاحیتوں کے زیر اثر طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر کہنے شروع کئے اور دو چار دفعہ اپنے والد سے اصلاح لینے کے بعد انہوں نے پھر کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

ناظم خلیلی شعر برائے شعر نہیں کہتے اور نہ مشق ومہارت کی بناء پر شعر کہتے ہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں اسی لئے شعر کہتے ہیں۔ حسرت موہانی نے اچھے شعر کی تعریف اپنی غزل کے مقطع میں یوں کی تھی۔

شعر دراصل ہے وہی حسرت : سنتے ہی دل میں جو اتر جائے !

کسی شعر میں دل میں اتر جانے والی کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب قاری یا سامع اس شعر کو

پڑھے یا سنے اور وہ اس کے احساس پر حاوی ہوجائے تاثر قبول کرنے کا تعلق براہ راست احساس سے ہے دماغ سے نہیں۔ لہذا وہ شاعری جو احساس کو متاثر کرتی ہے نمبر ایک پر رہے گی اور جو دماغ کے میزان پر تولی جاتی ہے وہ نمبر دو پر۔ اس تناظر میں جب ناظم خلیلی کی شاعری کا جائیزہ لیں تو واضح ہوگا کہ وہ اپنے جذبات واحساسات کو کبھی ادق الفاظ اور بھونڈی تراکیب سے بوجھل نہیں کرتے اور ناہی فسلفیانہ خیالات کو جذباتی ردعمل سے معرا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناظم خلیلی کے کلام میں کسی مخصوص ادبی نظریئے سے وابستگی کے آثار وعلائم بھی نظر نہیں آتے۔ ویسے ان کے کلام میں جدید رجحانات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اور ترقی پسندی کو بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کی شاعری کو پڑھ کر پہلا احساس یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعر اپنی بات کہہ رہا ہے جو اس کے حسی تجربوں اور جمالیاتی اقدار کی رہین منت ہے۔ ناظم خلیلی کی شخصیت کی طرح ان کی شاعری میں بھی تضع نہیں ہے۔ ایک جدید لب ولہجے کے مالک ہونے کے باوجود انہوں نے خال خال ہی اپنی شاعری کو معمہ یا چیستاں بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور میرے نزدیک یہ ناظم خلیلی کی قادرالکلامی کی دلیل ہے۔ تقریباً ہر اہم صنف سخن میں طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ انہوں نے تثلیثات وقطعاتِ تاریخ بھی لکھے ہیں اور جگہ جگہ ان کی بے انتہا فنکارانہ سلیقگی کا اظہار ملتا ہے۔ انکی ایک تثلیث سے جسے بے شمار لوگوں نے سراہا انکے انداز فکر وفن کا دریچہ وا ہوتا ہے:

مندروں مسجدوں پہ لڑتے ہیں
کتنے پاگل ہیں لوگ بھارت کے
پاؤں سے تتلیاں پکڑتے ہیں

اور ان کا ایک شعر جو شہر رائچور میں زبان زد خاص وعام ہوتے ہوئے اتنا آگے گیا کہ روزنامہ سیاست (حیدرآباد) میں صرف ایک مثالی شعر کی حیثیت سے شائع ہوا یوں ہے:

آنے والے وقت کی تختی پہ اپنا نام لکھ تیرے دروازے کی تختی تو قضا لے جائے گی

ناظم خلیلی کے اس مذکورہ شعر نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ شہر رائچور کے ایک سابق ایم پی نے اپنے دروازے سے اپنی نیم پلیٹ ہٹادی اور پھر کبھی نہیں آویزاں کی اور پھر ان کے یہ اشعار :

تمہارا حسن قلم کو جمال دیتا ہے مجھے ہمیشہ اچھوتا خیال دیتا ہے
بغیر مانگے خدا روز کاسۂ دل میں کسی کی یاد کا اک سکہ ڈال دیتا ہے

انکے تصور کی رنگینوں کو بڑی کامیابی سے اجاگر کرتے ہیں۔ الغرض ناظم خلیلی کا شمار اردو کے ان معدودے چند شعراء میں کیا جاسکتا ہے جنہیں شعر گوئی، شعر فہمی اور اصلاح شعر تینوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ لیکن شاعری ناظم خلیلی کی تخلیقی صلاحیتوں کی آخری حد نہیں ہے۔ ان کے پاس مشاہدات، تجربات اور واردات قلبی کے اظہار کے اور وسائل بھی ہیں جن میں افسانہ نگاری جیسا موثر وسیلہ اظہار بھی شامل ہے۔ وہ ایک کامیاب افسانہ

نگار بھی ہیں اگرچہ افسانہ نگاری کا آغاز ناظم خلیلی نے ۱۹۷۵ء میں یعنی شاعری کے سات سال بعد کیا لیکن بیسیوں افسانے لکھے جن میں سے بیشتر ہندوستان اور پاکستان کے مقتدر ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ یہی وجہ ہیکہ ناظم خلیلی کی شناخت شاعر کے مقابلے میں افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ ہے۔

افسانہ نگاری کے باب میں ناظم خلیلی نے اپنے افسانوں کی اساس احساسات و جذبات سے کہیں زیادہ مشاہدات اور تجربات پر رکھی ہے۔ انہیں واقعات میں رنگ بھر کر افسانہ بنا دینے کا ہنر خوب آتا ہے۔ انکے افسانوں میں زندگی کا کوئی نہ کوئی رنگ ضرور موجود ہے۔ زندگی جہاں خوشیوں اور مسرتوں کا مخزن ہے وہیں غموں کی آماجگاہ بھی ہے۔ ناظم خلیلی کے افسانوں کے آئینے ایسی ہی زندگی کے عکاسی ہیں۔ خاص طور پر ان کے افسانے ''تیرے اگّے ہریا۔!'' تیسری طوائف۔! رکا ہوا خط۔! منوں بوجھ۔! زردا۔! اور وہی بچہ وہی لوگ۔! زندگی کے بے شمار رنگوں اور اس کے بہت سے چھوٹے برے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ اسلوبیاتی نقطہ نظر سے نیا مکان۔! یہی وہ جگہ ہے۔! تیسری بیساکھی۔! اور ایک کہانی۔! افسانے پر کشش رواں اور واضح اسلوب کے حامل ہیں جب کہ ان کے علامتی افسانے، اندر سے باہر۔! آئینے مر گئے۔! دھوپ پیتے ہوئے لوگ۔! رنگ اور تختیاں اور سات چھلکے۔! مرزا غالب کے اشعار کی طرح تہہ در تہہ معنی رکھتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ناظم خلیلی کے افسانوں کی زبان رواں اور سلیس ہے۔ مکالموں کی برجستگی اور عبارت کی خوش رنگی ناظم خلیلی کے افسانوی اسلوب کے امتیازات ہیں۔ ناظم خلیلی کی ادبی زندگی میں بیسویں صدی کا ساتواں اور آٹھواں اور اکیسویں صدی کا پہلا دہا تخلیقی اعتبار سے بے حد زرخیز رہا ہے۔ بیسویں صدی کے ساتویں اور آٹھویں دہے میں انکی شعری اور افسانوی تخلیقات ملک و بیرون ملک کے موقر رسائل و جرائد میں متواتر شائع ہوتی رہیں۔ یہی وجہ ہیکہ اس دوران جب انہوں نے پاکستان کا دورہ کیا تو لاہور کے ادبی حلقوں میں انہیں اپنا تعارف کروانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ممتاز شاعر قتیل شفائی اور معروف فکشن نگار اے۔ حمید تک انکے نام اور کام سے واقف تھے۔ قیام پاکستان کے دوران انہیں قومی سطح کے ایک نعتیہ مشاعرے میں بہ حیثیت مہمان شاعر مدعو کیا گیا۔ یقیناً ان باتوں سے قلمکار کی ادبی زندگی میں مسلسل لکھنے اور شائع ہونے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ناظم خلیلی کے یہاں شاعری اور افسانوں کا اتنا وافر سرمایہ ہے کہ کم از کم تین شعری اور دو افسانوی مجموعے بہ آسانی شائع ہو سکتے ہیں۔ لیکن احباب کے مسلسل اصرار کے باوجود انہوں نے کتابوں کی اشاعت کے ضمن میں کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ میں اس امید کے ساتھ اپنے تاثرات کے بیان کو ختم کرتا ہوں کہ ناظم خلیلی بہت جلد بے نیازی کے خول کو توڑ کر ایک ضخیم شعری اور افسانوی مجموعے کی شکل میں اپنی فکری تابانیوں کے ساتھ افقِ ادب پر مجموعی شان و شوکت کے ہمراہ نمودار ہوں گے۔ تا کہ اربابِ نقد و نظر ادب کے منظر نامے میں ان کے مقام و مرتبے کا تعین کر سکیں۔!

☆☆☆

مقالۂ خصوصی

یہ ہماری زبان ہے......

پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد
صدر شعبۂ اُردو و اقبالیات
اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور

ڈاکٹر سید زوار حسین شاہ
اسسٹنٹ پروفیسر
ایس۔ ای کالج بہاول پور

میرا اور ڈاکٹر سید زوار حسین شاہ کا تعلق تقریباً بیس اکیس برس سے ہے لیکن گزشتہ چار پانچ سال ایسے گزرے ہیں جن میں اوّل اُردو مجلس بہاول پور (۱) کی ادبی نشستوں میں شامل ہونا رابطے کی اہم ترین صورت تھی۔ رابطے کی دوسری صورت یہ تھی کہ سید زوار حسین شاہ میرے ساتھ ''نسیم امروہوی......حیات اور کارنامے'' (۲) کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا کام کر رہے تھے۔ ذرا غور کیجیے کہ زوار حسین جیسا صاحبِ ذوق طالب علم اور نسیم امروہوی جیسا جیّد عالم موضوع ہو تو پھر کیسے کیسے مباحث موضوعِ بحث نہ بنتے ہوں گے۔

نسیم امروہوی غزل گو شاعر بھی ہیں اور مرثیہ نگار بھی، مؤرخ بھی ہیں اور زبان دان بھی جبکہ لغت نگاری اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اسی حوالے سے اسم، فعل، حرف، لفظ، جملہ، روزمرہ، محاورہ، ضرب الامثال، علم بیان، صنائع بدائع، عروض گویا سب کچھ زیرِ بحث آتا رہتا تھا۔ اس ساری گفتگو کے دوران میں شاہ جی ایک بات تسلسل سے دہرایا کرتے تھے اور وہ یہ کہ تمام زبانوں کی بنیاد ''فعل'' ہونا چاہیے جبکہ ہمارے ماہرین لسانیات نے فعل کی بجائے اسم کو موضوع بنا رکھا ہے۔ بات دل کو لگتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ اس موضوع پر کام کون کرے؟ اور اس نقطۂ نظر کو کس طرح پایۂ ثبوت تک پہنچایا جائے۔

اِس ضمن میں ایک دو آسانیاں بھی تھیں مثلاً ایک آسانی تو یہ تھی کہ ہم اِس مشکل کام کا بیڑا اُٹھا لینا چاہتے تھے۔ دوسری آسانی یہ تھی کہ ڈاکٹر جی الانہ (۳) اور ڈاکٹر یوسف خشک (۴) سے لے کر ڈاکٹر صابر آفاقی (۵) اور ڈاکٹر اعجاز بیگ (۶) تک سے ہماری نیازمندی کا تعلق تھا اور ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہم خط لکھیں گے یا خود پہنچ جائیں گے تو انہیں ہمارے استفسارات کا جواب دینا ہی پڑے گا۔ تیسری خوب صورت

بات یہ تھی کہ نسیم امروہوی اور اُن کا سارا کام اُردو زبان دانی پر مشتمل تھا نیز وہ خالصتاً اُردو زباں دان طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ سید زوار حسین شاہ خالصتاً سرائیکی زبان بولنے والے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اِن کے آباءواجداد مبارک پور ضلع بہاول پور کے رہنے والے تھے یا اِس سے بھی پہلے کبیر والا ضلع خانیوال سے۔ بہر حال یہ دونوں قصبات خالص سرائیکی زبان بولنے والے علاقوں پر مشتمل ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سید زوار حسین شاہ سرائیکی کی حمایت یا مخالفت میں کوئی اُلٹا سیدھا نظریہ پیش کر رہے ہیں جبکہ میری کوئی زبان ہی نہیں تھی۔ تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ تقسیم ملک سے پہلے میرے والدین کا وطن سلطان پور تحصیل جگادری ضلع انبالہ مشرقی پنجاب تھا جو خالصتاً ہریانوی زبان بولنے والے افراد کا علاقہ ہے۔ ہجرت کے بعد وہ مظفر گڑھ میں آ بسے جہاں ہریانوی، پنجابی اور سرائیکی بولنے والوں کی کثرت تھی۔ میں بوسن روڈ کالج ملتان میں داخل ہوا تو مجھے کسی بھی زبان پر کامل دسترس نہیں تھی اور میرے جملے ہر زبان کے مختلف الفاظ کا مرکب ہوتے تھے۔ مجبوراً فیصلہ کیا کہ آج کے بعد اُردو کے علاوہ کوئی علاقائی زبان نہیں بولوں گا۔ یہ الگ بات کہ اُردو زبان کی تعلیم و تدریس ہی میرا شوق اور ذریعۂ رزق بن گئی۔ گویا ہم تینوں یعنی نسیم امروہوی، سید زوار حسین شاہ اور میں تین مختلف تہذیبوں، علاقوں اور بظاہر زبانوں سے متعلق لوگ تھے۔ اِسی لیے ہم پر کسی خاص زبان کی مخالفت یا حمایت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

اِسی اثناء میں مقتدرہ قومی زبان کا پرچہ ماہنامہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد مطبوعہ ستمبر ۲۰۰۳ء ملا۔ سرورق ہی حیران کن تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا ''اُردو کب اور کہاں پیدا ہوئی'' (۷) گویا یہ مسئلہ تا حال حل نہیں ہو سکا۔ درحقیقت یہ مسئلہ حل ہو ہی نہیں سکتا۔ اِس لیے کہ یہ خالصتاً علمی مسئلہ ہے اور ہم نے اِسے سیاسی مسئلہ بنا لیا ہے۔ اگر اِسے علمی طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا اِس میں کوئی شک باقی رہ گیا ہے کہ ہم نے اور بہت سی دکانوں کی طرح اُردو کی پیدائش کے حوالے سے بھی ایک دکان سجا رکھی ہے۔ یہ بات ممکن ہے اور کبھی کبھار ہوتی بھی رہتی ہے کہ ایک شخص کے ایک سے زیادہ مدفن بن جائیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ میرے مقاماتِ پیدائش ایک سے زیادہ ہیں۔ اِسی طرح یہ بات تو ممکن ہے کہ ایک جوڑا یہ دعویٰ کرے کہ اُس کے بچے ایک یا ایک سے زیادہ ہیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی بچہ یہ دعویٰ کرے کہ میں ایک سے زیادہ ماؤں کا بچہ ہوں۔ اگر یہ دعویٰ نا قابل تسلیم ہو تو پھر یہ بات کیسے مانی جا سکتی ہے کہ اُردو زبان دہلی، دکن، سندھ اور پنجاب میں مختلف اوقات میں پیدا ہو سکتی ہے جبکہ محمد حسین آزاد، نصیر الدین ہاشمی، سید سلیمان ندوی، حافظ محمود شیرانی اور خاطر غزنوی نے اپنی کتب آبِ حیات (۸)، دکن میں اُردو (۹)، نقوشِ سلیمانی (۱۰)، پنجاب میں اُردو (۱۱) اور اُردو زبان کا ماخذ، ہندکو (۱۲) میں یہی دعوے کیے اور اِن دعوؤں کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دلچسپ امر یہ

ہے کہ اِن بزرگوں میں کوئی شخصیت ایسی نہیں جس کی علمیت، محنت اور قابلیت پر حرف گیری کی جا سکے۔ لیکن ایک بات اور بھی یقینی ہے کہ جس طرح میں اور زوار حسین شاہ زبان، زبانوں کے علم، زبانوں کی تاریخ اور ماہیت سے محض ناواقف ہیں، اِسی طرح یہ بزرگ بھی ہر طرح کا علم رکھنے اور محقق ہونے کے باوجود علمِ لسانیات سے بڑی حد تک نابلد تھے ورنہ محمد حسین آزاد اُردو کو صرف دِلّی اور نواحِ دِلّی کی زبان قرار نہ دیتے اور اِسی طرح نصیر الدین ہاشمی صرف دکن، سید سلیمان ندوی صرف سندھ اور حافظ محمود شیرانی صرف پنجاب کو اُردو کا مولد قرار نہ دیتے۔ دراصل ان بزرگوں سے دو تین بڑی غلطیاں ہوئیں جن کے نتیجے میں یہ حقائق کا ادراک نہ کر سکے۔

پہلی غلطی کو ہم تعصب کی بجائے صرف عصبیت کا نام دے سکتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے نتیجے میں دہلی سے بھاگ کر لاہور آنا پڑا۔ وہ لاہور آئے تو اُن کے پاس ذوقؔ کے غیر مطبوعہ کلام اور دہلی کی بے ربط و تحقیق یادوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُنھوں نے انگریزوں کے حکم پر کئی سفر کیے اور انجمن پنجاب میں خدمات کے علاوہ اپنی یادیں ''آبِ حیات'' کے نام سے مرتب کیں۔ آبِ حیات میں اپنے چھُٹے ہوئے وطن اور وہاں کے شعراء کا ذکر تو کیا ہی، ساتھ ہی دہلی کو اُردو کا مولد بھی قرار دے ڈالا۔ یہ اُن کی عصبیت اور علمِ لسانیات سے ناواقفیت کی دلیل تھی۔ خیر ایک دقت بھی مولانا محمد حسین آزاد کو درپیش تھی کہ وہ اِس طرح کے لسانی مطالعے کے لیے سارے برصغیر کا سفر بھی نہیں کر سکتے تھے۔

نصیر الدین ہاشمی کے لیے حالات کسی قدر سازگار تھے لیکن اُن کے نتائج اِس لیے قابل توجہ نہ رہے کہ وہ بھی دکن، دکن کی سیاسی و تجارتی تاریخ اور قبل از اسلام یا بعد از اسلام دکن میں عربوں کی آمد سے دھوکا کھا گئے۔ دوسرے دکن کی محبت نے اُنھیں خاص طرح کے نتائج مستخرج کرنے پر مجبور کر دیا ورنہ وہ جس قدر محنتی محقق تھے اُس کا اندازہ صرف اِس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے ''آبِ حیات'' میں پیش کردہ ''اُردو شاعری کا باوائے آدم'' والا نظریہ فوراً ہی مسترد کر دیا اور ثابت کیا کہ ولی دکنی سے پہلے اُردو شاعری میں کئی اصناف میں بڑے بڑے شعراء پیدا ہو چکے تھے اور آنے والے محققین و مؤرخین ادب مثلاً ڈاکٹر جمیل جالبی نے نصیر الدین ہاشمی کے نقطۂ نظر کی حقانیت ثابت کر دی۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ صرف دکن کو اُردو کا مولد قرار دینے والا نظریہ درست نہیں ہو سکتا۔

مولانا سید سلیمان ندوی یعنی مولانا شبلی نعمانی کا شاگرد اور جانشین کم تر درجے کا عالم نہیں ہو سکتا۔ ''سیرت النبیؐ'' کی تکمیل اور ''نقوشِ سلیمانی'' کے مضامین ان کی علمیت کی بین دلیل ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سید صاحب بہت بڑے عالم دین ہونے کے باوجود لسانیات کے ماہر نہ تھے۔ غالباً انہوں نے تو صرف یہ دیکھا کہ اگر عربوں سے میل جول کے نتیجے میں اُردو وجود میں آئی تو یہ میل جول دکن کی بجائے

سندھ کے علاقے میں زیادہ ہوا جہاں محمد بن قاسم دو ہزار کے قریب عرب سپاہیوں کے علاوہ اسی قدر ایرانی مسلمانوں کے ساتھ آیا۔ سندھ کو فتح کیا اور طویل عرصے تک یہاں مسلمان حکومت قائم رہی۔ مقامی زبانوں کے صرف عربی ہی نہیں بلکہ فارسی لفظ بھی شامل ہوئے اور ایک نئی زبان معرضِ وجود میں آ گئی۔ میں عصبیت کی بجائے سادگی کا لفظ استعمال کرتے ہوئے کہوں گا کہ مولانا نے ایک بالکل غلط نظریہ پیش کر دیا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حافظ محمود شیرانی اُردو میں ایک معتبر محقق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''مقالات شیرانی'' اور ''پنجاب میں اُردو'' اس دعوے کی روشن دلیل ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق پروفیسر شیرانی نے ''پنجاب میں اُردو'' ایک اور جیّد عالم علامہ عبداللہ یوسف علی کی خواہش پر لکھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:۔

''پروفیسر شیرانی مرحوم (اکتوبر ۱۸۸۰ء۔۱۵فروری
۱۹۴۶ء) جن دنوں (۱۹۲۱ء۔۱۹۲۸ء) اسلامیہ کالج
لاہور میں اُردو کے لیکچرار تھے علامہ عبداللہ یوسف علی
(پرنسپل) کی خواہش پر انہوں نے ''پنجاب میں اُردو''
تحریر کی۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۲۸ء میں انجمن ترقئ
اُردو کی طرف سے شائع ہوئی۔''(۱۳)

اس ساری کتاب کو دیکھا جائے تو یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ اُردو برج بھاشا سے ہرگز نہیں نکلی جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں دعویٰ کیا ہے (۱۴) لیکن ہم یہ بات بھی ماننے کے لیے تیار نہیں کہ پنجاب اُردو زبان کا مولد اور پنجابی اُردو زبان کی ماں ہے۔ درحقیقت حافظ محمود شیرانی سے بھی وہی غلطی سرزد ہوئی جو اس سے پہلے دوسرے صاحبانِ علم کر رہے تھے کہ اسماء کی فہرستیں دے کر اُردو اور اپنی پسندیدہ علاقائی زبان کے تعلق کو واضح کرنے کی سعی کی گئی۔ مثلاً حافظ محمود شیرانی کہتے ہیں:۔

''اُردو میں برج لہجے سے پنجابی لہجہ کا سخت مقابلہ رہا
ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں ایک لفظ دونوں
لہجوں میں بولا جا رہا ہے مثلاً بادل، بدّل، بازار،
بزار، چھاج اور چھج۔''(۱۵)

شیرانی صاحب نے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ برج اور پنجابی کا لہجے کا اختلاف ہے پھر بھی برج بھاشا اور پنجابی کو دو مختلف زبانیں تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے۔ یہی غلطی ان کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی دہرائی۔ اور اُردو کو مختلف علاقوں سے متعلق کرتے چلے گئے۔ اس کی ایک بڑی مثال ڈاکٹر مہر عبدالحق کی

کتاب ''اُردو اور ملتانی زبان کے لسانی روابط'' ہے۔''(۱۶)

گزشتہ دنوں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے خاطر غزنوی کی ایک تصنیف ''اُردو زبان کا ماخذ، ہندکو'' شائع کی ہے۔ اِس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر فتح محمد ملک صدرِ نشین مقتدرہ قومی زبان لکھتے ہیں:۔

''سرحد میں ترقی پسند ادبی تحریک کے ان قائدین نے
اٹک کے اس پار کے تہذیب و فن کو شاعر، مؤرخ، نقاد
اور ماہر لسانیات کی نظر سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ پشتو
ادب و شعر کو اُردو دنیا سے روشناس کرانے کے علاوہ
ان تخلیقی فن کاروں نے یہ نیا لسانی نظریہ بھی پیش کیا
ہے کہ اُردو زبان صوبہ سرحد میں بولی جانے والی
زبان ہندکو کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ میں اب تک اس
دعویٰ کو اُردو زبان سے والہانہ محبت پر مبنی سمجھتا رہا مگر
آج جب خاطر غزنوی کی کتاب ''ہندکو...... اُردو
زبان کا ماخذ''(۱۷) کی ورق گردانی کی تو کھلا کہ اس
لسانی نظریے کی بنیاد بہت مضبوط ہے''۔(۱۸)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ جہاں سے سرائیکی علاقہ ختم ہوتا ہے وہیں سے ہندکو زبان کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے اور جہاں سے ہندکو کا علاقہ ختم ہوتا ہے وہاں سے کشمیر اور جموں کے علاقے شروع ہو جاتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مری سے جموں تک دس بارہ مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں۔ جن میں سرائیکی، ہندکو، گجری اور کشمیری وغیرہ شامل ہیں۔ جموں میں اُردو زبان و ادب کے حوالے سے ماہنامہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد کے ایک صفحے کا صرف ایک کیپشن دیکھنا کافی ہوگا جو نمایاں کر کے یوں لکھا گیا ہے:۔

''یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ خطۂ جموں اُردو کی ان
ابتدائی بستیوں میں سے ایک ہے جہاں اُردو کا بیج
سب سے پہلے بویا گیا''۔(۱۹)

اس مضمون کا آغاز دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پروفیسر ظہور الدین کہتے ہیں:۔

''یہاں ابتداً یہ جان لینا ضروری ہے کہ تہذیبی و تمدنی
ہی نہیں سیاسی و سماجی اعتبار سے بھی ریاست جموں

کشمیر ہمیشہ سے برصغیر کا جز و لاینفک رہی ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ یہاں اُبھرنے والی اکثر روایتوں پر ملک
گیر سطح پر ہونے والے تجربات کے اثرات مرتب
ہوتے رہے ہیں۔ گویا برصغیر سے باہر ہونے والے
تجربات نے بھی وقتاً فوقتاً اسے اسی طرح متاثر کیا ہے
جس طرح ان سے مجموعی اعتبار سے برصغیر متاثر ہوتا
رہا ہے''۔(۲۰)

گویا پروفیسر ظہور الدین اُردو کو صرف جموں وکشمیر کی زبان قرار نہیں دیتے بلکہ جنوبی وشمالی پنجاب کے ساتھ ساتھ مشرقی پنجاب، راجستھان، سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد، اُتر پردیش، دکن بلکہ بنگال تک کی زبان تصور کرتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بنگالی زبان کے بہت سے حصے ایسے ہیں جو برصغیر کا ہر باشندہ ذرا سی کوشش سے بہت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ مثلاً ''تمار نام کیۂ'' وغیرہ کس کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تو پھر پنجاب میں اُردو، دکن میں اُردو، سندھ میں اُردو، بلوچستان میں اُردو اور کشمیر میں اُردو وغیرہ کے معنی کیا ہوئے؟ یوں لگتا ہے کہ یا تو یہ تمام نظریے غلط ہیں یا پھر ان میں اہل علم نے حقیقت کی کوئی ایک جھلک دیکھی ہے اور مکمل حقیقت کو اپنی نگاہوں سے اوجھل رکھا ہے۔ یعنی اگر ہم یہ کہیں کہ اُردو سارے برصغیر اور جموں وکشمیر میں بولی جاتی رہی ہے اور بولی جاتی رہے گی تو مکمل حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

مذکورہ بالا تقریباً سبھی کتب میں اُردو کو ایک آریائی زبان قرار دیا گیا ہے لیکن ہماری مشکل اُس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اہل علم اُردو کو آریائی زبان بھی نہیں مانتے۔ اِس حوالے سے اقتباس طویل تو ہوگا لیکن اس سلسلے میں بہت سی گرہیں کھلتی چلی جائیں گی اور عین الحق فرید کوٹی کی کاوش اور اُن کا نقطۂ نظر بھی کھل کر سامنے آجائے گا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:۔

''اِس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے تو ایک پوری
کتاب'' پاکستانی کلچر'' لکھ ڈالی، فیض اور پروفیسر کرار
حسین، ڈاکٹر اجمل اور ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر
وحید قریشی، جیلانی کامران اور سجاد باقر رضوی، انور
سدید اور فتح محمد ملک نیز حمید احمد خان، ڈاکٹر سید
عبداللہ اور مولانا صلاح الدین احمد ایسے مفکرین اور
ناقدین نے اس سلسلے میں اظہار خیال کیا کیونکہ زبان

ثقافت کا جزو لاینفک ہوتی ہے لہٰذا جب پاکستان میں
ثقافتی جڑوں کی تلاش شروع ہوئی تو لامحالہ اُردو زبان
کی جڑیں دریافت کرنے کا رجحان بھی منظر عام پر
آ گیا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے وقت میں برج
بھاشا کو اُردو کی ماں قرار دیا تھا اور ان کے بعد حافظ
محمود شیرانی نے پنجابی کو۔ اسی طرح نصیر الدین ہاشمی
نے اُردو کا رشتہ قدیم دکنی سے جوڑ دیا تھا۔ مگر اب
مراجعت کے اس رجحان کے تحت جو ثقافتی جڑوں کی
تلاش پر منتج ہوا تھا اُردو زبان کی جڑیں ماضی بعید میں
تلاش کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر شوکت
سبزواری نے پالی پراکرت سے اُردو کا رشتہ جوڑا اور
یوں ماضی میں تقریباً ڈھائی ہزار سال پیچھے ہٹ گئے۔
ڈاکٹر سہیل بخاری نے مہاراشٹری کو اُردو کی اصل
بتایا۔ ''اُردو شاعری کا مزاج'' میں اُردو کی جڑیں
وادیٔ سندھ کی تہذیب میں تلاش کی گئیں۔ مگر اِس
سلسلے میں سب سے مضبوط اور منظم کام عین الحق فرید
کوٹی کا تھا جنہوں نے اُردو کا رشتہ دراوڑی زبانوں
سے جوڑ کر جڑوں کی تلاش کے کام کی گویا تکمیل
کردی''۔(۲۱)

یادر ہے کہ اُردو زبان کی قدیم تاریخ'' عین الحق فرید کوٹی نے لکھی۔ خلیل صدیقی، جعفر علی اثر لکھنوی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور سید قدرت نقوی مرحوم جیسے ماہرین لسانیات نے دیکھی اور اس حوالے سے ان کے مشورے بھی عین الحق فرید کوٹی کے شامل حال رہے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سابق ڈائریکٹر شعبۂ تعلیمات سندھ یونی ورسٹی نے اس کا مفصل تعارف لکھا اور ڈاکٹر وزیر آغا جیسے نقاد نے ''ایک جائزہ'' کے نام سے مختصر سا دیباچہ لکھا۔ اس کے علاوہ فہرست ابواب پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ عین الحق فرید کوٹی نے کتاب لکھنے میں بے حد محنت کی ہے۔

ستمبر ۲۰۰۳ء کے ماہنامہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد کے صفحۂ اوّل پر ڈاکٹر خالد حسن قادری کی تحریر

کا ایک اقتباس دیا گیا ہے جو کچھ یوں ہے:۔

''اُردو غیر آریائی زبان ہے۔سنسکرت سے اس کا
مطلق کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کی ابتدائی جڑیں موئن
جوڈرو اور ہڑپہ میں ڈھونڈنی چاہئیں''۔(۲۲)

ڈاکٹر خالد حسن قادری کے نظریے کے حوالے سے مختلف تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ کہنا کافی ہوگا کہ اخبارِ اُردو کے مذکورہ بالا شمارے میں پروفیسر فتح محمد ملک نے ''اُردو کا مولد اور ماخذ'' کے عنوان سے ڈاکٹر خالد حسن قادری کے نظریے کی بے حد تحسین فرمائی ہے۔وہ لکھتے ہیں:۔

''خالد حسن قادری نے جستجو جاری رکھی اور
بالآخر مضبوط لسانی، تاریخی اور تہذیبی استدلال کے
ساتھ اُردو کو عربی سے ماخوذ ثابت کر دکھایا۔فرید کوٹی
صاحب جس بات کو فقط مذہبی جذباتیت قرار دیتے
ہیں اُسے قادری صاحب ایک سائنسی حقیقت سے تعبیر
کرتے ہیں''۔(۲۳)

اس سے قطع نظر کہ مذکورہ بالا تحسین کے کیا نتائج نکلتے ہیں ہم ڈاکٹر خالد حسن قادری کے نظریے پر محمد پرویش شاہین کے تنقیدی بلکہ تنقیصی مضمون کا ایک اقتباس دیکھتے ہیں:۔

''اُنہوں نے اپنے مضمون میں مقدس شہروں، اساطیر
وغیرہ کے نام بھی دیئے ہیں۔بات لمبی ہو جائے گی
ورنہ میں یہاں سینکڑوں نام عبرانی یا ارضِ فلسطین اور
افغانستان اور صوبہ سرحد کے مقامات، شہروں، گاؤں
وغیرہ اور کورو پانڈو، پنج پنچال، شیوا، برہما، رام چندر
جی اور ان کا تخت، سیتا جی کی کہانی، تختِ سلیمان، موسیٰ
کا مصلیٰ وغیرہ دے دیتا۔میرے خیال میں عام تحقیق
میں بھی لیکن لسانیاتی تحقیق میں مقامات، جگہوں،
اشخاص، دریاؤں، پہاڑوں وغیرہ کے نام بھی مطالعے
کے مستحق ہیں''۔(۲۴)

گویا محمد پرویش شاہین اِسی غلطی کے اعادے کا مشورہ دے رہے ہیں جو مولانا آزاد و حافظ

شیرانی سے لے کر عین الحق فرید کوٹی اور ڈاکٹر خالد حسن قادری تک کے نظریوں میں نظر آتی ہے۔سوال یہ ہے کہ زبانوں اور اس طرح کے نظریات کا انحصار اسماء پر ہونا چاہیے یا افعال پر؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اسم عام طور پر تبدیل نہیں ہوتا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ انسانوں کے ساتھ سفر کرتا رہتا ہے پھر نئی ایجادات جہاں جہاں تک پہنچتی ہیں یہ اسماء بھی وہاں وہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔جدید دور میں ٹیلی وژن اور کمپیوٹر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔بھارتی پوری کوشش کر لیں تو بھی دوردرشن ہندوستان میں تو شاید چل جائے مگر باقی دنیا میں وہی ٹی۔وی چلے گا۔ہاں عرب ''ٹ'' نہیں بول سکتے تو وہ ٹیلی وژن کی جگہ تیلی وزن کہیں گے اور وہ تمام لوگ جو تخفیف کے قائل ہیں اس اسم کو تی۔وی کہنے لگیں گے۔اِسی طرح ریڈیو کو تمام عرب ریدیو اور برصغیر کے باشندے ریڈیو، ریڈوا، ریڈو کہہ کر کام چلاتے ہیں۔گویا جو بات ہم کہنا چاہتے ہیں اس کے مطابق اوّل تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی بالفرض بولنے والوں کی کوئی مجبوری ہوئی تو تلفظ میں معمولی تبدیلی ہوگی۔ چند اسماء دیکھیے جو دوسری زبانوں سے اُردو میں آئے مثلاً ٹیلی وژن، ٹیلی فون، فیکس، انٹرنیٹ، ریل، ریلوے، اسٹیشن، ڈاکٹر، انجینئر، سکول، کالج، یونی ورسٹی، آفس، ٹیبل پین، پینسل، بال پوائنٹ، پن، سیٹ، موٹر، مکینک، کار، ٹریکٹر، بس، ٹیوب ویل، سائیکل، روڈ، موبائل، ٹیپ ریکارڈ، ٹائر، بال، کرکٹ، ہاکی، ٹیبل ٹینس، فٹ بال، پارلیمنٹ، سپیکر، لاؤڈ سپیکر، بلب، تسبیح، جائے نماز، گل، رنگ، رہوار، راہب، راکب، ذوالفقار، دیو، دینار، دست، دہقان، درہم، نگاہ، چشم، پا، درس گاہ، در، دختر، اختر اور اخگر وغیرہ۔یہ تمام اسم ہم نے دوسری زبانوں اور تہذیبوں سے جوں کے توں قبول کیے۔اسماء کی یہ فہرست کافی طویل ہوسکتی ہے مگر حوالے کے لیے اتنا کافی ہے۔

دراصل اسم کی مثال کتے جیسی ہے کہ وہ گھر کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اہل خانہ کا وفادار رہتا ہے اور اہل خانہ کے ساتھ سفر کرتا ہے۔جبکہ زبانوں اور افعال کی مثال بلّی جیسی ہے جو اہل خانہ کی پابند ہونے کی بجائے گھر کی پابند رہتی ہے۔اہل خانہ گھر چھوڑ دیں، سفر پہ چلے جائیں یا گھر فروخت کر دیں، بلّی اہل خانہ کے ساتھ نہیں جاتی۔بالکل اِسی طرح زبان اور افعال بھی گھٹتے بڑھتے ہوئے اپنے ہی علاقے میں مقیم رہتے ہیں کیونکہ فعل کا تعلق زمین اور معاشرت سے ہوتا ہے۔لہٰذا زبان کا انحصار اور اس کی شناخت اسم کی بجائے فعل سے کی جانی چاہیے۔زبانوں کے اشتراک یا عدم اشتراک کے بارے میں بنیادی اصول دخیل الفاظ کی فہرستیں مرتب کر دینا نہیں ہونا چاہیے نیز اسماء کے اشتراک سے بھی کام نہیں چلتا بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ افعال کا اشتراک کس قدر رہے اور زبان کا بنیادی ڈھانچہ کیسا ہے؟

جب ہم سندھ سے کشمیر، مغربی پنجاب سے مشرقی پنجاب اور شمالی ہند سے جنوبی ہند تک کے علاقوں کو دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ان تمام علاقوں میں بولی جانے والی مختلف زبانوں/ بولیوں میں بیشتر

افعال یکساں طور پر مستعمل ہیں۔ البتہ کہیں کہیں صورتِ حال کے ساتھ کچھ نئے افعال بھی پیدا ہو گئے ہیں مثلاً کچھ مشترک افعال دیکھیے۔ رُلنا، رُلانا، پینا، سونا، بیٹھنا، مڑنا، جاگنا، لڑنا، بھڑنا، تولنا، بولنا، ہنسنا، رونا، آنا، جانا، کرنا، مرنا، چلنا، پھرنا، رہنا، سہنا، کھیلنا، کودنا، اَکڑنا، سکڑنا، بنانا، کھانا، پینا، توڑنا، ملنا، سینا، چڑھنا، گھڑنا، مٹنا، مٹانا وغیرہ۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان زبانوں میں اُردو کی طرح افعال لازم، متعدی اور فعل مجہول بھی موجود ہیں۔ اس حوالے سے خالصتاً علمی بحث کرنے کی بجائے بانگر کے لہجے میں ایک نامعلوم شاعر کا شعر دیکھیے:۔

چالن کا ناں ے
ونجو ونجو ناٹن کا ناں کو
تولن کا ناں
دھریا پڑو پالینا ایک نہ دینا
دو

اتفاق ملاحظہ فرمایئے کہ اس شعر میں سات افعال موجود ہیں جن میں سے چار افعال اُردو کے تمام علاقوں میں یکساں مروّج ہیں۔ جبکہ ناٹن صرف حصار اور روہتک کے لہجے میں پایا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مصدر ونجن سرائیکی، سندھی اور ہندکو زبان میں مستعمل ہے۔ یہاں پر ایک مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اُردو زبان میں مصدر کی نشانی مصدر کے آخر میں موجود ''نا'' ہے۔ جیسا کہ جاگنا، کھانا، پینا وغیرہ۔ لیکن اگر ہم حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' کے اسباق یاد رکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اہل زبان نے اُردو میں کئی قیامتیں ڈھائی ہیں۔ مثلاً بلا وجہ مرغی کے مقابلے میں مرغا کی جگہ مرغ مستعمل کر لیا ہے اسی طرح مصدر کے اختتام پر موجود ''ں'' اُڑا دیا ہے ورنہ ہم بولتے ہوئے اس نون غنّہ کا اعلان ضرور کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا، پینا وغیرہ۔ یہاں ایک اور بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اہل زبان نے نہ صرف نون غنّہ کو اُڑا دیا ہے بلکہ غیر ضروری طور پر مصدر کے آخر میں الف کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔ اگر ہم اُردو میں موجود مصدر کے آخری الف کو ہٹا دیں تو اُردو زبان کا مصدر بھی فارسی کے مصدر کی طرح حرف ''ن'' پر اختتام پذیر ہوگا۔ جیسا کہ سندھی، سرائیکی، پنجابی، راجستھانی، ہریانوی، پوٹھوہاری، کشمیری اور گجری وغیرہ میں اب بھی ہے۔ ہم ذرا سی توجہ سے اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ وادیٔ گنگا اور سندھ میں موجود زبانوں/ بولیوں کے اکثر الفاظ میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ اگر کہیں چھوٹی موٹی تبدیلی ہے تو وہ وہاں کے خاص موسمی، معاشی اور سیاسی، حالات کی وجہ سے ہے۔☆

ہم نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف ''نیرنگِ خیال'' کا

ایک اقتباس سندھی، سرائیکی، پنجابی، ہریانوی، ہندکو اور کشمیری علماء کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ بھیجا کہ وہ اس اقتباس کا اپنی زبان میں ترجمہ فرما دیں۔ جن احباب کو ہم نے خطوط اور مذکورہ اقتباس بھیجا ان میں سے سندھی زبان کے محقق ڈاکٹر محمد یوسف خشک، سرائیکی زبان کے ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز، پنجابی زبان کے ڈاکٹر اعجاز بیگ، ہریانوی علاقے کے باسی رانا عبدالحکیم پٹیالوی (حال مقیم بہاول پور) نے نہ صرف ہمارے خطوط کا جواب دیا بلکہ مذکورہ اقتباس کا ترجمہ بھی بھجوایا تاہم ڈاکٹر صابر آفاقی نے ترجمہ بھجوانے کی بجائے نمونے کے طور پر اپنا کلام اور خط ارسال فرمایا۔ نیز لکھا کہ اسی خط کو نثر کا نمونہ سمجھا جائے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف نیرنگِ خیال کا اقتباس اور اس کے تراجم پیش خدمت ہیں۔

نیرنگِ خیال سے اقتباس:۔

''نہ گرمی میں تہ خانے سجانے پڑتے نہ سردی میں آتش خانے روشن کرتے۔ قدرتی سامان اور اپنے جسموں کی قوتیں ایسی موافق پڑی تھیں کہ جاڑے کی سختی یا ہوا کی گرمی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی نہروں میں بہتے تھے۔ چلتے چشموں پر لوگ جھکتے اور منہ لگا کر پانی پیتے تھے، وہ شربت سے سوا مزہ اور دودھ سے زیادہ قوت دیتے تھے۔ جسمانی طاقت قوتِ ہاضمہ کے ساتھ رفیق تھی۔ بھوک نے ان کی اپنی ہی زبان میں ذائقہ پیدا کیا تھا کہ سیدھے سادے کھانے اور جنگلوں کو پیداواریں رنگا رنگ نعمتوں کے مزے دیتے تھے، آب و ہوا قدرتی غذائیں تیار کر کے زمین کے دسترخوان پر چن دیتی تھی، وہ ہزار مقوی اور مفرح کھانوں کے کام دیتی تھی۔ صبا و نسیم کی شمیم میں ہوائی خوشبوؤں کے عطر مہک رہے تھے۔ بلبلوں کے چہچہے، خوش آواز جانوروں کے زمزمے سنتے تھے۔ خوب صورت خوب صورت چرند پرند آس پاس کلیل کرتے پھرتے تھے۔ جا بجا درختوں کے جھرمٹ تھے، انہی کے سائے میں سب چین سے

زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ عیش وآرام کے قدرتی
سامان اِس بہتات سے تھے کہ ایک شخص کی فراوانی
سے دوسرے کے لیے کمی نہ ہوتی تھی اور کسی طرح
ایک سے دوسرے کو رنج نہ پہنچتا تھا۔ سب کی طبیعتیں
خوشی سے مالا مال اور دل فارغ البال تھے‘‘۔(۲۵)

مذکورہ اقتباس کا سندھی ترجمہ:۔

’’ترجمو‘‘:۔ نہ گرمي ۾ ٿڌ خانا سينگاربا ھئا ۽ نہ سيءَ ۾ سگريون ساں رکيون ھيون۔ قدرتي شين ۽ پنھنجي جسمن جون طاقتون ايتريون پر پور ھيون جو سياري جا سخت سيءَ يا گرمي جي لُک محسوس ئي ڪا نہ ٿيندي ھئي۔ ٿڌاءَ منا پاڻي واھن ۾ واھندا ھئا، وھندڙ چشمن تي ماڻھو جھُڪي پنھنجي اُڃ اجھائيندا ھئا۔ اھي شربت ڪانسواءِ منا ۽ کير ڪان ودیک طاقت ڏيندڙ رھئا، جسماني سگھہ سان گڏوگڏ ھاضمي جي سگھہ جو بہ سات ھوندو ھيو۔ انھن جي پنھنجي جب ۾ بک ھک اھڙو سواد پيدا ڪيو ھيو جو عام سادا کاڌاءِ جھنگ جون پيدائشون رنگارنگ نعمتن جو لطف ڏينديون ھيون، آ ڀوا زمين جي دسترخوان تي بھترين قدرتي غذا تيار ڪري رکندي ھئي جيڪا ھزارين طاقتن ۽ فرحت ڏيندڙ ڪا دن جو ڪم ڏيندي ھئي۔ صبح جي منري ۽ سُرھي ھير ۾ ھوائي سگندن جا عطر مھڪندا ھئا۔ بلبلن جون لاتون ۽ جانورن جو سريليون جھونگارون بدبيون ھيون۔ سھڻا، سھڻا پکي ۽ جانور ھيڏي ھوڏي راندیون ڪندا نظر ايندا ھئا۔ ھر ھندوڻن جا جُھڳٽا ھوندا ھئا۔ جن جي چانوم سب سکون سان زندگي گزاريندا ھئا۔ ھي عيش ۽ آرام ڏيندڙ قدرتي سامان ايترا ودیک ھئا جو ھک شخص جي فراواني سان ٻئي لاءِ ڪمي نہ ٿيندي ھئي ۽ ڪنھن بہ نموني ھک کي ٻئي کان تڪليف نہ پھچندي ھئي، سڀئي خوش طبع ۽ دل جا امير ھوندا ھئا۔(۲۶)

اقتباس کا سرائیکی ترجمہ:۔

ناں ہُنالے وچ بھوئیں ہیٹھلے کوٹھے سجھاونے پوندے ناں سیالے وچ بھاہ دی بخاری سوجھل کرنی پوندی۔ اللہ سوہنے دیاں بنائیاں شہیں تے آپلے جُسّیاں دیاں طاقتاں اینجھے راس آیاں ہَن جو سیالے دا کُراڑ یا وادی تاپش دا پتہ ای ناں لگداہا۔ ٹھڈے تے مٹھے پانی نہریں وچ واہندے ہن۔ واہندے ڈھنڈھیں/ٹوبھے (چشمے) تے لوک نودے تے منہ لا کراہیں پانی پیندے ہن۔ اوہ شربت توں وَدھ چس تے کھیر توں وَدھ طاقت ڈیندڑے ہن۔ جُسے دی طاقت ہاضمے دی تیزی نال کٹھی تھی گئی ہئی۔ بکھ نے انہاندی آپنی ہی جبھ وچ ذائقہ پاڈتا ہا جو سدھے سادے کھانونے تے جنگلیں دے چھوڑونکو ونک دے نعمتاں دی چَس ڈیندے ہن۔ واپانی اللہ سئیں دے آلون بنائے کھاجے تیار کرتے بھوئیں دے کنڈورے تے سجھا ڈیندے ہن۔ اوہ ہزار طاقت ڈیون تے روح فراغ کرن آلے کھاوَنیاں دا کم ڈیندی ہئی۔ سویل دی لُری

دی خشبو آلی واوِچ اُڈنے خشبوئیں دے عِطر مہکدے پئے ہن۔ بُلبلیں دے چہکارے، سُریلے زناوراں دی سُراں چاڑھن سُنیندے ہن۔ سوہنے سوہنے پکھی تے مال نیڑے تیڑے کھِڈ کاریاں کریندے وَڈّے ہن۔ جاہ جاہ ونین دے جُھر مٹّے ہن۔ اُنہاں دی چھاں وچ سبھ بے چنتے حیاتی نبھیندے پئے ہن۔ ایہہ عیش تے آرام دے خدائی سَمان اِتلے ڈھگ سارے ہن جو ہک بندے کول وافر ہن بے کنوں گھاٹ ناں تھیندی ہئی تے کہیں طراحویں ہک کوں بے کنوں رنجکی نہ تھیندی ہئی۔ سبھ دے طبیتاں خوشیں کنوں رجیاں تے دل ڈھکیں کنوں پاک ہن۔(۲۷)

اقتباس کا پنجابی ترجمہ:۔

نہ گرمیاں وچ گھرنیاں سجانیاں پیندیاں سن نہ سردیاں وچ اَگ دان جلانے پیندے۔ رب سبھوں سریر وچ ایہو جہی طاقت آجاندی سی کہ کنی دی ٹھنڈ یاں گرمی ہوندی پتہ ای نہ چلدا۔ ٹھنڈے تے میٹھے پانی نہراں وچ وگدے سن۔ وگدے چشمیاں تے لوکائی نیویں ہوکے تے منہ لاکے پانی پیندے سن۔ اوہ شربت نالوں وی ودھ سواد تے دودھ نالوں ودھ طاقت دیندے سن۔ سریر دا زور تے ہاضمہ دی طاقت اوہدے نال ہوندی سی۔ بھُک نے اونہاں دی اپنی بولی وچ سواد پیدا کردتا سی۔ سادمُرادے کھانے تے جنگلاں دی پیداوار رنگارنگی نعمتاں دے مزے دیندے سن۔ آب وہوا تے قدرتی کھان پین دیاں شیواں تیار کرکے بھوئیں دے دسترخوان تے رکھ دتیاں سن۔ اوہ طاقت تے ہلکے پھلکے کھانیاں داکم دیندیاں سن۔ فجر ویلے دی ٹھنڈی تے خوشبودیاں بھری ہوئیاں ہواوالی عطر دی داشتا کھلا دیندیاں سن۔ بُلبلاں دی چہکار تے سوہنی واج والے جنوراں دیاں واجاں سندے ساں۔ سوہنے سوہنے اُڈارو اِدھر اُدھر کلولاں کردے پئے سن۔ تھاں تھاں تے لوئیاں دے جھنڈ سن۔ جنہیاں دی چھاں تھلے سب چین تے سکھ دی زندگی گزاررہے سن۔ ایہہ سوچ تے آرام رب سبھوں ملن والیاں شیواں انہاں ہون کرکے اِک بندے دے سوکھے ہون نال دوجے نوتھوڑ نہیں سی ہوندی تے اِیس طراحی اِک دوجے نوں کوئی رنج نہیں سی کردا۔ سب اندروں اپنے خوش ہوندے سن تے اوہناں دے دلاں تے کوئی بھار نہیں سی ہوندا۔(۲۸)

اقتباس کا ہریانوی ترجمہ:

نہ گرمی ماں بھنورا سجانے کی جرورت پڑے تھی۔ نہ جاڑے ماں آگ بالن کی ضرورت۔ قدرت کا بخسا ہویا مال ار اپنی جان کا جور ایسی بھلی تھی کہ جاڑا اور گرمی نہیں لگے تھی۔

نہر ماں ٹھنڈے مٹھے پانی چلیں تھے لوگ مودھے پڑ پڑ پانی پیویں تھے۔

سربت ار دودھ جیسا مجا تھا ار جان بنے تھی۔ ہاجمے بڑی ٹھیک رہیں تھے۔ بھوک ماں کواڑ پاپڑ ہوجیں تھے۔ ار جنگل ار پیڑ کے نت نئے پھل کھاویں تھے۔ پیل پنجو اللہ کی نعمتوں کا مجالیواں تھے۔ یو ساری

قدرتی کھراک تھی ار بہترین کھانے کا مجا تھا۔ سکی پا کی روٹی کھا کے کنبہ بگلاں بجاوے تھا۔ کھیت کیار ماں ایسی خسبوئی تھی کہ آج کال کے عطراں نے بھی دور دھریں تھی۔ نہر کے کنارے پہ لیٹ کے ہر جنور کی بولی سندے ار بڑے بھلے لگدے۔

جگہ جگہ بڑے بڑے رُکھ تھے اُن کی چھاواں ماں جندگی گزاراں تھے ار اللہ کا سکر ادا کریں تھے۔ ایک مانس کے مال ماں دوسرے کا بھی حصہ ہووا تھا نہ کوئی کسے نے دکھ دے تھا نہ کوئی چوری چکاری کرتے تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ پہ خس رہیں تھے۔

چھوری چھورے ایک لنگوٹ میں کھیلا کریں تھے۔ سب کی دھی بیٹی برابر تھی۔(۲۹)☆

مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف ''نیرنگِ خیال'' کے مذکورہ اقتباس میں آنے والے افعال اور اِس اقتباس کے سندھی، سرائیکی، پنجابی اور ہریانوی زبانوں/ بولیوں کے تراجم میں آنے والے افعال کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔

اُردو	سندھی	سرائیکی	پنجابی	ہریانوی
سجانے پڑتے	سینگاربااٗ	سجھاونے پوندے	سجانیاں پیندیاں	سجانے پڑے تھی
روشن کرتے	رکبیون ہیون	کرنی پوندی	جلانے پیندے	
پڑی تھیں	ریپور ہیون	آیاں ہن	آجاندی سی	
ہوتی تھی	تیندی ہیئ	لگدا ہا	چلدا	لگے تھی
بہتے تھے	وہندا ہا	واہندے ہن	وگدے سن	چلیں تھے
چلتے	وہنڑ	واہندے	وگدے	
جھکتے	جھکی	نودے	نیویں	مودے
پیتے تھے	اجھائنداٗ	پیندے ہن	پیندے سن	پیویں تھے
دیتے تھے	دیندرہاٗ	ڈیندے ہن	دیندے سن	
چن دیتی تھی	کري رکندی ہئی	چن ڈیندے ہن	رکھ دتیاں سن	
مہک رہے تھے	مھکنداٗ	مہکدے پئے ہن		
چہچہے	سریون	چہکارے	چہکار	
سنتے تھے	بدبیون ہیون	سنیدے ہن	سندے ساں	
کرتے پھرتے تھے	ایندااٗ	کریندے ودے ہن	کردے پئے ساں	
بسر کرتے تھے	گزاریندااٗ	نبھیندے پئے ہن	گزار رہے سن	گزاراں
پہنچتا تھا	پھچندی ہئی	تھیندی ہئی	کردا	

درج بالا الفاظ کی فہرست مرتب کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جو افعال ایک سے زیادہ مرتبہ آئے ہیں انہیں صرف ایک مرتبہ لکھا جائے۔ علاوہ ازیں سندھی، سرائیکی اور پنجابی کے مترجمین نے تو حتی المقدور مولانا آزاد کے اقتباس کا لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہریانوی زبان کے مترجم نے مذکورہ اقتباس کا آزاد ترجمہ کیا ہے۔ اس لیے ان کے ترجمے سے کم سے کم افعال فہرست میں آسکے ہیں۔ دیگر مترجمین نے بھی جہاں آزاد ترجمے کی کوشش کی ہے وہاں افعال کا اختلاف سامنے آیا ہے ورنہ افعال کا ازحد اشتراک موجود ہے۔☆

مولانا محمد حسین آزاد کے مذکورہ اقتباس کے علاوہ ہم نے عام بول چال میں مستعمل کچھ جملوں کے تراجم بھی سندھی، سرائیکی، پنجابی اور ہریانوی زبانوں میں کرائے ہیں تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ آج کی مستعمل اُردو اور اِن زبانوں/ بولیوں میں کس حد تک اشتراک ہے؟ عام بول چال کے اُردو جملے اور ان کے تراجم پیش خدمت ہیں۔

عام بول چال میں استعمال اُردو جملے:۔

بچہ ماں سے کیا کہہ رہا ہے؟ آپ کدھر چلے گئے تھے؟ میں نے ساری بات سن لی۔ کیا آپ نے بھی میری بات پہ توجہ کی؟ ریل گارڑی کیوں رُک گئی ہے؟ تمہیں بیٹھے بیٹھے کیا ہوگیا؟ پیٹرول کے بغیر کار بھی نہیں چلتی۔ اچھے بچے نہیں روتے۔ بہادر آدمی ڈرتا نہیں ہے۔ حالات کیا بگاڑ لیں گے؟

آخر تم سوتے کیوں نہیں؟ نیند کا ماتا جاگے گا کیوں؟
آپ نے اپنی دنیا کب بسائی؟ کتا کس پر بھونک رہا ہے؟ تم کیا لکھ رہے ہو؟ بچے کتاب پڑھ رہے ہیں۔(۳۰)

سابق وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد ڈاکٹر جی۔ الانہ کی طرف سے اُردو جملوں کا سندھی ترجمہ:۔

بار پنھنجي ءَماء کي چوي تو۔

اما تون کيڏانھن هلي وَئي هئيئن۔ مون سڀي گالھ بدی ورتي آهي۔ چا اوهان بہ منھنجي گالھ طرف

توجھ دتو ؟ ریل گا دي چو رُکيي وکئيُ آھي ؟

توھان کی ويني ويني چائي ويو؟ پيٽرول کان سواءِ کار بہ کانہ ھلندي ۔

سُنا بار رُئندانہ آھن، بھادر ماٺھور جندانہ آھن، حالتون چا بگاريندیون؟

آخرتوں سمھين جونتو ؟ ندجي مَمتا چو جا گندي ؟

اوھان پنھنجي دنیا کڈھن آباد کیتی ؟

کتو کنھن تي پيو ﭘﯜنکي ؟

تون چا پيو لکين؟

بار کتاب پڑھي رھيا آھن ۔(۳۱)

مذکورہ اُردو جملوں کا سرائیکی ترجمہ جو معروف شاعر اور نقاد جناب خورشید ناظر نے کیا:۔

بال ماکوں کیا اکھیند اپے؟

تساں کڈے ٹر گیے ہاوے؟

میں سبھو گالھ سن گھدی۔

کیا تساں میڈی گالھ تے دھیان ڈتے ؟

گاڈی کیوں رک گئی ہے

تیکو بیٹھے بٹھا نیں کیا تھی گیئے ؟

پٹرول باجھوں موٹر نی چلدی۔

چنگے بال نیں روندے۔

بہادر آدمی نی ڈردا۔

حالات کیا وگاڑ گھِنسِن ۔

آخرتوں سَمدا کیوں نیں؟

نندر دا ماریا کیوں جاگسی ۔

تساں اپنی دنیا کڈن وسائی ؟

کتا کیں کوں بھونکدا پے؟

تُساں کیا پے لکھدے وے؟

بال کتاب پڑھدے پین ۔(۳۲)

مذکورہ اُردو جملوں کا پنجابی ترجمہ جو سابق صدر شعبۂ پنجابی گورنمنٹ ایس ۔ای کالج پروفیسر ڈاکٹر اعجاز بیگ

نے کیا:۔

بال ماں نوں کیہ کیندا پیا اے۔ کتھے ٹُر گئے سو۔ میں تہاڈی ساری گل سُن لئی اے کیہ تُسیں میری گل تے وی غور کیتا اے۔ ریل گڈی کیوں کھلوگئی اے تہانوں بیٹھے بیٹھے کیہ ہوگیا اے۔ پٹرول توں بغیر گڈی نہیں چلدی۔ چنگے بال روندے نہیں؟ دلیر جوان ڈر دا نہیں۔حالات اوہدا کجھ نہیں وگاڑ سکدے۔

تینوں نیندر نہیں آ ؤندی۔ نیندرا کیوں اُٹھے گا۔تسی اپنی وکھری دنیا کدوں دی وسالئی اے۔کتا کدے تے بھونکن ڈہیا اے۔ بال کتاب پڑھ رے پئے ہین ۔(۳۳)

مذکورہ اُردو جملوں کا ہریانوی ترجمہ جو معروف شاعر رانا عبدالحکیم پٹیالوی نے کیا:۔

چھورا (بالک) ماں سے کے کہہ ریا سے؟ بھئی توں کڑے/کت گیا تھا؟ منے ساری بات سُن لی سے۔کے تنے بی میری بات پہ دھیان دیا سے؟ یار یل گاڈی کیوں کھڑی ہوگئی سے؟ تنے بیٹھے بٹھائے کے ہو گیا سے؟ بِنا پٹرول کے گاڈی بھی نہ چال دی۔ رون آ ے بالک اچھے نیں ہوویں۔نڈر مانس ڈرے کونی۔ بخت کے کرے گا؟ یار تو سوندا کیوں نیں؟ نندایا سے جاگے گا کیوں؟ تنے اپنی دنیا (سنسار) کد بسائی سے؟ کتا کس نے بھونکے سے؟ تیں کے لکھ ریا ہے؟ بالک کتاب پڑان سے ۔(۳۴)☆

اب ہم ان جملوں میں آنے والے افعال کا موازنہ پیش کرتے ہیں تا کہ اُردو اور دیگر مقامی زبانوں/ بولیوں کے اشتراک کی حقیقت کھل کر سامنے آ سکے۔موازنہ ملاحظہ فرمائیے۔

اُردو	سندھی	سرائیکی	پنجابی	ہریانوی
کہہ رہا ہے	توچوي	آکھدے	کیندا پیا اے	کہہ ریا سی
چلے گئے تھے	ھليا ويا ھيو	چلے گئے ہاوے	ٹر گئے سو	گیا تھا
سن لی	بدي ورلی	سن گدھی	سن لئی اے	سن لئی سے
رک گئی ہے	بھيي رہی آ	رک گئی اے	کھلوگئی اے	کھڑی ہوگئی سے
ہوگیا		تھی گے	ہوگیا اے	ہوگیا سے

چلتی	ہلندی	چلدی	چلدی	چالدی
روتے	روئن	روندے	روندے	رون
ڈرتا	ڈجن	ڈردا	ڈردا	ڈرے
بگاڑلیں گے	وگاڑیندا	وگاڑھن سن	وگاڑسکدے	کے کرے گا
سوتے	سمھو	سمدے	نیندر	سوندا
جاگے گا	جاگیندو	جاگسی	اٹھے گا	جاگے گا
بسائی	وسائی	وسائی	وسالئی اے	بسائی
بھونک رہا ہے	پونکی گو پیو	بھوکدا پئے	بھوکن ڈیا اے	بھونکے سے
لکھ رہے ہو	تالکھو	لکھدے پئے ہو		لکھ ریا سے
پڑھ رہے پین	پڑھن	پڑھدے پن	پڑھدے پئے ہن	پڈان

ان سولہ جملوں میں آنے والے افعال میں صرف سندھی کے دو افعال بظاہر مختلف نظر آتے ہیں ایک کہنا اور دوسرا رکنا کے مقابل میں چوي اور بيھي آئے ہیں اور یہ بھی اس لیے کہ سندھی میں حرف ''ک'' عموماً ''چ'' سے بدل جاتا ہے یا پھر اُردو میں حرف ''ب'' سے شروع ہونے والے اکثر الفاظ سندھی، پنجابی اور سرائیکی میں ''و'' سے شروع ہوتے ہیں۔ اسی طرح ''ت''، ''ڈ'' بھی اپنی جگہ تبدیل کرتے ہیں۔ غور کیجیے افعال کا اس قدر اشتراک ہمارے نقطۂ نظر کی تائید کرتا نظر آتا ہے کہ یہ مختلف بولیاں بنیادی طور پر ایک زبان کے مختلف لہجے اور روپ ہیں ورنہ اُردو کسی خاص عہد اور علاقے کی زبان نہیں۔ نہ یہ کسی خاص بولی/ زبان سے پیدا ہوئی ہے۔ موجودہ اُردو ان علاقائی بولیوں کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

اب ہم اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ زبان کے اختلاف کے لیے افعال کی مغائرت کے ساتھ ساتھ جملوں کی ساخت کا مختلف ہونا بھی ضروری ہے یعنی فاعل، فعل، مفعول اور حروف کا ایک جملے میں کسی خاص ترتیب یا قاعدے سے آنا۔ مولانا آزاد کے اقتباس اور روزمرہ استعمال کے جملوں کے تراجم پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ان تمام بولیوں اور اُردو میں جملے کی ساخت میں حیرت ناک حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ہم مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف نیرنگِ خیال سے لیے گئے اقتباس کے پہلے جملے کی تحلیل کر کے اس کا موازنہ مذکورہ تراجم سے کرتے ہیں۔ موازنہ

ملاحظہ کیجیے۔

آزاد کا اُردو جملہ:۔

''نہ گرمی میں تہ خانے سجانے پڑتے نہ سردی میں
آتش خانے روشن کرنے پڑتے''۔

تحلیل:۔

نہ (حرف نفی)، گرمی (اسم کیفیت)، میں (حرف ربط)، تہ خانے (مفعول/اسم)، روشن کرنے پڑتے (فعل/مصدر)۔

نہ (حرف نفی)، سردی (اسم کیفیت)، میں (حرف ربط)، آتش خانے (مفعول/اسم)، روشن کرنے پڑتے (فعل/مصدر)

اس جملے کی ساخت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے دو حصے ہیں۔ ہر حصے میں حرفِ ربط ''میں'' مفعول سے پہلے اور اسم کے بعد آیا ہے۔ جملے کے دونوں حصوں کا اختتام مصادر پر ہوا ہے۔ اب ہم مختلف زبانوں/ بولیوں سے اس جملے کے تراجم اور ان کا تجزیہ و تحلیل پیش کرتے ہیں۔

سندھی ترجمہ اور اس کی تحلیل:

''نہ گرمی م تھہ خانا سینگار با ھامہ سیٔ مہ سگریون ساں رکبیون ھیون''۔

نہ (حرف نفی)، گرمی (اسم کیفیت)، م (حرف ربط)، تھہ خانا (مفعول)، سینگار باھاٰء (فعل/مصادر)۔

نہ (حرف نفی)، سیٔ (اسم کیفیت)، م (حرف ربط)، سگریون (مفعول)، ساں رکبیون ھیون (فعل/مصادر)۔

سرائیکی ترجمہ اور اس کی تحلیل:

''ناں ہنالے وچ بھوئیں ہیٹھلے کوٹھے سجاونے پوندے ناں سیالے وچ بھاہ دی بخاری سوجھل کرنی پوندی''۔

ناں (حرف نفی)، ہنالے (اسم کیفیت)، وچ (حرف ربط)، بھوئیں ہیٹھلے کوٹھے (مفعول)، سجھاونے پوندے (فعل/مصادر)۔

ناں (حرف نفی)، سیالے)اسم کیفیت)، وچ (حرف ربط)، بھاہ دی بخاری (مفعول)، سوجھل کرنی پوندی (فعل مصادر)۔

پنجابی ترجمہ اور اس کی تحلیل:

’’نہ گرمیاں وچ گھرنیاں سجانیاں پیندیاں سن نہ سردیاں وچ اگ دان جلانے پیندے‘‘۔

نہ (حرف نفی)، گرمیاں (اسم کیفیت)، وچ (حرف ربط)، گھرنیاں (مفعول)، سجانیاں پیندیاں سن (فعل/مصادر)۔

نہ (حرف نفی)، سردیاں (اسم کیفیت)، وچ (حرف ربط)، اگ دان (مفعول) جلانے پیندے (فعل/مصادر)۔

ہریانوی ترجمہ اور اس کی تحلیل:

’’نہ گرمی ماں بھنورا سجانے کی جرورت پڑے تھی نہ جاڈے ماں آگ بالن کی ضرورت‘‘۔

نہ (حرف نفی) گرمی (اسم کیفیت)، ماں (حرف ربط) بھنورا (مفعول)، سجانے پڑے تھی (فعل/مصادر)۔

نہ (حرف نفی)، جاڈے (اسم کیفیت)، ماں (حرف ربط)، آگ (اسم)، بالن (مصدر/فعل)۔

ان چاروں تراجم اور اُردو جملے میں یہ قدر مشترک پائی جاتی ہے کہ ان میں اسم، فعل، مفعول اور حروف کا استعمال قواعد کی رو سے ایک جیسا ہے۔ جملے کی ساخت میں مکمل یکسانیت نظر آتی ہے۔☆

اب روزمرہ استعمال میں آنے والے ایک اُردو جملے کی ساخت اور پھر اس جملے کے مذکورہ زبان/بولیوں کے تراجم اور تحلیل ملاحظہ کیجیے۔

اُردو جملہ:۔ بچے کتاب پڑھ رہے ہیں۔

تحلیل:۔ بچے (اسم فاعل)، کتاب (مفعول)، پڑھ رہے ہیں (فعل مصدر)۔

سرائیکی جملہ:۔ بال کتاب پڑھدے پِن (لفظ بال میرا من تک کے زمانے کے نثر نگاروں کے ہاں موجود ہے اور بال بچے مرکب کی صورت میں آج بھی موجود ہیں)۔

تحلیل:۔ بال (اسم فاعل)، کتاب (مفعول)، پڑھدے پِن (فعل مصدر)۔

سندھی ترجمہ:۔ بار کتاب پڑھي رهيا آهن (جی الانہ)

تحلیل: بار (اسم فاعل)، کتاب (مفعول)، پڑھي رهيا آهن (فعل/مصدر)۔

پنجابی ترجمہ:۔ بال کتاب پڑھدے پۓ نے

بال (اسم فاعل)، کتاب (مفعول)، پڑھدے پۓ نے (فعل/مصدر)۔

ہریانوی ترجمہ:۔ بالک کتاب پڑان سے

بالک (اسم فاعل)، کتاب (مفعول)، پڑان سے (فعل/مصدر)۔

اس اُردو جملے کی ساخت اور پھر تراجم کی ساخت پر غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ اُردو اور ان زبانوں/بولیوں میں جملے کی ساخت کے اصول یکساں ہیں۔ اُردو میں عام بول چال کے جملوں میں عموماً فاعل، مفعول اور فعل کی ترتیب ہوتی ہے۔ یہی ترتیب ان چاروں زبانوں/بولیوں میں بھی نظر آتی ہے۔☆

اُردو اور اُن زبانوں کے اشتراک کی ایک اور صورت بھی دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ یہ کہ اُردو، سندھی، سرائیکی، پنجابی، ہریانوی، پوٹھوہاری، ہندکو اور گجری وغیرہ میں جب کسی بھی قسم کا سوال کیا جاتا ہے تو عموماً سوالیہ لفظ حرف ’’ک‘‘ سے شروع ہوتا ہے۔ صرف سندھی زبان میں کہیں کہیں حرف ’’ک‘‘، ’’چ‘‘ سے بدل جاتا ہے ورنہ باقی زبانوں/بولیوں میں مکمل یکسانیت ملتی ہے۔ مثلاً کتھاں، کیویں، کدوں، کدی، کون، کیا، کیوں، کیسا وغیرہ۔

گوجری/کشمیری کے تراجم کوشش کے باوجود ہم تک نہیں پہنچے البتہ ڈاکٹر صابر آفاقی نے گوجری زبان میں راقم (سید زوار حسین شاہ) کے نام خط لکھا ہے اور کہا ہے کہ اسی کو گوجری زبان کا نثری نمونہ سمجھا جائے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کا خط اور اس کا اُردو ترجمہ پیش خدمت ہے:۔

مکرمی پروفیسر صاحب

سلام مسنون!

تمہاری چٹھی مناں مل گئی اے۔ ہوں سفر ماتھو نیڑا نی تمنا جواب دے نہ سکیو۔ تم نے گوجری شاعری کو نمونو منگیو اے۔ اس واسطے ہوں اپنوں کلام گھل رہیو ہوں۔ نثر کو نمونو اس چٹھی کے ذریعے تمنا مل جائے گو۔

شکریو کہ تم نے میرا نال واقفی کی تے خط لکھیو۔

اللہ تمناں خوش رکھے۔

تھارو وِھرا

صابر آفاقی (۳۵)

اُردو ترجمہ: تمہاری چٹھی مجھے مل گئی ہے۔ میں سفر میں ہوں نزدیک نہیں کہ تمہیں جواب دے سکوں۔ تم نے گوجری شاعری کا نمونہ مانگا ہے اس واسطے میں اپنا کلام بھیج رہا ہوں۔ نثر کا نمونہ اس چٹھی کے ذریعے تمہیں مل جائے گا۔

شکریہ تم نے میرے ساتھ دوستی کے لیے خط لکھا۔

تمہارا بھائی

صابر آفاقی

اس خط کو ہم دو حوالوں سے زیر بحث لائیں گے۔ پہلے افعال کے اشتراک کے حوالے سے پھر جملوں کی ساخت کے اعتبار سے۔ ہم دونوں زبانوں کے مشترک ہونے کے بارے میں ثبوت فراہم کریں گے۔ افعال کا نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

گوجری	اُردو
مل گئی اے	مل گئی ہے
دے سکیو	دے سکوں
منگیو اے	مانگا ہے
گھل رہیا ہوں	بھیج رہا ہوں
مل جائے کو	مل جائے گا
لکھیو	لکھا
رکھے	رکھے

ڈاکٹر صابر آفاقی کے خط میں ایک فعل ''گھل'' بمعنی بھیجنا ایسا ہے جو اُردو میں آج کل مستعمل نہیں ہے۔ اگر چہ گھلنا بمعنی بھیجنا سندھی، سرائیکی، پنجابی اور دیگر زبانوں میں بڑا معروف ہے اور کثیر الاستعمال ہے۔ شاید یہ اہل دِلّی یا اہل لکھنؤ کی اصلاح زبان کی نذر ہو گیا ورنہ خط میں آنے والے افعال اُردو میں بھی موجود اور مستعمل ہیں۔ دوسری بات کی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ جملے کی ساخت کے اِعتبار سے گوجری اور اُردو میں ایسی یکسانیت ہے کہ گوجری زبان اُردو ہی کی شکل معلوم ہوتی ہے۔ ☆

اسی طرح ہم سرائیکی، سندھی اور پنجابی زبان کے معروف شعراء کا کچھ کلام اور ان کے کلام میں مستعمل افعال کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ حضرت مادھولال حسین (۱۵۹۳ء......۱۸۳۹ء) کے کلام کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔ واضح رہے کہ مادھولال حسین کی ساری زندگی لاہور میں گزری۔

کڈھ کلیجہ کیتم بیرے سو بھی لائق ناہی تیرے
ہور توفیق ناہی کجھ میرے پیو کٹورا پانی دا
تن من اپنا پرزے کیتا تینوں مہر نہ آئی میتا
کہے حسین فقر نمانا تیں باجھوں کوئی ہور نہ جاناں

(۳۶)

مادھولال حسین کے مذکورہ بند میں جو افعال آئے ہیں وہ یہ ہیں۔ کڈھ، کیتم، پیو، کیتا، کہے،

جاناں۔ یہ تمام افعال سرائیکی، سندھی، پنجابی، ہندکو اور گجری زبانوں میں بھی ملتے ہیں۔ اُردو میں بھی یہ افعال مستعمل ہیں۔ وسطی پنجاب کے معروف صوفی شاعر حضرت سلطان باہوؒ (متوفی ۱۴۹۱ء) کا تعلق ضلع جھنگ سے تھا۔ ان کا نمونۂ کلام بھی ملاحظہ کیجیے۔

دِل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانڑے
وچ ہن بیڑے وچ ہن جھیڑے وچ ملاح مہانڑے
چوداں طبق دل دے اندر جتھے عشق تنبو ونج تانڑے
فاضل سٹ فضلیت بیٹھے جداں دل لگا ٹکانڑے

(۳۷)

سلطان باہو کے مذکورہ بند میں صرف ایک فعل ''سٹ'' ایسا ہے جو اب اُردو میں مستعمل نہیں ہے۔ باقی تمام افعال اُردو اور دیگر زبانوں میں موجود ہیں۔ اِسی طرح شاہ لطیف کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

پانی متھے جھوپڑا مورکھ انج مرن
دم نہ سنجانن دا نہوں کرن مٹھیں جیاں

(۳۸)

اس شعر میں آنے والے تینوں فعل تمام علاقائی زبانوں میں موجود ہیں۔

ان معروف شعراء کے کلام میں افعال کی یکسانیت ہمیں یہ رستہ سمجھا رہی ہے کہ یہ بولیاں دراصل ایک ہی زبان کے مختلف روپ ہیں، جنہیں خوامخواہ ایک دوسرے کا غیر بنانے کی سعی ہو رہی ہے۔ ☆

اگر درج بالا مباحث واضح ہو گئے ہوں تو اس میں ایک دلیل مزید توجہ طلب ہے کہ کسی شخص یا شے کے نام نسبتوں کے حوالے سے دوچار ہی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اُردو کا معاملہ اِس سے بالکل جدا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں:۔

''شیکسپیئر کے بقول نام میں کیا رکھا ہے لیکن اُردو کے معاملے میں یہ درست نہیں۔ کیونکہ مختلف ادوار میں اُردو کے نام بدلتے رہے ہی نہیں بلکہ ہر عہد کا نام بعض لسانی اور تہذیبی خصوصیات کا مظہر بھی رہا۔ یوں یہ نام بعض اوقات اس مخصوص عہد کے لیے ایک بلیغ استعارہ بھی بن جاتے ہیں''۔ (۳۹)

اس طرح دیکھیں تو اُردو میں اُردو، اُردوئے معلّٰی، ہندوی، ہندی، ریختہ، زبان اُردو، زبان

شاہ جہان آباد، دہلوی، دکنی، دکھنی، ہندوستانی، لنگوا ہندوستانی، مورز، گجری، گجراتی، گوجری، پاکستانی اور گجروی وغیرہ نام ملتے ہیں۔(۴۰)

اگر اُردو کے اس قدر نام ہوسکتے ہیں اور رہے ہیں تو سندھی اُردو، سرائیکی اُردو، پنجابی اُردو، راجستھانی اُردو، کشمیری اُردواور ہندکواُردو کیوں نہیں ہوسکتے ؟ جبکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں بولے جانے کی وجہ سے اسے پنجابی کی بیٹی اور نصیر الدین ہاشمی نے اسی زبان کو دکن میں بولے جانے کی وجہ سے دکنی کہہ دیا ہے۔ درج بالا مباحث سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اُردو سندھ، پنجاب، دکن یا دہلی اور لکھنؤ کے جن جن علاقوں میں سفر کرتے ہوئے مختلف لہجے چھوڑتی گئی اسے علاقائی نسبت سے اُردو کہا جانے لگا۔ پھر ان علاقوں میں معاشرتی اتصّال نہ ہونے کی وجہ سے یہ لہجے اسماءاور افعال کے تھوڑے تھوڑے اختلاف کے سبب مختلف زبانیں محسوس ہونے لگے ورنہ اُردو ایک ہی زبان ہے جو ان سب علاقوں میں لہجوں کے معمولی سے فرق کے ساتھ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔☆

جن زبانوں/ بولیوں کا ذکر ہم نے اس مقالے کے حوالے سے کیا ہے ان میں ایک اور قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں اعداد کی گنتی تقریباً یکساں نظر آتی ہے۔ چارٹ ملاحظہ فرمائیے۔

اُردو	پنجابی	سرائیکی	سندھی	ہریانوی
ایک/اک	اِک	ہک	ہک	اِک/ایک
دو	دو	ڈو	ڈو	دو
تین	ترِن	ترَے	ٹرَے	ترِن/تین
چار	چار	چار	چار	چار
پانچ	پنج	پنج	پنج	پنج/ پانچ
چھ	چھ	چھی	چھی	چھ
سات	ست	ست	ست	سات/ست
آٹھ	اَٹھ	اٹھ	اَٹھ	اَٹھ/اٹھ
نو	نوں	نوں	نوں	نوں
دس	دس/ دہ	ڈہ	ڈہ	دس

اسی طرح ہندکو کی ایک اور پٹی ملاحظہ فرمائیے:۔

اُردو	پنجابی	سرائیکی	سندھی	ہریانوی

اکہتر	اکہتر	اکہتر	اکہتر	اکہتر
بہتر	بہتر	بہتر بہتر	بہتر	بہتر
تہتر	تہتر	تہتر	تہتر	تہتر
چوہتر	چوہتر	چوہتر	چوہتر	چوہتر
پچھتر	پنجھتر	پنجھتر	پنجھتر	پچھتر
چھہتر	چھہتر	چھہتر	چھہتر	چھہتر
ستتر	ستتر	ستتر	ستتر	ستتر
اٹھہتر	اٹھہتر	اٹھہتر	اٹھہتر	اٹھہتر
اناسی	اناسی	اناسی	اناسی	اناسی
اسی	اسی	اسی	اسی	اسی

صرف یہی نہیں بلکہ اگر ہم مختلف موسموں، انسانوں، جانوروں، پھلوں، سبزیوں، رنگوں اور احساسات وغیرہ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو پتا چلے گا کہ اکثر مقامات پر اِن میں یکسانیت موجود ہے۔ مثلاً لفظ خوش اور خوشی کو دیکھیے تو زیادہ سے زیادہ بولنے والے اس سے ''کھس'' اور ''کھسی'' بول سکتے ہیں۔ بصورت دیگر ڈیرہ غازی خان سے کلکتہ تک یہی لفظ بولا، سمجھا اور لکھا جاتا ہے اور جہاں لفظ تبدیل ہو رہا ہے وہاں کوئی لہجے کی کوئی نہ کوئی مجبوری حائل ہے یعنی ہریانہ کے لوگ خ اور ش بول ہی نہیں سکتے۔

اس کے علاوہ بہت سے لفظ اس طرح بھی بن گئے اور بولیاں معرض وجود میں آ گئیں جس میں برصغیر کی خصوصی معاشرت کا خاص دخل موجود تھا۔ مثلاً کچھ علاقوں کے لوگوں نے لفظ ''لیے'' میں نون غنہ کا اضافہ کر کے ''لئیں'' بولنا شروع کر دیا۔ بہت سے لوگوں نے طرح کو طرحاں کہنا شروع کر دیا۔ بہت سے لوگ کلثوم کو قلثوم یا چاقو کو قاچو کہنے لگے تو اس سے نئی زبان یا الگ سے زبان وجود میں نہیں آئے گی جب کہ برصغیر میں پہلے جاگیردار معاشرے اور پھر انگریزوں نے جان بوجھ کر لوگوں کو علم سے دور رکھا۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ اُردو سارے برصغیر کی اکلوتی زبان ہے جو ہر جگہ اپنی علاقائی تبدیلیوں کے ساتھ ملتی، پھولتی اور بڑھتی رہی۔ یہ الگ بات کہ اس نے اپنے ارتقا کے آخری مدارج دہلی اور لکھنؤ میں طے کیے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اہل لکھنؤ اور اہل دہلی نے اصلاح زبان کے نام پر ہزاروں الفاظ کو اُردو کے دائرے سے باہر نکال کر روزمرہ ومحاورے کے نام پر اُردو کے دامن کو وسیع کرنے کی بجائے سمٹنے پر مجبور کر دیا۔ اُن میں اکثر الفاظ ہماری دیہی معاشرت سے تعلق رکھتے تھے۔

اگر ہم اس ساری بحث کو سمیٹنا چاہیں تو یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر کی بیشتر زبانیں سندھی، سرائیکی، راجستھانی، پنجابی، ہریانوی، ہندکو، پوٹھوہاری، کشمیری، گوجری، دکنی، ہندوستانی، ہندی، ہندوی، دہلوی اور ریختہ وغیرہ سب کی سب اُردو ہی کی مختلف شکلیں ہیں اور مختلف زمانوں اور علاقوں میں اُردو کے مختلف مدارج سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اس کے لیے آخری دلیل یہ ہے کہ سرائیکی بولنے والا عام سوجھ بوجھ کا آدمی پنجابی اور اپنے گھر میں پنجابی بولنے والا عام سوجھ بوجھ کا حامل شخص آسانی سے سرائیکی سمجھ لیتا ہے۔ اور یہی حال باقی دوسری زبانوں کا ہے۔ اس کے لیے عملی مثالیں روزانہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ یعنی آپ اپنے ٹی۔وی میں گوجری، کشمیری، پنجابی، سرائیکی اور ہندکو کو زبانوں/ بولیوں کے پروگرام دیکھ لیجیے جنہیں بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے یا پھر کوئی آدمی ذرا زحمت کرے نواب شاہ سے بہاول پور، ملتان، ڈیرہ غازی خان، مری، کشمیر، گورداس پور، انبالہ، راجستھان، حیدرآباد دکن اور بہار تک کے علاقوں کا چکر لگالے تو اُسے پتا چلے گا کہ چند فی صد افعال ومصادر کے علاوہ تقریباً سارے برصغیر میں ایک ہی زبان بولی جارہی ہے۔ اِسی بات کو ایک اور طریقے سے پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم ملک صدر شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج نے اپنی کتاب ''پاک چینی مکالمہ'' میں اِس طرح پیش کیا ہے۔

''اُردو کسی علاقے کی مادری زبان نہیں مگر ہر صوبے کی
زبان کے اتنے قریب ہے کہ ہر صوبے والا اِسے اپنی
زبان سمجھتا ہے۔'' (۴۱)

اِسی طرح شہید ملت جناب لیاقت علی خاں نے اپریل ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ کی صوبائی ایجوکیشنل کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

''اُردو اور ہندوستانی کا مسئلہ بہت صاف ہے۔ اس پر
بحث اور استدلال بہت ہو چکا ہے۔ ہم خوب سمجھتے ہیں
کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ
کانگریس کی نیت کیا ہے۔ لفظی بھول بھلیوں سے اب
ہمیں باہر نکل آنا چاہیے۔ نہ ہم دھوکا دینا چاہتے ہیں
اور نہ دھوکا کھانا چاہتے ہیں۔ صاف اور سیدھی بات یہ
ہے کہ اُردو بولیں گے اور اُردو لکھیں گے۔ اپنے بچوں
کو اُردو میں تعلیم دیں گے اور اپنی زبان کو سوائے اُردو
کے اور کچھ نہیں کہیں گے۔ ہم نے اس ہندوستانی کی

خاطر اور ہندوؤں کی خاطر عربی چھوڑی، ترکی چھوڑی
اور وہ زبان اختیار کی جو اس ملک میں بنی ہے اور
سوائے اس ملک کے کہیں اور بولی اور لکھی نہیں جاتی۔
اب ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم والمیک کی زبان بولیں۔
ہم نہ بولیں گے۔ ہم ہندو مسلم اتحاد کی خاطر بہت
آگے بڑھ چکے، اب نہ بڑھیں گے جسے ہم سے ملنا ہو
یہاں آکر ملے۔ ہم اپنی آخری حد پر کھڑے
ہیں۔'' (۴۲)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر برصغیر میں بولی جانے والی زبانیں/ بولیاں اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہی ہیں تو پھر یہ ایک دوسرے سے مختلف کیوں نظر آتی ہیں؟ اس سوال کے کئی اسباب موجود ہیں مثلاً ہر علاقے کی جغرافیائی حالت کی وجہ سے جہاں انسانوں میں تبدیلیاں آتی ہیں وہیں زبانوں/ بولیوں میں بھی تغیر آجاتا ہے مثلاً ساحلی، میدانی، صحرائی اور پہاڑی انسان بھی انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں اور زبانیں/ بولیاں بھی۔

ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی رہی ہے کہ اُردو کے نام نہاد مراکز میں اصلاح زبان کے نام پر کئی مرتبہ قواعد میں بگاڑ پیدا کیا گیا۔ جو علاقے ان مراکز سے جتنے دور تھے اِسی قدر اصلاح کے نام پر بگاڑ سے محفوظ رہے۔ مثلاً کشمیری، ہندکو، سرائیکی، سندھی، راجستھانی اور پنجابی وغیرہ میں ہر جگہ مرغی کا مذکر مرغا ہی ہے۔ ورنہ اہل اُردو نے غلط العام اور پھر غلط العوام جیسی اصطلاحیں گھڑ کر اُردو کا حلیہ بگاڑ دیا جب کہ اہل زبان، اہل دہلی ولکھنؤ، خلاف محاورہ اور خلاف روزمرہ کی رٹ نے اُردو کو عامی اور عوامی زبان بننے سے روک دیا۔ ذرا غور کیجیے کہ آج سارے پاکستان میں موبائل فون کی وجہ سے ''بیل (Bell) مارنا'' کا محاورہ رائج ہو گیا ہے اور اگر اسے قبول نہ کیا جائے تو یہ اُردو کے ساتھ انصاف ہوگا یا بے انصافی تصور کی جائے گی۔

اُردو کے ساتھ خرابی کی ایک صورت ''اِملاء'' نے بھی پیدا کی ہے۔ اس حوالے سے صرف ایک مصدر کی مثال کافی ہوگی۔ ہم جانتے ہیں کہ اُردو کے مقابلے میں دوسری علاقائی بولیاں/ زبانیں حروف علّت ''ا''، ''و''، ''ی'' کو محذوف کر دیتی ہیں۔ اِس بات کو سامنے رکھتے ہوئے مصدر ''چھوڑنا'' میں حروف علّت ''واؤ'' حذف کیجیے اور باقی لفظ کو لکھنے کی کوشش کیجیے۔ قیامت یہ ہے کہ باقی لفظ میں سے ''ڑ'' کو نیچے کھینچ کر لکھا جائے تو ''چھڑنا'' بنے گا اور اگر اس شکل میں لکھا جائے جیسا کہ حرف ''ڑ'' تنہا آتا ہے تو یہی لفظ ''چھڑ نا'' بن جائے گا۔ لیکن اہل پنجاب نے اپنی سہولت کی وجہ سے پیش کو زبر میں تبدیل کرلیا ہے۔ یہاں

ایک اور دلچسپ حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرنا چاہیے مثلاً سرائیکی زبان میں دو لفظ یعنی ''کھڑاون'' اور ''کھڈاون'' کو دیکھیے۔ ان الفاظ میں پہلے لفظ کے معنی تنگ کرنے اور چھیڑنے کے ہیں جب کہ دوسرا لفظ کھیل سے مشتق ہے لیکن صرف ''ڈ'' اور ''ڑ'' کی تبدیلی سے یہ لفظ اور اِن کے معنی بدل جاتے ہیں اور آج کل مشکل یہ ہے کہ بہت سے طالب علم بلکہ اب تو اساتذہ بھی اِس طرح کے حروف کا خیال نہیں رکھتے جس کی وجہ سے اِملاء کے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور انہی مسائل نے اُردو کی بہت سی شکلیں پیدا کر دی ہیں۔

یاد رکھیے کہ ان تمام زبانوں/ بولیوں کا اُردو کے ساتھ پیدا ہونے والا اختلاف درحقیقت اعراب کی وجہ سے بھی ہے جس کی مثال اوپر والے لفظ سے بھی واضح ہوتی ہے لیکن اس کی مثال میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اُردو کا لفظ ''ظاہر'' ہے لیکن اہلِ پنجاب ''ہ'' پر ہمیشہ زبر لگا کر بولتے ہیں۔

ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بہت سے الفاظ میں سے کسی بھی وجہ سے کچھ حرف محذوف کر دیئے گئے یا کسی شخصی غلطی کی وجہ سے لفظ کی بگڑی ہوئی شکل رائج ہوگئی۔ مثلاً سانپ اور سپ، ناگ اور نانگ اور کوشش یا کوشت وغیرہ اپنی اصل کی بنیاد پر یکساں الفاظ ہیں۔ جب کہ بعض علاقوں میں کچھ حروف ادا کیے ہی نہیں جاسکتے جب تک خاص مشق باہم نہ پہنچالی جائے مثلاً ''ث''، ''ح''، ''ذ''، ''ژ''، ''ع''، ''غ''، ''ق''، ''ء'' وغیرہ جب کہ یہ مشکل اپنی جگہ موجود ہے کہ آج کی نسل ''ث''، ''س''، ''ص''، ''ت''، ''ط''، ''ذ''، ''ز''، ''ض''، ''ظ''، ''الف''، ''غ'' اور ''ء'' وغیرہ کی آوازوں کو الگ الگ ادا کرنے اور پہچاننے سے قاصر ہے۔ یہ بات تو بہت عام ہے کہ بعض اہلِ زبان لفظ ''لیے'' کو ''لینیں'' اور ''طرح'' کو ''طرحاں'' بولتے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے اور ان مسائل کو یکجا کیا جائے تو پتا چلے گا کہ یہ سب بولیاں اور زبانیں مختلف نہیں بلکہ ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔

یوں تو یہ نظریہ خالص علمی اور لسانی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے اور اس کا مقصد سیاسی ہرگز نہیں ہے مگر اس نظریے کے سامنے آنے سے جو نتائج مستخرج ہونے ہیں ان کا پاکستان کی قومی اور معاشرتی زندگی پر نہایت خوش گوار اور مثبت اثرات پڑنے کی توقع ہے۔ وہ عوامل جو کسی معاشرے کے افراد کو یکجا اور متحد رکھتے ہیں ان میں زبان کا اشتراک بہت اہمیت کا حامل ہے۔ پاکستان کے موجودہ معروضی حالات میں لسانی نظریے، علاقائی اور لسانی عصبیت سے آگے بڑھ کر تعصب کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس صحیح لسانی نظریے کی بدولت مختلف طبقات ایک دوسرے سے متصادم ہونے کی بجائے متحد و متفق ہوں گے۔ یوں قومی و علاقائی یک جہتی کو فروغ حاصل ہوگا۔

دوسرا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اُردو زبان کے محدود دائرے کو وسعت نصیب ہوگی اور علاقائی الفاظ بغیر کسی ہچکچاہٹ اور معذرت خواہانہ لب و لہجے کے استعمال ہونے لگیں گے۔ یوں اُردو کے

ذخیرۂ الفاظ میں ہزاروں لاکھوں الفاظ کا اضافہ ہوگا۔ خاص طور پر وہ الفاظ جو ایک زمانے تک اُردو میں مستعمل رہے اور جنہیں اصلاح زبان کے نام پر راندۂ درگاہ قرار دے دیا گیا۔ نتیجتاً بعض نازک اور نفیس کیفیات کے بیان کے لیے اُردو داں طبقہ خود کو بے بس سمجھنے لگا۔ وہ سسکتے ہوئے لفظ بھی پھر سے ہماری لغت کا حصہ بن جائیں گے۔

اہلِ دہلی اور لکھنؤ نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے جو محاذ آرائی شروع کی تھی اس کا لازمی نتیجہ اُردو زبان کے نقصان کی صورت میں نکلا۔ انہوں نے نہ صرف ایک دوسرے کی زبان کو غیر مستند کہا بلکہ معمولی معمولی باتوں پر ایسے طوفان کھڑے کیے کہ اُردو زبان میں بات چیت کرنے والے افراد اس مخمصے کا شکار ہوگئے کہ نجانے ہم مضافاتی لوگوں کو کیا نام دیا جائے گا؟ لہٰذا موجودہ نظریے کی پذیرائی کی صورت میں اُردو لکھنویت اور دہلویت کی قید سے بھی آزاد ہو جائے گی۔

مولانا محمد حسین آزاد سے لے کر خاطر غزنوی تک کے لسانی محققین کے نظریات کی بنیاد کیونکہ علاقائی عصبیت پر رکھی گئی ہے اس لیے عام علمی و لسانی سطح پر تو خرابی پیدا ہونا ہی تھی لیکن اس کی وجہ سے ہم حقیقت سے بھی دور جا پڑے اور انہی لسانی نظریات کے باعث علاقائی تعصّبات نے قومی یک جہتی کو شدید نقصان پہنچایا۔

موجودہ لسانی نظریے کی بدولت ایسی کتب اور لغات سے بھی نجات مل جائے گی جو زبان کو مختلف خانوں میں تقسیم کرتی نظر آتی ہے مثلاً اُردوئے قدیم اور اُردو کی قدیم لغت وغیرہ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی لفظ کبھی بوڑھا یا قدیم نہیں ہوتا مسئلہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کب، کس نے اور کہاں استعمال کیا؟

سراج الدین علی خان آرزو سے اُردو میں اصلاحی کوششیں شروع ہوئیں اور پھر کبھی اُردو میں بلا وجہ ہندی اور علاقائی الفاظ کو خارج کرنے کی مذموم کوششیں کی گئیں اور کبھی عربی و فارسی کے الفاظ کو بلا ضرورت برتنے کی سعی فرمائی گئی اور یہ نہیں دیکھا گیا کہ زبان اگر زندہ زبان ہے تو اس کے لیے اس طرح کے انجکشن قوت بخش ہونے کی بجائے آخر کار ضرر رساں ثابت ہوں گے۔ یہی سب کچھ ہوا بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان کو ایک نامیاتی وحدت سمجھنا چاہیے جس میں ضرورت کے مطابق اجزاء خود بخود شامل ہوتے جائیں گے اور غیر ضروری اجزاء خود بخود نکلتے چلے جائیں گے۔ اصلاحی کوششیں اس حوالے سے سعیٔ لاحاصل ہیں۔ چنانچہ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ موجودہ لسانی نظریے کی قبولیت عام کے باعث اُردو زبان کے قدرتی ارتقا کا عمل تیز تر ہوگا اور قومی اور ملکی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں زبان اپنا قدرتی کردار ادا کرے گی۔

نوٹ:۔ (یہ مضمون لکھا جا چکا تو ہم نے اُستادِ محترم پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب

،سابق پرنسپل اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے درخواست کی کہ وہ اس مضمون کو تنقیدی نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔ ساتھ ہی ہم نے ۲۷/ نومبر ۲۰۰۵ء کو اُردو مجلس بہاول پور کے زیرِ اہتمام ایک علمی جلسے کا اہتمام کیا جس میں اہلِ شہر کی کثیر تعداد نے شرکت فرمائی جب کہ اِس اجلاس میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب بطورِ صدرِ مجلس اور پروفیسر ڈاکٹر اسد اریب صاحب بطورِ مہمان اعزاز شریک ہوئے۔ مضمون پڑھا گیا تو ڈاکٹر اسد اریب صاحب نے فرمایا کہ اُردو زبان کے لیے ایک معیار کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے اور رہنا چاہیے اور اگر لکھنؤ اور دہلی میں اہلِ زبان نہیں رہے تو بھی اُردو لغات موجود ہیں جنھیں معیار بنایا جانا چاہیے ورنہ ایک کھچڑی پک جائے گی اور زبان، زبان نہیں رہے گی۔ بطورِ صدرِ مجلس اُستادِ محترم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب کا فرمان یہ تھا کہ اِس مضمون میں میرے خیالات کا توارد ہو گیا ہے۔ میں پوری ایمان داری سے یہ سمجھتا ہوں کہ سارے برصغیر کی ایک ہی زبان ہے اور اِس کا نام اُردو ہے۔ اِس بات کا احساس ایک شہر میں رہتے ہوئے شاید کبھی نہ ہو لیکن اگر ہم سفر شروع کر دیں تو ہمیں پتا چلے گا کہ بہاول پور سے کلکتہ تک تھوڑے سے تغیر کے ساتھ ایک ہی زبان بولی جا رہی ہے لیکن شفیق اور زوار حسین شاہ کو اِس موضوع پر ایک مضمون لکھنے کی بجائے زیادہ محنت کر کے ایک کتاب لکھنا چاہیے۔)

حوالہ جات

۱۔ اُردو مجلس بہاول پور ستمبر ۱۹۷۸ء میں پروفیسر عابد صدیق کی کوششوں سے معرضِ وجود میں آئی تھی۔ اس کے پہلے سیکرٹری پروفیسر ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر تھے جو ان دنوں اورینٹل کالج لاہور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ دوسرے سیکرٹری پروفیسر ڈاکٹر محمد انور صابر اور تیسرے پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف سلیمانی رہے ہیں۔ ان دنوں اُردو مجلس بہاول پور کے سیکرٹری پروفیسر ڈاکٹر زوار حسین شاہ ہیں۔ آخر الذکر تینوں اساتذہ کا تعلق شعبۂ اُردو گورنمنٹ ایس۔ ای کالج بہاول پور سے ہے۔ اُردو مجلس بہاول پور کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس ۷۔ دسمبر ۲۰۰۰ء کو عابد صدیق کی رحلت کے بعد بھی جاری رہے۔

۲۔ اس مقالے پر سید زوار حسین شاہ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ایوارڈ ہو چکی ہے۔

۳۔ سابق وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

۴۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اُردو شاہ عبداللطیف بھٹائی یونی ورسٹی، خیر پور میرس۔

۵۔ سابق صدر شعبۂ اُردو و کشمیریات، آزاد کشمیر یونی ورسٹی، کشمیر۔

۶۔ پروفیسر ڈاکٹر اعجاز بیگ، سابق صدر شعبۂ پنجابی، ایس۔ ای کالج بہاول پور۔

۷۔ سرورق، ماہنامہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد۔ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

۸۔ آبِ حیات، محمد حسین آزاد، سنگِ میل پبلی کیشنز، اُردو بازار لاہور، سن ندارد۔

۹۔ دکن میں اُردو، نصیر الدین ہاشمی، انشاء پریس، لاہور۔ ۱۹۴۰ء۔

(نوٹ) دکن میں اُردو کا پہلا ایڈیشن پہلے دیباچے کے مطابق ۷۔ صفر ۱۳۴۲ھ میں شائع ہوا۔ یا اس کا دیباچہ مذکورہ تاریخ کو لکھا گیا۔

۱۰۔ نقوشِ سلیمانی، سید سلیمان ندوی، اُردو اکیڈمی سندھ، دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۷ء۔

(نوٹ) دیباچے کے مطابق ''نقوشِ سلیمانی'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔

۱۱۔ پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، کتاب نما لاہور طبع چہارم ۱۹۷۲ء۔

(نوٹ) پنجاب میں اُردو کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔

۱۲۔ اُردو زبان کا ماخذ...... ہندکو، خاطر غزنوی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، طبع اوّل ۲۰۰۳ء۔

۱۳۔ حرفِ آغاز پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، کتاب نما لاہور، طبع چہارم ۱۹۷۲ء، صفحہ نمبر ۷۔

۱۴۔ آبِ حیات، مولانا محمد حسین آزاد، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، سن ندارد۔ صفحہ نمبر ۱۰۔

۱۵۔ پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، کتاب نما لاہور، طبع چہارم، ۱۹۷۲ء، صفحہ نمبر ۱۲۲۔

۱۶۔ اُردو اور ملتانی زبان کے لسانی روابط، ڈاکٹر مہر عبدالحق، اُردو اکادمی، بہاول پور، بار اوّل ۱۹۶۷ء۔

۱۷۔ جیسا کہ فتح محمد ملک نے لکھا ہے۔

۱۸۔ نئی کتابیں، تبصرہ: پروفیسر فتح محمد ملک، اُردو زبان کا ماخذ...... ہندکو، ماہنامہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۳ء، صفحہ نمبر ۲۹۔

۱۹۔ جموں میں اُردو زبان و ادب، پروفیسر ظہور الدین، ماہنامہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد، فروری ۲۰۰۴ء، صفحہ نمبر ۱۹۔

۲۰۔ جموں میں اُردو زبان و ادب، پروفیسر ظہور الدین، ماہنامہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد، فروری ۲۰۰۴ء، صفحہ نمبر ۱۹۔

۲۱۔ ایک جائزہ، ڈاکٹر وزیر آغا، مشمولہ اُردو زبان کی قدیم تاریخ، عین الحق فرید کوٹی، اورینٹ ریسرچ سنٹر، طارق کالونی لاہور، طبع اوّل جون ۱۹۷۲ء، صفحہ نمبر ۱۹-۲۰۔

۲۲۔ ماہنامہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد، ڈاکٹر خالد حسن قادری، ستمبر ۲۰۰۳ء۔

۲۳۔ اُردو کا مولد اور ماخذ، فتح محمد ملک، ماہنامہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۳ء، صفحہ نمبر ۹۔

۲۴۔ ڈاکٹر خالد حسن قادری کا نظریہ، محمد پرویش شاہین، ماہنامہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد، فروری ۲۰۰۴ء، صفحہ نمبر ۱۳۔

۲۵۔ نیرنگِ خیال، مولانا محمد حسین آزاد، مضمون ''آغا آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا''۔
کشمیر کتاب گھر، اُردو بازار لاہور، دسمبر ۱۹۸۳ء، صفحہ نمبر ۲۲۔۲۳۔

۲۶۔ نیرنگِ خیال کے مذکورہ اقتباس کا سندھی ترجمہ۔ از: ڈاکٹر محمد یوسف خشک، صدر شعبۂ اُردو، شاہ عبداللطیف بھٹائی یونی ورسٹی، خیر پور میرس۔

۲۷۔ نیرنگِ خیال کے مذکورہ اقتباس کا سرائیکی ترجمہ۔ از: ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز، اُستاد شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ۔

۲۸۔ نیرنگِ خیال کے مذکورہ اقتباس کا پنجابی ترجمہ۔ از: پروفیسر ڈاکٹر اعجاز احمد بیگ، سابق صدر شعبۂ پنجابی، گورنمنٹ ایس۔ ای کالج بہاول پور۔

۲۹۔ نیرنگ خیال کے مذکورہ اقتباس کا ہریانوی ترجمہ۔ از: عبدالحکیم رانا پٹیالوی۔

۳۰۔ اُردو بول چال میں مستعمل عام جملے۔ از: پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد۔

۳۱۔ مذکورہ اُردو جملوں کا سندھی ترجمہ۔ از: ڈاکٹر جی۔ اے الانہ، سابق وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

۳۲۔ مذکورہ اُردو جملوں کا سرائیکی ترجمہ۔ از: خورشید ناظر۔ شاعر و ادیب، بہاول پور۔

۳۳۔ مذکورہ اُردو جملوں کا پنجابی ترجمہ۔ از: ڈاکٹر اعجاز احمد بیگ، بہاول پور۔

۳۴۔ مذکورہ اُردو جملوں کا ہریانوی ترجمہ۔ از: عبدالحکیم رانا پٹیالوی۔

۳۵۔ مکتوب بنام سید زوار حسین شاہ۔ از: ڈاکٹر صابر آفاقی، سابق صدر شعبۂ اُردو، آزاد کشمیر یونی ورسٹی، مظفر آباد۔

۳۶۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند، مضمون۔ پنجابی کی خصوصیات،
جلد تیرہویں، از: ڈاکٹر فقیر محمد فقیر بہ اشتراک ادارہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور، طبع اوّل ۱۹۷۱ء، صفحہ نمبر ۲۳۵۔

۳۷۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند، مضمون۔ تصوف اور صوفی شعراء، از: ڈاکٹر عبدالغنی۔

جلد تیرہویں، از: ڈاکٹر عبدالغنی، بہ اشتراک ادارہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور، طبع اوّل ۱۹۷۱ء، صفحہ نمبر ۲۹۶۔ جیسا کہ متن میں ہے۔

۳۸۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا یہ شعر اور کچھ دوسرے سندھی شعراء کے اشعار، جاوید چانڈیو، صدرِ شعبۂ سرائیکی، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور نے بھجوائے جو مضمون کے ضمیمہ الف میں شامل ہے۔

۳۹۔ اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ از: ڈاکٹر سلیم اختر، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، طبع چہارم۔ ستمبر ۱۹۷۸ء، صفحہ نمبر ۱۲۹ تا ۱۳۰۔

۴۰۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۲۹ تا ۱۳۰۔

۴۱۔ پاک چین مکالمہ، از: پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم ملک، بک ہوم مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۴ء، صفحہ نمبر ۴۲۔

نوٹ: (واضح رہے کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم ملک ایم۔اے اُردو، ایم۔اے لسانیات اور ایم۔اے فارسی ہیں۔ اپنے تینوں امتحانوں میں طلائی تمغوں کے حامل ہیں اور اگر وہ یہ بات فرما رہے ہیں تو اپنے تجربے اور علم کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں)

۴۲۔ سرِ ورق، ماہنامہ ''اخبارِ اُردو'' اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۵ء۔

زبان صوتی علامات کا ایک ایسا مواصلاتی نظام ہے جس کی مدد سے انسانی سماج کے افراد آپس میں مل جل کر کام کرتے ہیں۔ اس کی ایجاد انسانی فطرت کا تقاضا اور انسانیت کا شرف ہے۔ اس کا مقصدِ بیان کائنات، اس کی بنیاد انسانی گویائی اور اس کی وسعت انسانی سوچ کی پرواز ہے۔

زبان تاریخی ادوار میں نہیں، مکانی علاقوں میں منقسم ہے۔ اس کی زمانیت ایک وہم اور مکانیت ایک ایقان ہے۔ اس کی ولادت ایک واقعہ اور وفات ایک افسانہ ہے۔ اس کی تفسیر ایک التباس اور بوقلمونی ایک حقیقت ہے۔۔۔۔۔۔ اردو زبان کے متعلق اب تک جو تحقیق ہوئی ہے اس میں بے شمار الجھنیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ آج تک اس کی جنم بھومی کا سراغ نہیں لگ سکا ہے۔ چونکہ ادب شہروں میں پلتا ہے اور بولی دیہات میں پھیلتی ہے لہٰذا اردو کا دیس بھی دیہات میں تلاش کرنا چاہئے۔

(**ڈاکٹر سھیل بخاری** کے مضمون **اردو زبان کا آغاز و ارتقاء** سے اقتباس
مطبوعہ ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور سالنامہ ۱۹۸۸ء)

احمد ہمیش (کراچی)

کس توقع پر کیا اُٹھا رکھیئے
دل سلامت نہیں تو کیا رکھیئے

لکھیئے کچھ اور داستانِ دل
اور زمانہ کو مبتلا رکھیئے

روح کا غم تو استعارہ ہے
روح کے غم سے واسطہ رکھیئے

دشتِ عنقا میں کچھ نہیں ملتا
کیوں یہاں حرفِ مدّعا رکھیئے

سر میں سودا رہے محبت کا
پاؤں کی خاک میں انا رکھیئے

بند ہو جائیں نہ کہیں آنکھیں
خانۂ درد کو کھلا رکھیئے

بوند بھر آب کیا مقدر ہے!
ابر رکھیئے تو کچھ ہوا رکھیئے

قبل انصاف چل بسا ملزم
اب عدالت میں کیا سزا رکھیئے

اس سے پہلے کوئی جلانے آئے
اپنے ہاتھوں ہی گھر جلا رکھیئے

حسرتیں ہو چکیں تمام ہمیش
اب تو دنیا سے فاصلہ رکھیئے

تاجدار عادل (کراچی)

حادثہ روز نیا واقعہ تھا روز وہی
زخم ہر لمحہ نئے، درد ملا روز وہی

وہی اک وصل کی خواہش کیلئے ہجر کی شام
وحشتِ جاں کے لئے حرفِ دعا روز وہی

ہر نئے روز نئی طرح سے زندہ رہنا
وحشتیں روز وہی، درد و دوا روز وہی

وہی ہر شام سمندر کے کنارے تنہا
اور سناّٹے میں پانی کی صدا روز وہی

روز جلنے کے لئے بجھتا رہا ایک دیا
اور اک سمت سے آتی تھی ہوا روز وہی

آنکھ سے خواب تلک ہے وہی غم کا رستہ
کوششیں روز وہی قافلہ تھا روز وہی

دشت ہے آگ کا اور ہے وہی رستہ عادلؔ
باغ میں یاد کے ہے پھول نیا روز وہی

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

توقعات زیادہ نہیں رکھا کرتے
دکھوں کے واسطے رستا نہیں رکھا کرتے

خود اپنے ذہن میں سب رونقیں لگا رکھیں
کہ اپنے آپ کو تنہا نہیں رکھا کرتے

سوائے اس کے کوئی دوسرا نہیں ہے یہاں
کبھی گماں بھی کسی کا نہیں رکھا کرتے

جو تم پہ بند ہوں دروازے بادہ خانے کے
خیالِ ساغر و مینا نہیں رکھا کرتے

پڑے جو رَن کسی بُزدل کو ساتھ مت لینا
کہ راہِ سیل میں تنکا نہیں رکھا کرتے

جو زندگی کا تقدس بحال رکھنا ہو
تو سب کے سامنے دکھڑا نہیں رکھا کرتے

چھپائے رکھا ہے اکبرؔ نے اس کے ہجر کا دکھ
کچھ اس طرح سے کہ گویا نہیں رکھا کرتے

اکبر حمیدی

کسی وہم و گماں میں مت رہنا
بے مکاں کے مکاں میں مت رہنا

دیکھنا اوروں میں اتر کر بھی
اپنے ہی جسم و جاں میں مت رہنا

بھیڑ میں رہ کے کچلا جائے گا
دیکھ یوں درمیاں میں مت رہنا

وہی اچھے ہیں جو زمیں پر ہیں
تم کسی آسماں میں مت رہنا

اب یہ سکّہ نہیں ہے چلنے کا
نسبتِ این و آں میں مت رہنا

بات کر اس کے پیکرِ گُل کی
اپنے رنگ بیاں میں مت رہنا

نئی دنیا بلاتی ہے اکبرؔ
گئے گزرے جہاں میں مت رہنا

مصطفیٰ شہاب (لندن)

دل اک دنیا بسا لیتا ہے گر کوئی نہیں آتا
فقط محسوس کرتا ہے، نظر کوئی نہیں آتا

خبر اچھی،بُری،تازہ، پرانی ہو نہ ہو پھر بھی
ہماری محفلوں میں بے خبر کوئی نہیں آتا

جو پیچھے چھوڑ آئے ہیں،اسی کو لوٹ جائیں گے
کھلے گا جب کہ ان رستوں پہ گھر کوئی نہیں آتا

کبھی شاطر سے شاید اس لیے بھی جیت سکتا ہوں
کہ مجھ کو چال چلنے کا ہنر کوئی نہیں آتا

برے وقتوں نے ایسا گھیر رکھا ہے کہ برسوں سے
اِدھر اچھے دنوں کا نامہ بر کوئی نہیں آتا

گزر جاؤ شہابؔ اس پُر خطر کانٹوں کے جنگل سے
کہ اس کے بعد پھر ایسا سفر کوئی نہیں آتا

ادریس بابر (ناروے)

دریا وہ کہاں رہا ہے، جو تھا
یہ شہر کا آخری قصہ گو تھا

جو خاک سی دل میں اڑ رہی ہے
یاں کوئی غزال، ہو نہ ہو، تھا

اب سے یہ ہمارا گھر نہیں ، خیر!
پہلے بھی نہ تھا، خیال تو تھا

ثابت نہیں کر سکو گے تم لوگ
کیا میرا وجود تھا؟ چلو، تھا ۔۔

دونوں گھڑیوں پر ہجر کا وقت
ہونا نہیں چاہئے تھا ، سو ، تھا

اُس خواب میں کیا نہیں تھا، در اصل۔۔
بس، کہہ تو دیا نا، خواب جو تھا

ادریس بابر

دھوم گم گشتہ خزانوں کی مچاتا پھرے کون
اُن زمانوں میں جو تھے ہی نہیں، جاتا پھرے کون

باغ میں اُن سے ملاقات کا امکان بھی ہے
صرف پھولوں کیلئے لوٹ کے آتا پھرے کون

سیکھ رکھے ہیں پرندوں نے سب اشجار کے گیت
آج کل مُوڈ ہی ایسا ہے کہ گاتا پھرے کون

میں تو کہتا ہوں یہیں غار میں رہ لو جب تک ۔۔
وقت پوچھو ہی نہیں، شہر بساتا پھرے کون

بھیس بدلے ہوئے اک شخص کی خاطر ہے یہ سب
ہم فقیروں کے بھلا ناز اُٹھاتا پھرے کون

خواب، یعنی یہ شب روز، جسے چاہئے ہوں
آ کے لے جائے، اب آواز لگاتا پھرے کون

اختلافات سروں میں ہیں گھروں سے بڑھ کر
پھر اُٹھانی جو ہے دیوار، گراتا پھرے کون

ادریس بابر

مشہور تو بس ایک دیا ہے مِرے دل میں
کتنے ہی ستاروں کی جگہ ہے مِرے دل میں

تم نے تو حکایات ہی سن رکھی ہیں ورنہ
وہ شہر، وہ خیمے، وہ سَرا ہے مِرے دل میں

میں راہ سے بھٹکوں تو کھٹکتی ہے کوئی بات
جس طرح کوئی سمت نما ہے مِرے دل میں

دنیا سے گزرنے کو ابھی عمر پڑی ہے
یہ خواب تو کچھ دن کو رکا ہے مِرے دل میں

یہ گھر، در و دیوار کی حد تک، ہے سلامت
لیکن وہ جو گھر ٹوٹ گیا ہے مِرے دل میں

یہ لوگ ذرا دیر کو ٹل جائیں تو بابرؔ
میں دیکھ لوں کیا وقت ہوا ہے مِرے دل میں

نور منیری (پونہ)

دشمنوں کو پتہ نہیں ہے کیا
میرے سر پر خدا نہیں ہے کیا
خونِ انساں بہا، نہیں ہے کیا
آج بھی کربلا نہیں ہے کیا
کس لیے مطمئن نہیں ہے وہ
شہر سارا جلا نہیں ہے کیا
وہ جو قاتل تھے اب مسیحا ہیں
ظلم کی انتہا نہیں ہے کیا
دوش ہم دوسروں کو دیتے ہیں
کچھ ہماری خطا نہیں ہے کیا
لوگ پتھر تو پوجتے ہیں مگر
آدمی، دیوتا نہیں ہے کیا
بِکے نیلام آج منڈی میں
کھوٹا سکّہ ،کھرا نہیں ہے کیا
ہمنوا ہو تو پاس آجاؤ
یہ تقاضہ، بجا نہیں ہے کیا
غیر سے کیوں سوال کرتے ہو
بابِ رحمت کھلا نہیں ہے کیا
زہر آلود ہے فضا کیوں نوؔر
کوئی تازہ ہوا نہیں ہے کیا

نور منیری

بادل جو گرجتے ہیں تو برسات بھی ہو گی
اُس جانِ بہاراں سے ملاقات بھی ہو گی

اِس شہرِ نگاراں کے ہر اک موڑ پہ یارو
زلفوں کی گھنی چھاؤں ،سیَہ رات بھی ہو گی

جو مسئلہ در پیش ہے،اُس باب میں تم سے
جب ہو گی ملاقات تو وہ بات بھی ہو گی

یہ عشق کا دستور ہے ، محتاط ہی رہنا
ہو گا جو ظفریاب ،اسے مات بھی ہو گی

شمشیر برہنہ ہے ترے ہاتھ میں لیکن
بدنام مِرے خوں سے تری ذات بھی ہوگی

پرکھو گے مِرے شعر کی گہرائی اگر تم
کہہ دو گے کہ انمول یہ سوغات بھی ہو گی

اُلجھا نہ کرو نوؔر زمانے میں کسی سے
یہ بات کبھی باعثِ آفات بھی ہو گی

جان عالم (مانسہرہ)

آئی نہ آئینے کے وہ پھر روبرو کبھی
دیکھا تھا اُس نے ایسا کہاں خوبرو کبھی

اُمیدوارِ لمسِ تمنائے یار ہوں
اے پیکرِ خیال مجھے تُو بھی چھو کبھی

پھر دیکھتا کبھی نہ کسی اور کی طرف
اک بار دیکھ لیتا اگر خود کو تُو کبھی

اے ساکنانِ کوئے ملامت کوئی خبر
لیتا ہے میرا نام بھی کیا تُرش رو کبھی

بویا ہو جس کو خاکِ سرشکِ ملیح میں
پائے گا کیا وہ نخلِ تمنا نمو کبھی

دامن دریدگی سے جو فرصت ملے بہار!
چاکِ قبائے گُل کو بھی کرنا رفو کبھی

کھائے فریب ،اشک پیئے ، سیر نہ ہوئے
ہے پیاس بھی عجیب ، عجب ہے یہ بھوک بھی

کرتا نہیں ہے یاد جو بھولے سے بھی مجھے
آتا نہیں ہے یاد وہ مجھ کو کبھو کبھی

جان عالم

جنبش نگۂ یار کی تلوار میں آوے
مرنے کے لئے بیٹھا ہوں تیار میں ،آوے

گردش میں ہیں دن رات مرے ، دیکھ کے مجھ کو
کیونکر فلکِ پیر نہ رفتار میں آوے

پیمانۂ وحشت کو نہ میں ہاتھ لگاؤں
تجھ آنکھ کی مستی بھی تو مقدار میں آوے

اب آوے تو آوے جو نہ آوے تو نہ آوے
اب سانس تو لگتا نہیں بیمار میں آوے

چکرائے ہے رخسار میں آکر تری مسکان
جوں کوئی سفینہ کسی منجدھار میں آوے

بجھنا ہو جسے شعلۂ رخسار سے اُلجھے
جلنا ہو جسے سایۂ دیوار میں آوے

بازار تو بازار ہے ، بازار کا کیا ہے
بک جائے پیمبر بھی جو بازار میں آوے

عابد سیال (اسلام آباد)

رنگ و بہار و گل کے سبھی تذکرے پَرے
آیا ہے اُس کا نام تو سب دوسرے پرے

کونپل کسی وصال کی کھلنی تو ہے مگر
موسم ہرے ہیں دور تو بادل بھرے پرے

اِک غم کی روشنی سے چمکتا ہوا یہ دل
ذرہ ہے آفتاب کو لیکن کرے پرے

اُڑتی ہے ریت نیند کی بستی کے آس پاس
جانے لگا ہے خواب کا دریا پَرے پَرے

عابدؔ! ہوائے لمحۂ تازہ میں سانس لے
رفتہ کا بوجھ دل سے جھٹک دے ارے پرے

ترنم ریاض (دہلی)

میں درد جاگتی ہوں زخم زخم سوتی ہوں
نہنگ جس کو نگل جائے ایسا موتی ہوں

وہ میری فکر کے روزن پہ کیل جڑتا ہے
میں آگہی کے تجسّس کو خون روتی ہوں

مری دعا میں نہیں معجزوں کی تاثیریں
نصیب کھوجنے والی میں کون ہوتی ہوں

شجر کو دیتی ہوں پانی وہ آگ اگلتا ہے
میں فصل خار کی چننے کو پھول بوتی ہوں

فضا میں چھوڑ گیا ہے بہت سے ناگ کوئی
میں سانس لینے کی دشواریوں پہ روتی ہوں

صادق باجوہ (امریکہ)

نہیں ہے عار کوئی حالِ دل سنانے میں
سنے گا کون کہاں حوصلہ زمانے میں

ستم رسیدہ پسے ہیں ستم کی چکی میں
کرو خراب نہ وقت ان کو آزمانے میں

مقامِ فقر کہاں اکتساب کا محتاج
عطائے خاص کریمانہ ہے زمانے میں

سمومِ دہر کے جھکڑ مُصر جلانے پہ
سمیٹتے رہے تنکے ہم آشیانے میں

وفا شعار سکندر بنے مقدر کے
کسر عدو نے نہ چھوڑی کوئی مٹانے میں

حصولِ لذتِ غم ہے طریقِ اہلِ جنوں
سکوں نصیب ہے صادقؔ وفا نبھانے میں

صادق باجوہ

ہجرتوں کی گود میں پلتے رہے
تھے وفاؤں کے دیئے جلتے رہے

داغِ ہجرت سے ملی تسکینِ جاں
حسرتوں میں لوگ کچھ جلتے رہے

جن کو دعویٰ تھا رہیں گے ساتھ ساتھ
وقتِ رخصت ہاتھ ہی ملتے رہے

موجزن گم گشتہ منزل کی لگن
کارواں در کارواں چلتے رہے

اک ضیا پاشی محیطِ بزم تھی
داغ ہائے دل جہاں جلتے رہے

اقتدار و ثروت و سطوت سبھی
عمرِ رفتہ کی طرح ڈھلتے رہے

دیکھنا صادقؔ! مآلِ دوستاں
نارِ بغض و کیں میں جو جلتے رہے

حسنین اصغر تبسم (کبیروالا)

کہاں سے لاؤں ہُنر اَب اُسے منانے کا
کوئی جواز نہ تھا اُس کے رُوٹھ جانے کا

محبتوں میں سزا بھی مجھے ہی ملنا تھی
کہ جُرم میں نے کیا رابطے بڑھانے کا

وہ اَب مِلے نہ مِلے اُس کی اپنی مرضی ہے
کرے گا سامنا کیسے مگر زمانے کا

وہ میرا دشمن جاں بھی ہے اور ندیم بھی ہے
وہ جانتا ہے ہُنر ضابطے نبھانے کا

شبِ سیاہ میں خود سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے
صِلہ تو ملنا تھا آخر دیئے بجھانے کا

فیصل عظیم (امریکہ)

جسے کل رات بھر پوجا گیا تھا
وہ بت کیوں صبح کو ٹوٹا ہوا تھا

اگر سچ کی حقیقت اب کھلی ہے
تو جو اَب تک نظر آیا تھا ' کیا تھا؟

اگر یہ تلخیوں کی ابتدا ہے
تو اب تک کون سا امرت پیا تھا

کھلا ہے مجھ پہ اب دنیا کا مطلب
مگر یہ راز پہلے بھی کھلا تھا

میں جس میں ہوں 'یہ دنیا مختلف ہے
جہاں میں تھا ' وہ عالم دوسرا تھا

میں خود کو مار کر پہنچا یہاں تک
تو یاد آیا کہ میں تو مر چکا تھا

مری ''میں'' اور تری ''میں'' دونوں ہاریں
میں بندہ ہوں ' مگر تُو تو خدا تھا !

میں اب جو منہ چھپائے پھر رہا ہوں
تو کیا میں واقعی چہرہ نما تھا

غلام نبی اعوان (اسلام آباد)

عشق عہدِ بے وفا میں بے نوا ہو جاے گا
آنکھ استنبول سینہ قرطبہ ہو جائے گا

رات لمبی ہے تو باہم گفتگو کرتے رہو
بات چل نکلی تو بہتوں کا بھلا ہو جائے گا

ان بھری گلیوں میں پھرتا رہ، اسی میں خیر ہے
اپنے اندر جا چھپا تو لا پتہ ہو جائے گا

سر بُریدہ لفظ مجھ سے رات یہ کہنے لگے
ا ب نہ بولو گے ت کاغذ کربلا ہو جائے گا

وہ میری آواز کا قاتل بھی ہے مقتول بھی
اس کا ، میرا آج کل میں فیصلہ ہو جائے گا

نوید صادق (لاہور)

بگڑ گئے ہیں جو کچھ نقش، وہ دوبارہ بنا
فلک پہ پھول کھلا، خاک پر ستارہ بنا

تری کہانی میں میرا بھی ذکر آئے گا
رفیقِ تیرہ نظر! پھر سے گوشوارہ بنا

یہ عمر میں نے ترے رنج میں اکارت کی
بنانا ہو تو مجھے سکھ کا استعارہ بنا

سنائی دینے لگی جب ندا زمانے کی
یہ میرا جسم مری روح کا سہارا بنا

کوئی بھی رُت ہو، ہمیں یاد آتے رہتے ہو
اس اہتمام سے کوئی، کہاں ہمارا بنا

تباہیوں نے مری تم سے استفادہ کیا
یہ وقت میرا نہیں بن سکا، تمہارا بنا

بکھیر خاک مری ہر طرف، جہاں تک ہو
اور اس کے بعد مجھے چاک پر دوبارہ بنا

میں اپنے آپ میں لوٹوں تو یہ ثبوت ملے
وہ شاہکار، مری فہم سے بھی پیارا بنا

نویدؔ آتشِ ایقان میں نہ جل تنہا
گماں رسیدہ کسی لمحے کو سہارا بنا

عنصر نیازی (پسرور)

ایک زمانہ جس کی خواہش کرتا تھا
سوچوں تو وہ شخص بھی میرے جیسا تھا

ایک مجھے ہی تنہائی سے وحشت تھی
اک میں ہی تھا جو دنیا میں تنہا تھا

مجھ سے جسم کی دیواریں نہ ٹوٹ سکیں
ورنہ میں تو جیل سے بھاگنے والا تھا

ڈوب رہاتھا ہر اک اپنی مرضی سے
اُس کی آنکھیں تھیں یا گہرا دریا تھا

ٹوٹ گیا تھا تو پھر عنصر غم کیسا
دل میرا بھی کانچ کا ایک کھلونا تھا

عنصر نیازی

میں سوچتا ہوں کہ خود کو لہو لہو کر کے
ملا ہی کیا ہے مجھے تیری آرزو کر کے

یہ عشق ہے کہ جنوں ہے بتاؤ تم ہی مجھے
سکون ملتا ہے کیوں تیری گفتگو کر کے

میں پہلے ہی سے جو خانہ بدوش تھا تو پھر
تمہی بتاؤ ملا کیا ہے کُو بہ کُو کر کے

تمہیں خبر ہی نہیں ہے تمہارے قدموں پر
تھکا ہوا ہے کوئی آج تک وضو کر کے

کوئی نہ کوئی وجہ ہو گی اس کے در پردہ
ضو زخم کھولے ہیں اس نے مرے رفو کر کے

لبو ں پہ پیاس تو پاؤں میں ان گنت چھالے
میں زخم زخم ہوں کیوں تیری جستجو کر کے

ڈاکٹر عادل صدیقی (پسرور)

پرندے آشیاں بھولے ہوئے ہیں
مکان و لا مکاں بھولے ہوئے ہیں
بہت بے سمت ہے اونٹوں کا چلنا
انہیں اب سارباں بھولے ہوتے ہیں
انہیں اب در بدر ہونا ہے لازم
جو تیرا آستاں بھولے ہوئے ہیں
نہیں جو آشنا تیری گلی سے
وہ سمجھو ہر جہاں بھولے ہوئے ہیں
مسخر کر چکا تاروں کو کوئی
مگر ہم آسماں بھولے ہوئے ہیں
ہمیں گو یائی کا دعویٰ ہو کیونکر
الٰہی اک فکر کھا ئے جارہی ہے
کہ ہم خود کو کہاں بھولے ہوئے ہیں
بڑھی ہے سرکشی لہروں میں جب سے
سفینے بادبان بھولے ہوئے ہیں
چمن کی عارضی کوشیوں میں کھو کر
بہارِ اک راز باقی رہ گیا ہے
کہ راز اب رازداں بھولے ہوئے ہیں
ستم کی انتہا عادل یہی ہے
ستارے کہکشاں بھولے ہوئے ہیں

عمران ہاشمی (گوجرانوالہ)

یہ عیب مرے وصف چھپانے کے لئے ہیں
سب کار گزاری کو دبانے کے لئے ہیں

آنے کے لئے ہم ہیں نہ جانے کے لئے ہیں
بس راہ سے دیوار ہٹانے کے لئے ہیں

کاندھوں پہ جو تم بوجھ اُٹھاتے نہیں سر کا
دیوار سے کیا ٹیک لگانے کے لئے ہیں

اس دل کو امید ایک زمانے سے ہے ان کی
وہ حادثے جو پیش نہ آنے کے لئے ہیں

چلنا تو مسافر کا ہے ذاتی سا ارادہ
رستے تو فقط راہ دکھانے کے لئے ہیں

یہ لوگ یہ تسکین کی جنت کے مکیں لوگ
ہم جیسوں کو دوزخ سے ڈرانے کے لئے ہیں

خواہش ہے نہ مرضی ہے نہ کچھ زور نہ بس ہے
کل پُرزے ہیں بس کام چلانے کے لئے ہیں

یہ پھول سے لب اور یہ ہنستی ہوئی آنکھیں
اندر کے فسادات چھپانے کے لئے ہیں

زاہد آزاد جھنڈانگری (نیپال)

اشک آنکھوں میں سمٹ جانے کو ہے
دل کئی ٹکڑوں میں بٹ جانے کو ہے

ناؤ اپنی میں لگاتا ہوں جہاں
وہ کنارہ بھی تو کٹ جانے کو ہے

گر چکے اب گاؤں کے سب جھونپڑے
آندھیوں کا رُخ پلٹ جانے کو ہے

کاوشوں کا پا چکا ہوں اب صلہ
حوصلہ اب رہ سے ہٹ جانے کو ہے

خوف سے ہر آدمی آزاؔد اب
اپنے سائے سے لپٹ جانے کو ہے

عاکف غنی (فرانس)

آبلہ پائی ہوئی نہ زیست میں حائل کبھی
پاؤں کب میرے تھکے ،گر ہو گئے گھائل کبھی

پُرکشش ہے محفلِ دنیا بہت اپنی جگہ
پر مجھے یہ اپنی جانب کر سکی مائل کبھی؟

ہر عمل کا اجر ہے محفوظ اپنے رب کے پاس
کوئی بھی اچھا عمل جاتا نہیں زائل کبھی

چھا گئی مستی بدن میں، اور دل پر اک سرور
ذہن میں جب بج اٹھی، محبوب کی پائل کبھی

جھولیاں بھر دی گئیں رحمت سے رب کی دوستو
کب ہے خالی ہاتھ لوٹا ، کوئی بھی سائل کبھی

بات سچی ہے تو کہنے میں تکلف کیا تجھے
لوگ ہو ہی جائیں گے عاکفؔ ترے قائل کبھی

حیدر قریشی

8/اکتوبر 2005 کے قیامت خیز زلزلہ کی خبریں دیکھ
دیکھ کر 15/اکتوبر کو ارتجالاً غزل کے یہ اشعار ہوگئے۔

ٹوٹتے، گرتے ہوئے گھر نہیں دیکھے جاتے
بد دعا جیسے یہ منظر نہیں دیکھے جاتے
پھول چہروں پہ کِھنڈے ڈر نہیں دیکھے جاتے
آنکھ سے خوف کے پیکر نہیں دیکھے جاتے
ارضِ خوش رنگ کے سب کوہ و دمن لرزاں ہیں
خون روتے ہوئے پتھر نہیں دیکھے جاتے
گر گئے دستِ دعا گنبد و مینار کے ساتھ
خاک ہوتے ہوئے منبر نہیں دیکھے جاتے
زندگی رُلتی رہی کیسے قضا کے ہاتھوں
اور احوالِ ستم گر نہیں دیکھے جاتے
قہر برساتی ہے کہ چشمِ فلک روتی ہے؟
جو بھی ہے اس کے یہ تیور نہیں دیکھے جاتے
برفباری کا جہنم بھی چلا آتا ہے
منجمد ہوتے مقدر نہیں دیکھے جاتے
دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں اُتر آتے ہیں
اور۔۔یہ غم کے سمندر نہیں دیکھے جاتے
دیکھتے رہتے ہیں ہر حال میں حیدؔر پھر بھی
گرچہ ٹی وی کے مناظر نہیں دیکھے جاتے

حیدر قریشی

فصلِ غم کی جب نوخیزی ہو جاتی ہے
درد کی موجوں میں بھی تیزی ہوجاتی ہے
پانی میں بھی چاند ستارے اُگ آتے ہیں
آنکھ سے دل تک وہ زرخیزی ہو جاتی ہے
اندر کے جنگل سے آجاتی ہیں یادیں
اور فضا میں صندل بیزی ہو جاتی ہے
خوشیاں غم میں بالکل گھل مل سی جاتی ہیں
اور نشاط میں غم انگیزی ہو جاتی ہے
شیریں سے لہجے میں بھر جاتی ہے تلخی
حیلہ جوئی جب پرویزی ہو جاتی ہے
بے حد پاور جس کو بھی مل جائے،اس کی
طرز یزیدی یا چنگیزی ہو جاتی ہے
کوشش جتنی بھی بچنے کی کر لوں، پھر بھی
اردو میں کچھ کچھ انگریزی ہو جاتی ہے
غزلوں میں ویسے تو سچ کہتا ہوں لیکن
کچھ نہ کچھ تو رنگ آمیزی ہو جاتی ہے
حسن تمہارا تو ہے سچ اور خیر سراپا
ہم سے ہی بس شر انگیزی ہو جاتی ہے
ظاہر کا پردہ ہٹنے والی منزل پر
سالک سے بھی بد پرہیزی ہو جاتی ہے
رومؔی کو حیدؔر جب بھی پڑھنے لگتا ہوں
باطن کی دنیا طبریزی ہو جاتی ہے

صبا اکبرآبادی

حسن خودعشق پہ نازاں ہے یہ معلوم نہ تھا
پھول کانٹوں کا نگہباں ہے یہ معلوم نہ تھا
ہائے اک شخص جسے جانِ تمنا سمجھا
وہ مری جان کا خواہاں ہے یہ معلوم نہ تھا
کتنے سامان کئے زیست کی آسانی کے
موت جینے سے بھی آساں ہے یہ معلوم نہ تھا
وہمِ فانوس نے دھوکہ دیا پروانوں کو
شمع اک شعلہء عریاں ہے یہ معلوم نہ تھا
وسعتِ دہر میں ترسا کئے آزادی کو
ایک پھیلا ہوا زنداں ہے یہ معلوم نہ تھا
لوگ کرتے رہے آشوبِ جہاں کی تاویل
وجہ آشوب خود انساں ہے یہ معلوم نہ تھا
دوستوں کے لئے کیا کیا نہ ادا کی قیمت
دوستی کس قدر ارزاں ہے یہ معلوم نہ تھا
کسی نمرود سے جب تک نہیں ٹکرائے تھے
آگ کا نام گلستاں ہے یہ معلوم نہ تھا
اے صبا دل میں ہمیں خون کی گردش پہ تھا ناز
تاک میں گردشِ دوراں ہے یہ معلوم نہ تھا

صبا اکبرآبادی

جب خزاں کے دن رنگِ فصلِ گل بدلتے ہیں
پھول مسکراتے ہیں آشیانے جلتے ہیں
وقت جب بدلتا ہے آدمی بدلتے ہیں
زندگی کے سانچوں میں انقلاب ڈھلتے ہیں
وہ کہیں تو پہنچیں گے جو بہک کے چلتے ہیں
گمرہی سے بھی اکثر راستے نکلتے ہیں
اے امید کے سورج وہ ابھی نہ آئیں گے
پھیلتی ہے تاریکی تب چراغ جلتے ہیں
ہے کوئی ، جو آئینہ سنگ کے عوض لے لے
بیچتے نہیں ہیں ہم دل سے دل بدلتے ہیں
وہ عبور کرلیں گے قلزمِ مصائب کو؟
روز جن سفینوں کے ناخدا بدلتے ہیں
ایک دن یہی شاید اُس گلی میں لے جائے
دل جدھر چلے ہم بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں
وحشیوں کے رستے میں باغ ہو کہ جنگل ہو
پھول بھی کچلتے خار بھی کچلتے ہیں
اتنی تیز رفتاری کیوں ہے سوئے میخانہ
اے صبا ذرا ٹھہرو ہم بھی ساتھ چلتے ہیں

صبا اکبرآبادی

عشق ہی مرکزِ اربابِ نظر ہو شاید
سوچتا ہوں یہی عیب ہنر ہو شاید
بے اثر ہوگئیں الفت میں دعائیں اپنی
یہ تمہاری ہی دعاؤں کا اثر ہو شاید
حیرتِ جلوہ سے تصویر بنا جاتا ہوں
یہ تصویر ترے پیشِ نظر ہو شاید
میرے پہلو میں تھی اک چیز نہیں ملتی ہے
تیری شرمیلی نگاہوں کو خبر ہو شاید
موت کو بھی اِسی امید میں چاہا میں نے
موت کے بھیس میں وہ شعبدہ گر ہو شاید
چند تنکوں کو نشیمن کے بچا رکھا ہے
پھر کبھی معرکہء برق و شرر ہو شاید
جس طرح خاک اُڑائی ہے جنوں میں ہم نے
اِس طرح اور کوئی خاک بسر ہو شاید
جس طرح عشق مرے شوق کا آئینہ ہے
حُسن بھی میری ہی تخلیقِ نظر ہو شاید
انگلیاں باغ میں کانٹوں سے بچاتے ہو صبا
اِن کے جُھرمٹ ہی میں کوئی گلِ تر ہو شاید

صبا اکبرآبادی

آؤ کچھ باتیں کریں جی کھول کر
وقت کٹ جائے ذرا ہنس بول کر

زیست کو روشن کیا جی کھول کر
پی لیا ساغر میں سورج گھول کر

قید میں پرواز کی طاقت نہ تھی
پر شکستہ رہ گئے پَر تول کر

اے خریدارِ گُہر ہائے فضول
کچھ ہمارے آنسوؤں کا مول کر

پھینکتا ہوں دل کے ٹکڑے خاک پر
جس کا دل چاہے اُٹھالے رول کر

اب زبانِ دار کے جوہر کُھلیں
ہم تو مجرم ہوگئے لب کھول کر

ٹھوکریں کھا کر یہ آتا ہے خیال
ہم بھی چل سکتے تھے آنکھیں کھول کر

اُف صبا ارزانیء جنسِ ہنر
بیچتے ہیں اب ادب کو تول کر

ناظم خلیلی (گلبرگہ)

جس طرح اس کو غیب جہانِ خفا نہیں
ہم سے وہ زینتِ پسِ پردہ چھپا نہیں

آنکھیں ہیں کاٹ کر شب فرقت لہو لہو
اب کھینچنے کو کچھ رگِ جاں میں بچا نہیں

مالک بس ایک ہی ہے سیاہ و سفید کا
اچھا برا سمجھ لیں تو اچھا برا نہیں

ہاتھ آگئی تو ٹھیک پہ شوقِ بہشت میں
دنیا سے منھ نہ موڑیئے دنیا میں کیا نہیں

پھر لدگئی ہے پھولوں سے ہر شاخِ شاعری
اب پیکرِ بہار وہ ہم سے خفا نہیں

شاید وجود یار ہے پروردۂ خیال
ورنہ وہ ہم سے آج تلک تو ملا نہیں

ہے نظم و ضبط دہر میں کیوں اتنا انتشار
ناظم سے کچھ نہ پوچھیئے ناظم خدا نہیں

ناظم خلیلی

آسماں ہوں میں جگمگا مجھ میں
پھول بن کر تو مسکرا مجھ میں
لہر بن کر تو دل سے آنکھوں تک
اُٹھ کے یوں شورمت مچا مجھ میں
اپنے ہونٹوں پہ رنگ کر مجھ کو
اپنے گالوں سے گد گدا مجھ میں
دل میں کٹ کر پتنگ سی گرجا
دور سے ڈور مت ہلا مجھ میں
تو ہے قوسِ قُزح کی پچکاری
آشفق بن کے پھول جا مجھ میں
اپنی زلفوں کو منتشر مت کر
اتنا اندھیر مت مچا مجھ میں
تیری آواز تھی کہ دستک تھی
پھر یہ گھنگرو سا کیا بجا مجھ میں
شام ہی سے مہکنے لگتے ہیں
یاد کے پھول جا بجا مجھ میں
خانہ دل ہے اس طرح خاموش
جیسے بیٹھی ہو تو خفا مجھ میں
مجھ میں مہمان بن کے رہ کچھ دن
مالکن بن کے بیٹھ جا مجھ میں
کس کا ناظم یہ مجھ پہ سایہ ہے
کون رہتا ہے دوسرا مجھ میں

ناظم خلیلی

گردِ شب کہکشاں بنے کیسے
دُردِ معراجِ غم جمے کیسے
شورشِ یاس کیفِ آس ہو کب
یورشِ آرزو تھمے کیسے
کیسے رنگِ گل وفا نکھرے
کاروانِ جفا رکے کیسے
کسے پھر موجزن ہو بادۂ وصل
سیلِ آوارگی تھمے کیسے
باز کیسے ہو بابِ رمزِ جمال
مرکبِ جستجو سَدھے کیسے
کیسے خوشبو حنا بدست اٹھے
محفل شامہ سجے کیسے
پھر نوا کب سنوں وہ شہد نژاد
پھر گُلِ سامعہ کِھلے کیسے
منظرِ خدّو خالِ حسن سے پھر
جدوَلِ باصرہ کھنچے کیسے
پھر وہ گُلہائے قرب کیسے ہنسیں
گلشنِ لامسہ سجے کیسے
قفل گفت و شنید کیسے کُھلے
سحرِ گویائی سر چڑھے کیسے
یہ کہ پھر جاں برائے جانِ جہاں
جائے یوں کچھ نہ بچ سکے، کیسے !

ناظم خلیلی

جنہوں نے ہم پہ کچھ فقرے کسے ہیں
ہم ان کی ذات میں اکثر رہے ہیں

قصر لفظوں کا روشن ہوگیا ہے
ترے اجزائے ترکیبی سجے ہیں

ہمیں مرنا ہے جاں میں جاں کا آنا
بدن میں بانس سے اگنے لگے ہیں

کرے ہے فاحشہ مچھلی حکومت
سمندر بدرؔ بوڑھے ہوچکے ہیں

مری بانہیں تری آباد کاری
وہ سارے شہر اب اجڑے پڑے ہیں

محبت اور وفا اجناسِ عنقا
انا نانِ جویں ہے پل رہے ہیں

چلو پتھر اٹھا کر کھینچ ماریں
بہت ناظم خلیلی بھونکتے ہیں

☆☆☆

بشیر بدر کا شعر تھا
سمندر بوڑھے ہو جائیں گے اور اک فاحشہ مچھلی
تمہاری کھیتیوں اور ساحلوں پر حکمراں ہوگی

ناظم خلیلی

دامنِ صبر تار تار کریں
آؤ تم پر یہ جاں نثار کریں

کب تلک موسم خزاں جھیلیں
کب تلک مِنّتِ بہار کریں

کب تلک برگ ہائے خشک چُنیں
اور خوں اپنا صرفِ خار کریں

کب تلک کوئے غم میں مُہر بلب
تیرے جلووں کا انتظار کریں

کب تلک آسماں کے صحرا میں
تارہ تارہ تجھے شمار کریں

کب تلک دشتِ بدگمانی میں
طائرِ حسنِ ظن شکار کریں

کب تلک چُھپ کے چاہِ یوسفؑ میں
قدر دانوں کا انتظار کریں

کب تلک جنسِ لفظ تو لیں ہم
اور گھاٹے کا کاروبار کریں

ناظم خلیلی

یہ شبِ فراق کا خوف ہے کہ ترے حصول کی جستجو
سرِ شام ہی سے یہ دردِ دل مجھے لے کے پھرتا ہے کو بہ کو

میں یقیں کروں بھی تو کس طرح کہ چمن میں فصلِ بہار ہے
وہی رنگ ہے وہی روپ ہے وہی خدّ وخال ہیں ہو بہو

مجھے ہے یقین تو آئے گی کہ لگا ہے سب مرا داؤ پر
مرا نام بھی مری ساکھ بھی مری زندگی مری آبرو

تو ہی میرا صبر و قرار ہے تو ہی میرا مونس و یار ہے
مرا دن بھی تو مری شب بھی تو مری صبح تو مری شام تو

میں ہونقوں سا تکوں تجھے مرے منھ سے کچھ نہ نکل سکے
کوئی لاکھڑا کرے گر تجھے کبھی اتفاق سے روبرو

مجھے تیرے دل کا ہے سب پتہ تو ہے جانتا مرا مدّعا
تجھے مجھ سے کرنی ہے بات کچھ مجھے تجھ کرنی ہے گفتگو

جسے اپنے فن پہ گھمنڈ تھا میں وہی ہوں ناظمِ نارسا
اسی شاعری پہ ہوں سرنگوں اسی شاعری سے ہوں سرخرو

حسن عباس رضا (امریکہ)

سینے کی خانقاہ میں آنے نہیں دیا
ہم نے اُسے چراغ جلانے نہیں دیا
دُزدانِ نیم شب نے بھی حیلے بہت کیے
لیکن کسی کو خواب چُرانے نہیں دیا
اب کے شکست و ریخت کا کچھ اور ہے سبب
اب کے یہ زخم تیری جفا نے نہیں دیا
اِس بار تو سوال بھی مشکل نہ تھا،مگر
اِس بار بھی جواب قضا نے نہیں دیا
کیا شخص تھا، اُڑاتا رہا عمر بھر مجھے
لیکن ہوا سے ہاتھ ملانے نہیں دیا
ممکن ہے وجہ ترکِ تعلق اُسی میں ہو
وہ خط جو مجھ کو بادِ صبا نے نہیں دیا
اُس حیرتی نظر کی سمٹتی گرفت نے
اُٹھتا ہوا قدم بھی اُٹھانے نہیں دیا
شامِ وداع تھی،مگر اُس رنگ باز نے
پاؤں پہ ہونٹ رکھ دیئے،جانے نہیں دیا
کچھ تو حسنؔ وہ دادو ستد کے کھرے نہ تھے
کچھ ہم نے بھی یہ قرض چکانے نہیں دیا

حسن عباس رضا

آنکھوں سے خواب، دل سے تمنا تمام شُد
تم کیا گئے،کہ شوقِ نظارا تمام شُد

کل تیرے تشنگاں سے یہ کیا معجزہ ہوا
دریا پہ ہونٹ رکھے، تو دریا تمام شُد

دنیا تو ایک برف کی سِل سے سوا نہ تھی
پہنچی ذرا جو آنچ، تو دنیا تمام شُد

عشاق پر یہ اب کے عجب وقت آپڑا
مجنوں کے دل سے حسرتِ لیلیٰ تمام شُد

شہرِ دلِ تباہ میں پہنچوں، تو کچھ کھلے
کیا بچ گیا ہے راکھ میں،اور کیا تمام شُد

ہم شہرِ جاں میں آخری نغمہ سنا چکے
سمجھو کہ اب ہمارا تماشہ تمام شُد

اک یادِ یار ہی تو پسِ انداز ہے حسنؔ
ورنہ وہ کارِ عشق تو کب کا تمام شُد

حسن عباس رضا

انا کو مار کر اپنی مذمّت کررہے ہیں
یہ کیسے لوگ ہیں ہم جن کی خدمت کر رہے ہیں

مشقّت کے بغیر اُجرت ملا کرتی تھی ہم کو
سو، اب کے ہم بغیر اُجرت مشقّت کر رہے ہیں

کسے اتنی فراغت دل زدوں کا حال پوچھے
سو،ہم بیمار،خود اپنی عیادت کر رہے ہیں

محبت کرنے والوں سے محبت کر نہ پائے
اور اب اُن کے تصوّر سے محبت کر رہے ہیں

کبھی صحراؤں کی وسعت بھی ناکافی تھی ہم کو
اوراب چھوٹے سے اک کمرے میں وحشت کررہے ہیں

حسؔن اِک میں اور اِک ہمزاد ہے ساری رعایا
ہمی اِک دوسرے پر اب حکومت کر رہے ہیں

حسن عباس رضا

بدن میں قطرہ قطرہ زہر اُتارا جا رہا ہے
کہ ہم کو آج کل قسطوں میں مارا جا رہا ہے

بظاہر تو بہت ہی دور ہیں گرداب ہم سے
مگر لگتا ہے ہاتھوں سے کنارہ جا رہا ہے

جہاں کچھ روز پہلے راندۂ دہلیز تھے ہم
انہی گلیوں سے اب ہم کو پکارا جا رہا ہے

محلّے سے کرایہ دار کیا جانے لگے ہیں
کہ اُن کے ساتھ گویا دل ہمارا جا رہا ہے

قدم زینے پہ رکھا اُس نے،اور ہم نے یہ سمجھا
کہ سُوئے آسماں کوئی ستارا جا رہا ہے

ہم اہلِ درد جوئے میں لگی ایسی رقم ہیں
جسے دانستہ ہر بازی میں ہارا جا رہا ہے

حسؔن اب تو وہاں کچھ بھی نہیں جُز کرچیوں کے
تُو کس آئینہ خانے میں دوبارہ جا رہا ہے

حسن عباس رضا

خواہشِ دلدارئ دنیا نے رُسوا کر دیا
ہم بہت تنہا تھے،اِس نے اور تنہا کر دیا

ضبط ایسا تھا کہ صحرا ہو گئے گُم آنکھ میں
اور جب روئے تو سارا شہر دریا کر دیا

آئنے میں ڈھونڈتے ہیں اب تو اپنے خد و خال
ہم کبھی ایسے نہیں تھے،تُو نے جیسا کر دیا

عشق میں پہلے ہوئے تقسیم در تقسیم ہم
آخرِ کار اپنا دل بھی خود سے منہا کر دیا

سوچتے ہیں بند ہو کر اب حصارِ ذات میں
ہم کو بزم آرائی نے کتنا اکیلا کر دیا

اپنی آنکھیں بھی میں چھوڑ آیا تری دہلیز پر
مجھ کو اس دیدار کی خوہش نے اندھا کر دیا

اُس کی چاہت تو امانت تھی مِرے دل میں حسؔن
’’کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا‘‘

حسن عباس رضا

ہم تو یوں اُس کے دھیان سے نکلے
تیر جیسے کمان سے نکلے
پھر کہیں بھی انہیں اماں نہ ملی
جو خود اپنی امان سے نکلے
کاش اک دن وہ ہم سے ملنے کو
ساتویں آسمان سے نکلے
حوصلہ ہو تو جوئے شِیر ہے کیا
پورا دریا چٹان سے نکلے
جیسی دھج سے گئے تھے اُس دل میں
ویسی ہی آن بان سے نکلے
بد نصیبی بھی ساتھ ہو لی تھی
ہم جب اپنے مکان سے نکلے
داستاں گو کو بھی خبر نہ ہوئی
کیسے ہم داستان سے نکلے
اصل میں ہم تھے مرکزی کردار
اور ہمی داستان سے نکلے
جانے کب جسم کا اسیر پرند
دکھ کے اس خاکدان سے نکلے

خاور اعجاز (ملتان)

اُٹھا کے باقی سِتارے بھی لانا چاہتا ہُوں
مَیں اپنے خواب میں دوبارہ جانا چاہتا ہُوں

ترے جہاں کے مناظر بھی خُوب ہیں لیکن
اَب اپنے شوق کا منظر بنانا چاہتا ہُوں

گزار کر یہ وبالِ حیات کا عرصہ
کِسی نہال زمانے میں جانا چاہتا ہُوں

بدل رہا ہُوں یقین و گماں کے پیرائے
کہ اِس عذاب سے اَب باہر آنا چاہتا ہُوں

ہیں اُس سے اور کئی ماوراء کے رِشتے بھی
یہی نہیں کہ فقط غائبانہ چاہتا ہُوں

خاور اعجاز

بدل رہے ہیں مِرے خد و خال تیزی سے
گزر رہے ہیں کہیں ماہ و سال تیزی سے

اُبھرتا ہے کِسی آئندہ لمحے میں اور پھر
سمٹتا جاتا ہے ماضی میں حال تیزی سے

ہم اُس کے جال میں آتے گئے قدم بہ قدم
زمانہ چلتا گیا اپنی چال تیزی سے

علاجِ رنج کی مہلت نہ مِل سکی ہم کو
لہو میں پھیل گئے کچھ ملال تیزی سے

عبور کرتے ہی پچّاس کی دہائی کو
بدن میں آنے لگا ہے زوال تیزی سے

ٹھہر ٹھہر کے جِسے دیکھنے کی حسرت تھی
گزر گئی وہی ساعت کمال تیزی سے

خاور اعجاز

زمینوں ، آسمانوں کے عِلاوہ
دِکھا کچھ اِن جہانوں کے عِلاوہ

سُنا پھر سے کوئی زرّیں کہانی
مگر گزرے زمانوں کے عِلاوہ

ہمارے حافظے میں اور کیا ہے
پُرانی داستانوں کے عِلاوہ

ہم اُن تیروں کی زَد میں آ گئے ہیں
جو چلتے ہیں مچانوں کے عِلاوہ

نظر آتا نہیں بارِش کو شاید
کچھ اِن کچّے مکانوں کے عِلاوہ

ہے اِک آسیب کا سایہ یہاں پر
مکینوں اور مکانوں کے عِلاوہ

کہاں چلتا ہے کوئی زور اپنا
فقط گز بھر زبانوں کے عِلاوہ

خاور اعجاز

اُسے نِگاہ میں بھر لینا چاہتا ہُوں مَیں
یہ کام چپکے سے کر لینا چاہتا ہُوں مَیں

وُہ جانتا ہے یہ دُنیا مجھے قبول نہیں
کوئی جہانِ دِگر لینا چاہتا ہُوں مَیں

مَیں تھک نہ جاؤں بہت اِبتداء کے رستوں میں
سو اِنتہا کا سفر لینا چاہتا ہُوں مَیں

اِک اور پردہ گِرا لیتا ہے وُہ اپنے گِرد
کبھی جو اُس کی خبر لینا چاہتا ہُوں مَیں

بسائے رکھتا ہُوں جِس شہر کی فضاء خُود میں
وہیں کے شام و سحر لینا چاہتا ہُوں مَیں

سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)

ملاقات

ٹیلی فون اور دروازے کی کال بیل ایک ساتھ اور بغیر کسی وقفے کے بج اٹھیں، ساتھ ہی بادل گرجے اور بجلی کڑکی ..میں ہڑ بڑا کے اٹھ بیٹھا پہلے سرہانے رکھا ہوا ٹیلیفون اُٹھایا تو دروازے کی کال بیل بھی خاموش ہوگئی۔مگر پھر بجلی کڑکی بادل گرجے اور گھر کی لائٹ چلی گئی۔ میں سمجھ گیا کہ ناوقت آنے والا اُس کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا..... جیسے کوئی سرگوشی کرتا ہے اِسی طرح اُس کے سراسیمہ لہجے میں لپٹی ہوئی آواز سنائی دی ’’فوراً دروازہ کھولو۔‘‘

اندھیرا، گرج چمک اور اُس کے لہجے میں چھپی ہوئی گھبراہٹ، میرے لئے پریشانی کا سبب بن گئی ہے۔خدا کا شکر ہے کہ اِس وقت میری بیوی موجود نہیں تھی، وہ چند روز کے لئے اپنی چھوٹی بہن کی عیادت کے واسطے گئی ہوئی ہے ورنہ میرے دوستوں کے بارے میں اُس کی رائے پہلے ہی اچھی نہیں ہے، اگر وہ ہوتی اور تواتر کے ساتھ بجنے والی گھنٹیوں سے جاگ اٹھتی تو کمرے میں بھونچال آ گیا ہوتا.....میں بستر سے احتیاط کے ساتھ اترا، ریلنگ کا سہارا لیا اور سنبھل سنبھل کر زینہ طے کرتا ہوا نیچے پہنچا....وہ تو یہ اچھا ہوا کہ اُسی وقت چوکیدار نے جنریٹر چلا دیا۔

وہ آتے ہی صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔اُس کے چہرے پہ پھیلی ہوئی گھبراہٹ دیکھ کر میں نے سوچا، قیاس آرائی کرنے سے بہتر ہے کہ پہلے سارا ماجرا معلوم کیا جائے۔

جب اُس نے اپنے داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو دبایا تو مجھے اس کے ہاتھ پر رومال جیسا کوئی کپڑا لپیٹا ہوا دکھائی دیا۔میں نے اسکے وجود کو نظر انداز کر کے کہا، اپنی پریشانی کا سبب بتاؤ........

اب وہ اِس طرح بولا کہ مجھے اُسکی آواز میں لپٹی ہوئی گھبراہٹ اور چہرے پہ پھیلی ہوئی پریشانی ذرا محسوس نہیں ہوئی بلکہ یوں لگا جیسے سوچ سوچ کر ٹھہر ٹھہر کے وہ خود کلامی میں مصروف ہے۔

اُس نے کہا۔ہم تم کب ملے تھے....؟ کل۔۔!! نہیں۔۔۔کل تو میں کلب گیا ہی نہیں اور کل سے ایک دن پہلے بھی میں نہیں جا سکا تھا....شاید تین چار دن پہلے گیا تھا تب اکیلا بیٹھ کر چلا آیا تھا اتفاق سے کوئی جاننے والا بھی موجود نہیں تھا۔۔۔مطلب ہوا ہفتہ دس روز پہلے وہ ملا تھا۔۔۔تم اُس کو نہیں جانتے۔۔۔جانتا تو میں بھی نہیں ہوں، کلب میں کسی نے تعارف کرایا تھا اور نام بھی کچھ عجیب سا تھا۔پوکر....جوکر....کچھ اِسی قسم کا نام تھا مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔اُس جوکر نے ہاتھ ملاتے ہوئے میری طرف ایسے دیکھا تھا جیسے میری آنکھوں میں جھانک رہا ہو پھر میرا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے چاروں انگلیاں دبا کے ہاتھ پلٹا اور میری ہتھیلی دیکھی اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر پیش

گوئی کرنے کے انداز میں بولا۔آپ تو پڑھنے کے قابل ہیں، میرے لئے ایک نایاب موضوع۔۔جب اُس نے میرے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ میں اُس کی بات نہیں سمجھا ہوں تب اُس نے کہا۔ چہرے اور ہاتھ کی لکیریں پڑھنا میرا شوق تھا اور اب شوق ہی پیشہ بن گیا ہے، آپ کو اپنے شوق کی خاطر یہ بتائے دیتا ہوں کہ آپ کے چہرے کی تحریر اور ہاتھ کی لکیریں مجھے اُکسا رہی ہیں کہ بہت تفصیل کے ساتھ اِن کو پڑھوں۔فی الحال اتنا بتائے دیتا ہوں کہ جلد ہی آپ کی ملاقات آپ کے ساتھ ہوگی۔آپ کبھی اپنے آپ سے ملے ہیں۔؟ اتنا کہہ کر، اُس نے مجھے دعوت دی، اگر آپ کے پاس وقت ہے تو آیئے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔اس کی بات کے جواب میں اب میں نے اُس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔۔جیسی ABSURD بات اُس نے کہی تھی میں نے سوچا ایسی ہی بات میں بھی پوچھوں کہ مہینہ بھر پہلے یہ جو کمبخت " کیٹرینا" اور " ریٹا" سائیکلون امریکا میں آئے تھے تو اب دوسرے ملکوں میں طوفان اُٹھانے والے دیش میں اور کتنے طوفان آنے والے ہیں۔؟ یہ سوال فوراً اس لئے بھی ذہن میں آیا کہ جب امریکا میں یہ ریٹا آئی تھی میں پریشان ہوا تھا اس لئے کہ ہیوسٹن میں میرا چہیتا بیٹا رہتا ہے مجھے اس کی فکر تھی، مگر طوفان ابھی میلوں دور تھا کہ بیٹے کا ٹیلیفون آ گیا، وہ دو دن پہلے ہی وہاں سے نکل گیا تھا۔ بہت ہوشیار ہے۔مجھے بیوقوف بناتا رہتا ہے، تمہیں تو پتا ہی ہے کہ وہ مجھے کتنا عزیز ہے....اکلوتا جو ٹھہرا.... میں بھی جان بوجھ کر انجان بنا رہتا ہوں.... بہانے بہانے سے پیسے منگا لیتا ہے، مجھے یہ بھی خبر ہے وہاں اُس نے شادی کر لی ہے، اور خبر کیوں نہ ہو آخر باپ ہوں اُس کا۔وہ کام دھام کچھ کرتا نہیں ہے اور مجھے....مجھے کیا صرف اپنی ماں کو یہ بتا رکھا ہے کہ Space Scienc کا مضمون پڑھ رہا ہے۔یہ امریکن سربراہ بھی بڑے۔۔۔ ہیں خلاء میں نظریں گاڑے زمین کے کاروبار کو خراب کرتے چلے جا رہے ہیں....خیر چھوڑو یہ دوسری بات ہے....بیٹا اِس عمر میں جو چاہے کر لے۔ہمیں تو یہ عمر ملی ہی نہیں....جوانی کو ایک جست میں لانگ گئے.... ہاں تو میں بات کر رہا تھا اُس کی۔اب تم ہی بتاؤ کیا کسی کی ملاقات اپنے آپ سے بھی ہوتی ہے۔؟ اُس کی بات سن کر پہلے تو میں نے سوچا خوب مذاق اُڑاؤں، مگر میں اُسے ایک دم اکھاڑنا نہیں چاہتا تھا۔کلب میں کسی کے ساتھ آیا تھا۔خوش پوش، لاپروا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والا انسان، عمر کے لحاظ سے مجھے ساٹھ سے اوپر کا نہیں لگا اپنے ڈیل ڈول چہرے مہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے پابندی سے ورزش کرتا ہو۔اس کی خاص بات ایک نہیں دو۔نمبر وَن یہ اُس کے چہرے پہ، دائیں آنکھ کے نیچے سے ٹھوڑی تک زخم کا ایک گہرا نشان..جیسا عام طور پر فلموں کے بدمعاش کرداروں کے چہرے پر ہوتا ہے اُس نشان کے باوجود اس کی پرسنلٹی میں ایک کشش سی تھی۔نمبر ٹو اس کی بھاری اور جھرجھری سی آواز۔۔جیسے ہلکے ہلکے کتا غراتا ہے یا سانپ پھنکارتا ہے، ایسی آواز جس کو میں ہزاروں میں پہچان لوں۔خیر۔جب اس نے میری ہتھیلی دیکھ کر یہ انوکھی سی بات کہنے کے بعد یہ کہا۔آپ کا ہاتھ بہت کچھ بتا رہا ہے تو میں نے بحث مباحثہ کرنے والے لہجے میں کہا....جناب میرا یقین ہے کہ کسی کی بھی زندگی یا مستقبل اُس کے ہاتھ

کی لکیروں میں نہیں ہوتا.آپ کو چہرے پڑھنے کا شوق ہے۔ چہروں سے دلچسپی مجھے بھی ہے۔خاص طور سے کتابی چہرے لیکن پڑھنے کے لئے نہیں.اور میرے ہاتھ کی لکیریں اُس وقت کی گواہ ہیں جو میں نے بہت ہی محنت کر کے گزارا ہے۔ یہ بات میں نے اس لئے کہی کہ مجھ میں اُس کے لئے ذرا سی دلچسپی اور پیدا ہو پھر کہیں ساتھ بیٹھ کر باتیں کریں....تم جانتے ہی ہو مجھے چہرہ شناسی یا ہاتھ کی لکیروں اور ستاروں کی گردش وغیرہ وغیرہ پر کوئی اعتقاد نہیں ہے لیکن وہ مجھے ایک دلچسپ آدمی لگتا تھا، اپنی آنکھیں گھمانے کے لحاظ سے بھی اور.... پھر اس کی آواز۔اسی لئے میں دو چار باتیں کرنے کے بعد اُس کے علم کی سطح جانچنا چاہتا تھا۔ جانچنے کی بات غلط ہے اس لئے کہ مجھے پامسٹری وغیرہ کے بارے میں ذرہ برابر بھی معلوم نہیں ہے لیکن اِس بات سے تم بھی بخوبی واقف ہو کہ کسی بھی آدمی کو علمِ نجوم یا دست شناسی وغیرہ سے دلچسپی ہو یا نہ ہو پھر بھی وہ اپنے مستقبل، ماضی یا حال کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ضرور کرنا چاہتا ہے، دوسرے کا امتحان لینے سے زیادہ اپنی نا دیدہ خواہشوں کی تصویر دیکھنے کے لئے....شاید اسی لئے میرا بھی جی چاہا کے اِس موضوع پر اُس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں اور یہ ظاہر کر دوں کہ میں لکیروں پر کوئی اعتبار نہیں کرتا وہ ماتھے کی ہوں یا ہاتھ کی اور اقبال کا وہ شعر بھی سناؤں جو ایک مرتبہ کہیں سنا تھا۔ وہی کہ ستارہ خود آسمان کی گردش میں بھٹک رہا ہے وہ کیا تقدیر کی خبر دے گا۔سوچا تھا ذرا مزے کی باتوں میں وقت کٹ جائے گا مگر اس نے مجھے اپنی طرف مسلسل دیکھنے کی وجہ سے ایک غیر متعلق بات کہی۔آپ میرے چہرے کے نشان کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں، یہ کسی لڑائی جھگڑے کی وجہ سے نہیں ہے، 1935 میں کوئٹہ میں جو زلزلہ آیا تھا وہ میرے سارے خاندان کو لے گیا اور مجھے یہ نشانی دے گیا، اُس وقت میں تین سال کا تھا۔ پیدائش کے حساب سے میں بلوچی ہوں، لیکن پلا بڑھا میں برما میں ہوں۔ممکن ہے اپنے بارے میں وہ کچھ اور بتاتا کہ عین وقت پر اُس کا کوئی کلائنٹ نما ملنے والا آ گیا اور اس کو لے کر دُور جا بیٹھا، اتفاق سے اُس روز کلب میں میرا کوئی ایسا واقف کار بھی نظر نہیں آیا جس کے ساتھ بیٹھ کر خوش گپیاں کی جاتیں اس لئے ذرا دیر بیٹھ کر میں چلا آیا اور پھر ان ساری باتوں کو بھول بھال گیا۔۔آج ....سویرے ہی سویرے ایک عجیب بات ہوئی ۔۔۔۔جب میں لان میں جاگنگ کر رہا تھا مجھے محسوس ہوا، کوئی گلاب کے پودوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہا ہے پہلے تو اپنا وہم جانا۔ پھر سوچا کہ شک دور کر ہی لینا چاہئے....جب میں گلاب کی جھاڑی کے قریب پہنچا تو وہاں سچ مچ کوئی تھا۔۔جس نے اپنے قریب دیکھ کر مجھ پہ حملہ کر دیا....چاقو سے حملہ۔۔میں نے اس کا وار اپنی ہتھیلی پر روکا....معلوم ہے وہ حملہ آور کون تھی....؟ ہاں....وہی تھی..وہ جو ہمیں کلب میں ملی تھی....تم تو بیوی کے ڈر سے کھل کے بات بھی نہیں کر رہے تھے مگر میں نے دیکھ لیا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں ایک دعوت ہے۔ارے وہی۔ وہ بھوری آنکھوں والی۔! تمہارے ذہن پر تو ہر وقت بیوی کا خوف طاری رہتا ہے کسی عورت کی طرف دیکھتے بھی ہو تو ایسے جیسے چوری کر رہے ہو مگر تمہاری آنکھوں میں ایک کمال بھی ہے بالکل آر پار دیکھ لیتے ہو۔ایسے کھسیانے کیوں ہو رہے ہو، یہاں تمہاری بیوی موجود نہیں ہے، اور میں

اِس وقت تمہاری تعریف نہیں اپنا حال بیان کر رہا ہوں ۔۔تو اُس روز کلب میں تمہارے جانے کے بعد بھی میں اُس عورت کے ساتھ ٹال مٹول والی باتیں کرتا رہا....پھر میں نے صاف صاف بتا دیا کہ دو چار دن ٹھہر جاؤ میری بیوی اپنے ایک عزیز کے ہاں چند روز کے لئے جانے والی ہے اس کے بعد میں تمہارے من پسند ہوٹل میں دعوت کر سکتا ہوں....مگر وہ....وہ....شاید اُس سے انتظار نہ ہو سکا....نجانے میرا پتا کیسے معلوم کیا اور کس طرح چوکیدار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اندر آئی اور چھپ چھپا کے گلاب کی جھاڑیوں کے پیچھے آن بیٹھی.... یہ کوئی ملنے کا طریقہ ہے۔؟ طریقہ کو مارو گولی....سوال یہ پیدا ہوتے ہیں کہ اگر وہ سچ مچ مجھ ہی سے ملنے آئی تھی تو چوروں کی طرح چھپ کر کیوں بیٹھی....؟ مجھ پر حملہ کیوں کیا....؟ کیا مجھے پہچانی نہیں....؟ میری باتوں کو دیوانے کی بڑ نہ سمجھو.... اُسوقت اگرچہ دن کا اجالا پورا نہیں پھیلا تھا لیکن رات کے ملگجے اندھیرے میں جو روشنی ہوتی ہے، میں اس کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا....وہی تھی کلب والی....مگر....اب تک۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھ پر حملہ کیوں۔؟ میں نے تو صاف صاف کہا تھا کہ بیوی کے جانے کے بعد ملوں گا۔۔مان لیتے ہیں کہ اُس نے کسی طرح میرا پتا حاصل کر لیا۔ چوکیدار کو غچہ دے کے اندر بھی آ گئی۔ پھر وہی سوال کہ یوں تاک لگا کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی.؟ اگر وہ مجھ سے ملتی تو میں اسکو گھر میں آنے کی دعوت دیتا اُس کو بتاتا کہ میری بیوی نے اپنے پروگرام میں تبدیلی کر لی اور رات کی فلائٹ سے چلی گئی ہے، آؤ اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔۔مگر شاید وہ تو کسی اور ہی ارادے سے آئی تھی، دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ شاید مجھے ہی کوئی اور سمجھ رہی ہو، اُس کو کلب والی ملاقات یاد نہ ہو اور سچ مچ وہ کوئی پیشہ ور چور ہو یا کسی گینگ کی ممبر ہو، اسی لئے اتنی مہارت سے اندر آئی کہ چوکیدار بھی اس کو نہیں دیکھ سکا..خیر...یہ چوکیدار وغیرہ بھی بس دکھاوا ہی ہے۔خواہ مخواہ کا۔اب اسٹیٹس سمبل ہو گیا ہے۔چوکیدار کا مطلب ہوا چور کو بتا دو کہ اِس گھر میں ایسی چیزیں ہیں جن کی حفاظت کے لئے ایک بندوق بردار رکھا ہے۔اور مزے کی بات یہ ہے وقت آنے پر بندوق چلتی ہی نہیں.... چوکیدار اپنی جان بچانے کے لئے پہلے چھپتا ہے۔بھلا چار پانچ ہزار روپے کے لئے کون اپنی جان جوکھم میں ڈالے گا۔اور اب تو ہر اعلیٰ افسر اپنے گھر پر ہی نہیں بلکہ باتھ روم بھی جائے تو دو گن مین اُس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ خیر لعنت بھیجو بندوق پر۔۔

میں یہ کہہ رہا تھا...تم نے کلب میں اُس کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔کیا گریس۔کیا بیوٹی....سچ تو یہ ہے وہ مجھے صورت سے بدقماش لگتی ہی نہیں تھی.پہلی بات یہ کہ میں نے کبھی کسی جاہل اور مفلس عورت کو کلب میں نہیں دیکھا۔ وہ Manners سے بھی واقف تھی اس کا لباس بھی مڈل کلاس سے اوپر ہی کا تھا....میں نے اُس سے باتیں کی تھیں بات چیت سے بھی وہ پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی لگتی تھی۔میری الجھن صرف یہی ہے کہ اُس نے مجھ پر حملہ کیوں کیا۔؟ مجھے دیکھ لیا تھا تو اُٹھ کر سامنے آتی مگر ڈائریکٹ حملہ....لمحہ بھر کے لئے میرے اوسان خطا ہوئے تھے اور اُسی ایک لمحے میں وہ چھلاوے کی طرح غائب بھی ہو گئی۔ میں نے چوکیدار کو آواز دی، وہ جانتا تھا کہ منہ اندھیرے

میں جاگنگ کرتا ہوں اِس لئے چاہے رات بھر سوتا رہے مگر میری جاگنگ کے وقت مستعد رہتا ہے...میری آواز پر فوراً آیا۔اوراُس نے قسم کھا کے کہا کہ کسی کو آتے دیکھا نہ جاتے.اب میں اس سے کیا بحث کرتا۔گھر میں آیا۔اپنے ہاتھ کو دیکھا۔اچھا خاصا زخم تھا۔خون سے میری مٹھی بھر گئی تھی۔ مجھے فوراً ڈاکٹر کے پاس جا کے اینٹی سپٹک انجیکشن لینا چاہیئے تھا۔مگر اس وقت اسپتال کی ایمرجینسی کے علاوہ کوئی ڈاکٹر نہیں مل سکتا تھا صرف وہاں ہی نہیں بلکہ آج اتوار ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر کہیں بھی نہیں ملیں گے ۔یہی سوچ کر میں نے فرسٹ ایڈ بکس کھولا۔خود ہی بینڈ یج کر لی ۔میری کیا کیفیت تھی کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا.میں بہت دیر تک لاؤنج میں ٹہلتا رہا۔جب ذرا سی تکلیف میں کمی ہوئی تو میں آ کے اپنے بیڈروم میں لیٹ گیا....آنکھ لگی ہی تھی کہ اُسی وقت میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی....
جب سنا تو پتا چلا یہ کسی واقف کار کا فون نہیں ہے....وہی تھا..وہی Face Reading کرنے والا۔میں اُس کی آواز سے پہچان گیا۔میرے ہیلو کہتے ہی اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

’’پہلے تو ناوقت فون کرنے کی معذرت ۔دراصل آپ کو ایک اہم بات بتانی تھی،وہ یہ کہ آج کی رات اپنے گھر میں نہ گذاریئے گا۔۔کسی ہوٹل میں۔۔کسی دوست کے ہاں چلے جایئے گا۔ایسے ہی Just for change آدمی کو کبھی کبھی تبدیلی بھی راس آجاتی ہے۔اور ہاں آپ کے بیڈروم میں جو Valuables ہوں،وہ بھی ساتھ رکھ لیجئے گا۔۔دیکھئے میں آپ کو خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا۔۔دراصل ابھی آپ کا وزیٹنگ کارڈ سامنے آ گیا تو آپ کا چہرہ نظروں میں گھوم گیا۔ میں نے سوچا....جی ہاں سوچا....اب یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ کا بولتا ہوا ہاتھ میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں،اُس ہاتھ کو تو میں ایک مرتبہ تفصیل سے دیکھنا چاہوں گا،تو جناب میں نے سوچا،دو ایک ایسی باتیں آپ کو بتادوں کہ آپ نقصان اور خوف دونوں سے بچ جائیں۔ پہلے تو یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ موت کو ٹالا تو جا سکتا ہے اُس سے بچا نہیں جا سکتا جبکہ حادثے سے بچا بھی جا سکتا ہے اور اسے ٹالا بھی جا سکتا ہے۔میں نے آپ سے جو کہا ہے وہ حادثے سے بچاؤ کا ایک راستہ ہے کہ بس آج کی رات جہاں آپ سوتے ہیں وہاں نہ سوئیں، دوسرے یہ کہ آج ہی آپ کی ملاقات آپ سے ہوگی اور یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں یہ سب میں نے آپ کے ہاتھ کی لکیروں میں لکھا دیکھا تھا۔ میں نے پہلی ملاقات پر بھی آپ سے یہ کہا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ بہت عرصے بعد اتنا بولتا ہوا ہاتھ دیکھا ہے اُس دن اگر میرے کلائنٹ نہ آ گئے ہوتے تو آپ کے ساتھ ایک اچھی ملاقات رہتی ۔میں اب سے پہلے فون کرتا لیکن آپ جانتے ہی ہیں دال روٹی کا چکر مہلت کم دیتا ہے۔اتفاق سے ابھی آپ کا کارڈ سامنے آیا تو آپ کا ہاتھ اور آپ کا چہرہ نظروں میں پھر گیا اور میں نے سوچا ایک دو باتیں کرنے کے ساتھ آپ کو آج کی رات ہونے والے حادثے سے بچاؤ کے لئے بھی بتادوں اور...‘‘

اب تک ساری باتیں اِس طرح خاموشی سے سنتا رہا تھا جیسے غبارے میں ہوا بھرتی رہتی ہے لیکن جب وہ سانس لینے کے لئے رکا تو میں پھٹ پڑا۔’’یو باسٹرڈ۔ پہلے تم نے ایک عورت کو بھیجا کہ وہ مجھے لُوٹ لے خواہ میری

جان لے کر سہی....اوراب....تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میں اپنے گھر کی قیمتی اشیا لے کر باہر نکل آؤں تاکہ جو کام تمہاری بھیجی ہوئی عورت نہ کرسکی تھی وہ تم.... یا تمہارا کوئی ساتھی پورا کر سکے..!‘‘

مجھے تعجب ہوا وہ میرے لہجہ کی تلخی بلکہ گالی دینے کو بھی نظرانداز کر گیا اور دھیمے لہجہ میں بولا۔

’’میں اِس وقت آپ کی کسی بات کا برا نہیں مناؤں گا۔آج دن بھر آپ الوژن(ILLUSION) کا شکار رہے ہیں۔آپ کے ہاتھ کی خاطر جو میرے لئے ایک بہت بڑا Subject ہے۔میں نہیں چاہتا کہ آپ کو جانی یا مالی کسی طرح کا بھی نقصان ہو اسی لئے میں آپ کو وہ سب صاف صاف بتا رہا ہوں جو کئی دن پہلے آدھے منٹ کے اندر آپ کے ہاتھ نے اور پھر آپ کے چہرے نے مجھے بتایا ہے۔‘‘

اب میں بغیر روکے ٹوکے اُس کی بات سنتا رہا۔جب میں نے اُس سے یہ پوچھنا چاہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جس عورت نے مجھ پر حملہ کیا ہے کیا وہ میرا الیوژن تھا یا وہ عورت چھلاوہ تھی؟ایک ایسی عورت جس سے تمہاری ہی طرح کلب میں ایک سرسری سی ملاقات ہوئی....جس کے ساتھ صرف واجبی سا تعارف ہوا تھا بلکہ جسے تعارف بھی نہیں کہا جا سکتا۔وہ عورت رات کے اندھیرے میں میرے گھر کے لان میں آکر چھپی ....پھر خواہ مخواہ مجھ پر حملہ کیا....چاقو نہایت تیز دھار والا تھا....فرض کریں میں ہاتھ سے نہ روک پاتا....تو وہ میرے سینے میں ہی اتر جاتا.. اور یہ بھی فرض کریں بیوی کے جانے کے بعد وہ مجھے کلب میں ملی ہوتی اور میں اُس کو اپنے گھر لے آتا۔؟ممکن ہے پھر تو اُس کا چاقو میرا کام ہی تمام کر دیتا.... یہ بھی ممکن ہے مجھے کوئی خواب آور دوا پلا دیتی ....اور پھر گھر کا صفایا کر کے چمپت ہو جاتی....کیا یہ سب بھی واہمہ ہے۔؟مگر یہ پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔اُس نے ایک اور اچنبھے والی بات کہہ دی۔اُس نے کہا

’’دیکھئے میں نے جو کچھ کہا ہے اُس پر عمل کیجئے آج کی رات۔صرف آج کی رات اپنے کمرے میں نہ رہئے، بلکہ کمرے میں جو بھی قیمتی چیزیں ہیں وہ لے کر کسی بڑے ہوٹل میں اور اگر ہوٹل میں نہ جانا چاہیں تو کسی دوست کے یہاں یا پھر کسی بھی کھلی جگہ میں جا کے رہیں اور اگر ایسی جگہ ذہن میں نہیں آ رہی ہے تو اپنے چوکیدار کے پاس جا کے بیٹھ جایئے۔ممکن ہے سارا گھر ڈھے جائے یا صرف آپ کے کمرے کی چھت بیٹھ جائے۔اس لئے مہربانی کر کے میری بات مذاق نہ سمجھئے۔اور بارش کی پہلی بوند کے ساتھ اپنا گھر.... یا کم از کم اپنا کمرہ چھوڑ دیجئے..‘‘

اتنا کہنے کے بعد سانپ کی پھنکار جیسی آواز والے نے فون رکھ دیا.... پہلے تو میں کچھ حیران پریشان سا رہا....جیسے میرے حواس معطل ہو گئے ہوں....رفتہ رفتہ میں اُس کی باتوں بلکہ اُس کی آواز کے حصار سے نکلا۔ جب میں نے اُس کی ایک ایک بات پر سوچنا شروع کیا تو مجھے یاد نہیں آیا کہ میں نے اُس کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا تھا یا نہیں، پھر وزٹنگ کارڈ کی اہمیت کیا ہے۔؟ اکثر ہم اپنی آمد یا بطور تعارف کارڈ استعمال کرتے ہیں ممکن ہے میں نے اس کو کارڈ دیا ہو۔۔یہ بھی ممکن ہے اس نے ٹیلیفون ڈائریکٹری سے میرا نمبر حاصل کرلیا ہو۔مگر یہ کیا بیہودہ

بات کہی کہ آج میری ملاقات مجھ ہی سے ہوگی؟ اور محکمہءموسمیات نے کہاں اور کب پیشن گوئی کی ہے کہ آج رات آندھی طوفان آئے گا، ممکن ہے ایسا اعلان کیا بھی ہو اور وہ میں سُن نہیں پایا ہوؤں، میں خبر نامہ، پابندی سے کہاں سنتا ہوں، کیونکہ وہ تو حکمراں طبقہ کا قصیدہ نامہ ہوتا ہے اور وہ عورت ۔۔ کیا اسی نجومی کی بھیجی ہوئی ہوسکتی ہے۔؟ دونوں کی ملی بھگت ہوگی۔ دونوں سے ملاقات کلب ہی میں ہوئی تھی ۔ زندگی میں ہزار دفعہ گرج چمک کے ساتھ بارش دیکھی ہے۔ امریکی ریاست فلوریڈا میں بادلوں کی گرج کیسی قیامت خیز ہوتی ہے جب اُس آواز سے خوف پیدا نہیں ہوا تو اپنے ملک کی ہزار ہا مرتبہ دیکھی اور سنی ہوئی گرج چمک سے ڈر جاؤں گا۔؟ لعنت بھیجو نجومی پر اور اُس عورت پر... پھر میں نے سوچا... وہ دونوں مجھے مختلف دن ملے تھے.... پہلے عورت.... دو تین دن کے بعد نجومی.... وہ ایک دوسرے کے آلہء کار ہوسکتے ہیں مگر.... مگر مجھے یہ یاد نہیں آرہا کہ اِن سے تعارف کس نے کرایا....!!!

اور اِن تمام باتوں سے الگ اور عجیب.... مکان ڈھے جائے گا.... گھر کی چھت بیٹھ جائے گی۔ کوئی زلزلہ آرہا ہے یا میرا گھر مٹی کا بنا ہوا ہے؟ یہ ضرور ہے کہ میں نے ایک ٹھیکیدار سے خریدا تھا.... وہ ٹھیکیدار بھی آج تک نیک نام چلا آرہا ہے۔ ریٹائرڈ فوجی ہے.... خود بھی اسی سوسائٹی میں رہتا ہے.... بہت سے لوگوں نے اُس کے بنائے ہوئے مکان خریدے ہیں، کئی بارشیں گزر چکی ہیں کسی کا مکان گرا، نہ چھت بیٹھی.... پھر میرا گھر.... سارا دن میں ڈپریسڈ رہا۔ نہ کہیں گیا نہ کسی کو فون کیا.... نیند بھی نہیں آئی.... ٹی وی پر اتنے چینلز ہیں.. ہر کروٹ کے ساتھ چینل بدلتا رہا۔ نجومی مجھے ہراساں کرنا چاہتا ہے مگر کیوں....؟ میری مجھ سے ملاقات what a rabish? ...

کیا سچ مچ ہاتھ کی لکیریں بولتی ہیں۔؟ عورت کیا میرا الیوژن تھی۔؟ اور ابھی اتنی طویل بات.... کیا یہ نجومی بھی میرا الیوژن تھا۔؟ ایسے ہی خیالات کے بھنور میں ڈوبتا ابھرتا رہا.... پھر معلوم نہیں کب سوگیا.... جب آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اُٹھ کے لائٹ آن کرنا چاہی.... تیسری دنیا کے نیم ترقی پذیر ملکوں کی اب یہ روایت بن چکی ہے کہ جمہوریت کی طرح بجلی، پانی کا بھی آنا جانا لگا رہتا ہے.... بیماریاں ہیں دوا نہیں۔ شکایت کریں تو کس سے کریں۔؟ شکایت سننے والوں کے پاس کان ہی نہیں ہیں۔۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں جو حاکم ہیں بہرا ہونا تو الگ بات ہے اُن کے کان میں اپنی خوشامد کے سوا کوئی لفظ جاتا ہی نہیں۔ چلو ہم جیسی اپر مڈل کلاس کو یہ سہولت تو ہے کہ ایک بچہ ہو تو اُس کو یورپ یا امریکا بھیج دیں۔ جن کے پاس یہ سہولت بھی نہیں ہے اور بچے بھی زیادہ ہیں.... وہ بنیاد پرست ہیں.... جہادی ہیں.... کمبخت روٹی پانی بھی مانگتے ہیں، تعلیم کے بعد روزگار بھی چاہتے ہیں۔۔۔ یہ لوئر مڈل کلاس کا رونا کیوں رونے لگا؟۔۔ شاید اسلئے کہ میں خود بھی اُسی کلاس سے نکل کے آیا ہوں.
... جب اندھیرا ہو تو ایسے ہی خیال آتے ہیں۔ اُف ۔۔۔ کس بلا کی گرج چمک ہے۔۔ دل دہل کر رہ گیا۔ چوکیدار کو آواز دوں.... مگر اتنی تیز بارش اور ایسی کڑکتی بجلی اور گرجتے بادلوں میں میری آواز اُس تک کیسے جائے گی۔۔ اِس کا مطلب ہے وہ نجومی.... لعنت اُس نجومی پر.... مجھے نیچے چل کے ہال کمرے میں بیٹھنا چاہئے۔۔ سینکڑوں بار اس

زینے پر تیزی سے آیا گیا ہوں۔ اب اسکی ریلنگ پکڑ کر اندھوں کی طرح احتیاط سے اترنا پڑ رہا ہے۔۔۔ صوفے پر بیٹھتے ہی لائٹ آگئی.... نہیں چوکیدار نے جنزیٹر چلایا ہے۔۔ اس کو آواز دوں۔۔ مگر نام کیا ہے۔۔ اب نام بھی تو ذہن میں نہیں آرہا ہے۔۔۔ میں نے وقت دیکھا میری گھڑی بند تھی، ڈائینگ ٹیبل پر کھانے کے برتن رکھے تھے۔ اس کا مطلب ہے شام کو صفائی کرنے والی بھی۔ اور خانساماں بھی اپنا کام نمٹا کے جا چکے ہیں۔۔ اُف میرے خدا کتنی شدید گرج چمک ہے۔ اور یہ.... یہ بیوی کا پرس اوپر کمرے سے کیوں اُٹھا لایا ہوں۔ چلتے وقت وہی تو کہہ گئی تھی کہ ساری اہم چیزیں تو بنک لاکرز میں رکھی ہیں بس یہ چھوٹی موٹی اِس پرس میں پڑی ہیں۔۔ تو میں بھی نے احتیاطاً اپنی خاص چیزیں اسی میں رکھ دی ہیں۔ ویسے تمام کریڈٹ کارڈز تو حسبِ معمول میری جیب میں ہیں اور یہ۔۔ رات کا ایک پہر گزر گیا۔! یہ میرے ہاتھ پر رومال کیوں بندھا ہے.؟ اندھیرے میں بے خیالی میں باندھ لیا ہوگا۔ بے خیالی۔!! بارش تیز ہوتی جارہی ہے۔۔ اب اتنی ہمت تو ہے نہیں کہ گیراج سے گاڑی نکالوں اور کلب جا بیٹھوں یا کسی دوست کے ہاں چلا جاؤں۔ خواہ مخواہ پٹرول پھونکنے اور وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے سنو.. اے چوکیدار۔ ادھر آؤ۔ ذرا مجھے سہارا دو۔۔۔ ہاں بس ۔۔ میں کچھ دیر تمہارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتا ہوں۔۔ ارے یہاں نہیں جہاں تم بیٹھ کے چوکیداری کرتے ہو وہاں۔۔۔۔ چوکیدار کے کندھے پر ہاتھ رکھے میں ہال کمرے سے باہر آیا۔۔۔ تیز بارش میں گھر سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی پہاڑ سے بہت سارے پتھر لڑھکتے ہوئے میرے تعاقب آرہے ہیں۔ چوکیدار مجھے کھینچتا ہوا بھاگا۔

ترنم ریاض (دہلی)

خاتون وحضرات

عاصمہ بیگم ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں۔۔اف۔۔کیا خواب تھا۔۔۔۔۔۔

انہوں نے داہنی اور بائیں جانب نظر ڈالی۔ پھر سامنے کھڑکی کے باہر کی طرف دیکھا۔ملحقہ غسل خانے سے بہتے نل کے شور میں سے سلمان صاحب کے ناک سڑکنے کی آواز ابھری تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور مسہری سے اٹھ کر پیروں کے انگوٹھوں کو نرم سے سلپروں کے اوپر لگے کسی مخمل نما سیاہ رنگ کپڑے کے قوس میں پرویا اور اندر کی جانب چل دیں۔اس سے پہلے وہ بیدار ہوتے ہی برآمدے میں نکل کر آسمان کی جانب ایک نظر دیکھا کرتیں تھیں اور پھر سیاہی مائل سبز روشنی میں نیم عیاں سی ہریالی کے اندر جھانکتے چھپتے طیور کو دیکھنے اور سننے کی کوشش کیا کرتیں۔مگر آج وہ دونوں بیٹوں کے کمروں کے دروازوں کے دستوں کو باری باری چھو کر لوٹ آئیں۔دستے برف ہو رہے تھے۔یعنی ائرکنڈیشن کی ٹھنڈک میں وہ دونوں اطمینان سے سوتے رہے ہیں اور خواب جھوٹا تھا۔ کہیں کوئی میڈیا والا کیمرے کے توپ خانے،شانے پر دھرے ان کے شوہر کی گاڑی کے درپے نہیں تھا۔نہ ہی ان کے بیٹوں کے دوست آنکھوں میں شرارت بھرے سوالات لئے گھر کے پھاٹک کے باہر اپنی موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں میں منتظر کھڑے تھے۔عاصمہ بیگم نے مطمئن ہو کر شب خوابی کی آدھی آستین والی ریشمی عبا میں چھپے شانے سے اپنا رخسار سہلایا۔انہیں بے سبب ہی ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہاں پسینے کا قطرہ ہو۔

باورچی خانے سے لگے احاطے میں رکھی کھانے کی میز والی ایک کرسی کھسکا کر وہ اس پر ٹک گئیں اور اپنے لئے چائے بنانے لگیں کہ پیالہ لے کر وہ برآمدے کی طرف جانے والی تھیں۔ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال تھا کہ سلمان باہر آئیں تو وہ چائے کی کشتی باہر منگوالیں۔مگر دماغ کا باقی حصہ سوچوں میں غرق تھا۔ان کے پاس وقت بہت کم تھا۔

''مین ساب (میم صاحب)۔۔'' کرسی کھنچے جانے کی آواز سے سندری باورچی خانے کے اندر سے نکل آئی۔

''تا جی گڑمل گئی مین ساب'' اس نے چھوٹی سی سفید بے داغ کشتی میں رکھی شفاف کانچ کی کٹوری میں گڑ کی ڈلی کو چُور کر رکھا تھا اور چمچماتی ہوئی کسی دھات کے منقش چمچ میں بھر کر اس نے یہ چُورا عاصمہ بیگم کی پیالی میں انڈیل دیا۔

''ابھی چھوڑ دو یہ نقلی چینی کھانا مین ساب۔۔ساب بولے تھے نا۔ہڈی کا بیماری ہوتا ہے اس سے۔'' اس نے شکر دان اٹھا کر دوسری طرف رکھ دیا۔وہ عاصمہ بیگم کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔۔سنو تم۔۔میں نے سوچ لیا ہے۔۔وقت بہت کم ہے۔۔'' وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں تو سندری جو جھک کر اُن کے پیالے میں چمچہ چلا رہی تھی، پیالہ ہاتھ میں لئے سیدھی ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

عاصمہ بیگم باہر برآمدے کی طرف چلیں اور سندری ان کے پیچھے پیچھے۔

''وہ جو اس طرف کا راستہ ہے نا۔۔وہ ادھر سے۔۔'' عاصمہ بیگم نے باہر کی طرف راستے کے رخ پر بانہہ موڑی۔

''تم ادھر۔۔او۔۔۔دھر دوسری اور مڑ جانا۔۔ بالاجی ٹینٹ ہاؤس کے ۔۔سامنے۔۔وہی جس کے بورڈ پر سہرا باندھے دولہے کی تصویر بنی ہے نا اور لکھا ہے کہ۔۔اوفو۔۔تم پڑھ بھی تو نہیں سکتیں نا۔۔۔اچھا تو اس کے سامنے جہاں پولیو کے ٹیکے کا اشتہار۔۔۔بھئی جہاں ایک چھوٹے سے بچے کے منہ میں دوائی کا قطرہ ٹپکا۔۔۔''

''جانتی ہے مے پونیو۔۔مین ساب۔۔میرے کو بچپن مے ہوئی تھی نا تو۔۔'' سندری نے پرچ پیالی پتھریلی سفید میز پر رکھ دی۔عاصمہ بیگم اپنے دادا بزرگوار کے زمانے سے گھر میں پی جانے والی 'ارل گرے' چائے کی سحر انگیز سی خوشبو کو بمشکل تمام نظر انداز کر کے جلدی سے بولیں۔

''اچھا؟۔۔اچھا اچھا۔تو پہلے میری بات سن۔۔اسکے پاس ایک ریڈ کراس۔۔۔میرا مطلب ہے سرخ رنگ کا ایسا نشان بنا ہوا ہے۔'' انہوں نے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی پر شہادت کی انگلی آڑی رکھ کر سندری کی آنکھوں کو دیکھا۔

''ایسا۔۔کچھ سمجھی بھی کہ میں یوں ہی۔۔وہاں پر نچلی منزل میں ہی۔۔۔''

''ہا جی مین ساب مے سب سمج گیا۔۔''

''خاک سمجھ گیا۔بیس بار بھی بتائیں جب بھی بھول جاتی ہے'' عاصمہ بیگم بید کی تیلیوں سے بُنی گئی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

کوئی سال بھر پہلے ایک شام گھریلو ملازمین مہیا کرنے والے ایک ادارے کی طرف سے ایک ملازمہ کو بھجوایا گیا تھا۔لڑکی کی عمر کا کچھ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا،تاہم وہ نوجوان ہی معلوم ہوتی تھی۔چھوٹا سا دبلا پتلا جسم، گہرے سے کچھ کم سانولا رنگ،نمایاں ہڈیوں والا لمبا چہرہ،چھوٹی آنکھیں جن کی پتلیاں دو زاویوں سے دیکھتی تھیں۔سیاہ بالوں میں کچھ سفید بالوں کی لکیریں بھی تھیں اور دانت کچھ بڑے اور لمبے تھے۔

''کہاں رہتی ہے۔۔۔؟ عاصمہ بیگم نے ساتھ لانے والے آدمی سے پوچھا اور لڑکی کی جانب ایک نظر ڈال کر اپنے دو سال پرانے باورچی کی طرف دیکھا۔کمل نے سیکنڈ بھر سے بھی کم وقفے میں آنکھیں پھیلا کر شانے اچکائے اور ناک سکیڑ کر منہ دوسری طرف موڑا یعنی وہ لڑکی سے خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ناپسندیدگی بھی ظاہر کر رہا ہو۔

یہ تاثرات دیکھ کر عاصمہ بیگم نے دوبارہ لڑکی کی جانب نظر اٹھائی۔برابر کے صوفے پر کچھ دن کے لئے آئی عاصمہ بیگم کی بزرگ والدہ بیٹھی تھیں۔اپنے موٹے سے چشمے کے عقب سے انہوں نے سب کی طرف باری باری دیکھا۔

’’کیا نام ہے بیٹی۔‘‘انہوں نے نرم سی نگاہ لڑکی کی طرف ڈالی۔لڑکی کے لئے غالبًا باورچی کے تاثرات اور عاصمہ بیگم کی سوچتی ہوئی نظروں جیسی چیزیں اجنبی نہ تھیں۔وہ اس ساری فضا کے زیر بار کچھ منمنائی جسے کوئی نہ سمجھ سکا۔

’’اچھا اچھا۔۔ماں باپ ہیں۔۔۔؟‘‘اماں نے گویا نام کی تعریف میں سر ہلایا۔

’’میرا اماں نہیں ہے۔۔سوتیلا ماں ہے۔‘‘اس دفعہ لڑکی کی آواز واضح تھی جسے سن کر لانے والے شخص سمیت سب لوگ چونکے تھے۔

’’اوہ۔۔اچھا اچھا۔کوئی بات نہیں جا ہاتھ منہ دھولے۔‘‘والدہ صاحبہ نے برآمدے کی بائیں جانب اشارہ کیا۔

’’پہلی بار سہر آئی ہے نا تو اسکو بھاسا نہیں آتا۔۔‘‘ساتھ لانے والے شخص نے کہا۔

’’آپ کو بہت اچھا بھاشا آتا ہے۔۔‘‘کمل آنکھوں میں شرارت چھپائے سنجیدگی سے بولا۔عاصمہ بیگم نے اسے جیسے تمبیہاً دیکھا۔

’’مگر سیکھ جائے گی۔۔‘‘وہ جلدی سے بولا۔غالبًا کمل کا طنز جس کی زبان اس عرصے میں خاصی صاف ہوگئی تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

’’میں بھی پچھلے سال آیا تھا جھارکھنڈ سے ۔۔میں نے بھی ادھر ہی سیکھا ہے بھاسا۔‘‘وہ مسکرایا

’’تم لوگ اس کی صورت کی وجہ سے اس بن ماں کی بچی کو۔۔۔۔‘‘والدہ صاحبہ نے کمل کی طرف جیسے کہ افسوس سے دیکھا ہو۔

’’نہیں اماں جی۔۔۔۔میں تو۔۔‘‘ وہ کچھ شرمندگی سے بولتا ہوا پچھواڑے کی طرف گیا۔

’’اور تم میری بیٹی۔۔اکیلی ہو دیکھا جائے تو۔۔اللہ نے تمہیں بیٹی نہیں دی۔۔اسے اپنالو۔تمہارا ساتھ دیگی۔۔‘‘

’’جی امّی مگر اسے کام بھی نہیں آتا ۔۔زبان بھی اچھی طرح نہیں سمجھتی۔۔‘‘

’’ سیکھ جائے گی۔۔۔پہلی بار شہر آئی ہے۔۔۔غریب۔۔یتیم بچی۔۔‘‘والدہ صاحبہ کی آواز میں درد سا بھر آیا تھا۔وہ کچھ کہنے جا رہی تھیں کہ کمل جیسے تیزی سے اندر داخل ہوا۔

’’میم صاب جی۔میں باہر الگنی سے کپڑے اٹھانے گیا نا،جی! تو وہ بال بنا رہی تھی دوسرے دروازے کے پاس‘‘

’’تو۔۔؟۔۔۔کیا ہوا۔۔بال نہیں بنانے چاہئیں اسے۔۔‘‘

’’وہ۔۔کچھ اندھیرا سا ہے نا جی تو۔۔۔میں تو ڈر گیا جی۔۔۔۔ایکدم بھوتنی کے جیسی لگ رہی تھی جی‘‘ والدہ صاحبہ اسے دیکھتی رہ گئیں۔

’’چپ۔۔اللہ نے بنایا ہے اسے۔۔سوتیلی ماں ہے اسکی۔۔جانے بھر پیٹ کھانے کو ملتا بھی ہو،اسے۔۔کمزور سی ہے بیچاری،،کھائے پئے گی ٹھیک ہو جائے گی۔۔ایسی تکبّر کی باتیں نہیں کیا کرتے۔‘‘

والدہ صاحبہ کچھ خفگی سے بولیں اور دیوار پر آویزاں گھڑی کو بغور دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں پھر صوفے کے بازو کا

سہارا لئے جھرّیوں والے گورے ہاتھ کی پتلی پتلی انگلیوں سے تسبیح کے دانے گھماتی کھڑی ہوئیں اور اندر کی طرف مڑ گئیں۔رومن ہندسوں والی اس گھڑی پر انہیں وقت دیکھنا نہیں آتا تھا اور گھڑی کی جانب دیکھ کر وہ وہاں پر موجود کسی سے بھی وقت پوچھا کرتیں۔اس وقت انہوں نے کسی سے کچھ نہ پوچھا اور خاموشی سے اندر چلی گئیں۔

لڑکی کو ملازم رکھ لیا گیا۔

اس کا نام سندری تھا۔زبان ہی جانتی تھی نہ کام۔مگر والدہ صاحبہ جب تک رہیں اس نے ان کے سارے کام کرنے کی بھرپور کوشش ضرور کی۔ان کے معمول میں رات گئے تک عبادت کرنا شامل تھا۔اور سندری اکثر دیر رات تک انکے فارغ ہونے کا انتظار کر کے ہی سوتی کہ اگر انہیں کچھ ضرورت ہو تو وہ پریشان نہ ہوں۔ملازمین کے کمرے گھر کے پچھواڑے تھے اور والدہ صاحبہ کے کمرے کا ایک دروازہ پچھلے برآمدے میں بھی کھلتا تھا۔سندری اس دروازے پر دستک دیتی۔والدہ صاحبہ کی زبان اکثر وظیفے میں مصروف ہوتی اور ہاں ہوں کی آواز سے کلام کا کام لیا جاتا۔جس میں اشارے بھی شامل ہوتے۔چٹکی کی شکل میں انگلیاں دہانے کی جانب لے جانا چائے کے لئے اور ہتھیلی کے قریب کلائی کا حصہ ٹھوڑی سے چھو لینا پانی کا اشارہ تھا۔وہ پانی گرم پیا کرتی تھیں اور اکثر یہی دو چیزیں انکو ضرورت ہوا کرتیں۔کبھی کبھار سردی لگنے کی صورت میں گرم پانی کی تھیلی کا اشارہ شانے سکیڑ کر،دانتوں کو بجا کر کیا جاتا۔

’’کہا تھا نا۔۔سب سیکھ جائے گی۔۔‘‘

والدہ صاحبہ اس کی تعریف کرتیں تو کمل ان کی غیر حاضری میں عاصمہ بیگم کی طرف جیسے کہ بے بسی سے دیکھتا۔

’’یہ کام تو کوئی گونگا بھی کر سکتا ہے میم صاحب جی۔‘‘

’’تمہارا ہر بات میں بولنا ضروری ہے کیا۔۔‘‘عاصمہ بیگم مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتی دھیرے سے کہتیں۔

’’نہیں جی میں تو۔۔‘‘

سندری ایماندار تھی۔اور صاف ستھری رہا کرتی تھی۔اس کے سیاہ فام پیروں کی ایڑھیاں سفیدی مائل نظر آتیں اور چپل چم چم کرتے۔

مخصوص دلچسپ تاریخ کے حامل اپنے علاقے کے بارے میں وہ بڑی دلچسپ باتیں سنایا کرتی۔

’’مے چوہا اچھا پکاتا ہے،معلوم۔۔۔؟‘‘اس نے ایک دن کمل سے کہا تھا۔

’’کیا۔۔؟ کیا پکاتا ہے؟‘‘پنیر بھونتے ہوئے کمل کے ہاتھ سے کڑھائی میں چمچہ چھوٹ گیا تو تیل کے گرم چھینٹوں سے وہ بلبلا اٹھا تھا مگر اس بات میں اس کی دلچسپی جب بھی کم نہ ہوئی تھی۔اس نے کلائی بہتے ہوئے نل کے نیچے چھوڑ دی۔’’ کیا کہتی تھی تُو۔۔پھر بول۔۔‘‘وہ اس کی طرف گردن موڑ کے بولا۔

’’چوہا۔۔بولا تھا۔۔چوہا پکاتا ہے۔۔مے۔۔ہمرا گاؤں میں ایکدم موٹا ہوتا ہے۔۔‘‘وہ سر جھکائے پالک کے

ساگ سے پتے الگ کرتی رہی۔

عاصمہ بیگم نے کھلے نل کی مسلسل آواز سنی تو باورچی خانے میں آ گئیں۔

''کیوں پانی ضائع ۔۔۔کیا ہوا۔۔اوہ۔۔ہاتھ جلا لیا۔۔'' وہ جلدی سے نل کے قریب گئیں۔

''آبلہ تو نہیں پڑا۔۔نا۔۔''

''نہیں میم صاب۔۔بچ گیا میں تو ابھی مر جاتا جی۔۔''

''کیوں ۔۔کیا ہوا۔۔''

''آپ میم صاب اس سے پوچھئے نا۔۔''اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا تم ہر وقت اس کی جان کے پیچھے لگے رہتے ہو۔۔کیا ہوا تھا سندری۔۔؟''

''کچھ نہی مین صاب۔۔۔مے کچھ نہی کیا ہوں۔۔''وہ بے خبر سی کمل کو دیکھ کر بولی۔

''جرا بتا نا میم صاب کو تو کیا پکاتی ہے۔''

''اچھا وہ۔۔۔مے چوہا بوت اچھا پکاتا ہے۔۔میرا نانی کھاتا تھا۔۔اسی نے سکھایا تھا۔اور کیا پکاتا۔ادھر پشو پکھشی تو کھتم ہو گیا ہے نا۔''

عاصمہ بیگم اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئیں۔

''تو بھی کھاتا ہے۔۔؟''کمل جلدی سے بولا تو عاصمہ بیگم زور سے ہنس پڑیں۔

''مے نہی کھایا۔۔''سندری سر اٹھا کر دونوں کو باری باری دیکھ کر مسکرائی اور دوبارہ کام میں مشغول ہو گئی۔

''چکھا تو ہو گا نا پکاتے وقت تو نے کبھی۔۔''کمل چھوٹے سے تولئے سے ہاتھ پونچھتا ہوا بولا تو عاصمہ بیگم مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہوتی باورچی خانے سے باہر نکل آئیں۔

کمرے میں پہنچ جانے کے بعد تک ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھائی رہی۔

سلمان صاحب نے اُس خطے کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں بتائیں تھیں۔

ہندوستانی جزیرہ نما کے چھوٹا ناگ پور کی سطح مرتفع میں وسطی بھارت کا یہ حصہ ہمیشہ سے دلچسپیوں کا حامل رہا تھا۔برِصغیر کے مختلف جغرافیائی خطوں سے ہجرت کر کے اس ایک جگہ پر جمع ہونے والے قبائل کی موجودگی کے سبب یہاں کئی طرح کی زبانیں ، تہذیب،جسمانی خدوخال وغیرہ یکجا نظر آتے ۔مگر انسانی تہذیب کے محققوں اور سیاسی تجربوں نے ان کی اصل تہذیب کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔

برطانوی حکومت نے یہاں بھی لوگوں کو اپنا وفادار بنانے کی غرض سے عیسائیت کو متعارف کرایا تھا جس کی شروعات وہاں کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے ۱۸۴۵ء میں جرمنی کے چار پادریوں نے اپنا گرجا گھر قائم کر کے کی تھی۔ رفتہ رفتہ دوسرے اعتقادات کے گرجے بھی جن میں 'اینگلی کنز' اور 'رومن کیتھولک' شامل تھے اپنے قدم جمانے

لگے۔اور یہاں کے باشندوں میں اکثر کے معبد جو 'سارانا' کہلاتے تھے۔گرجا کہلانے لگے۔کہ پادری بپتسمہ کے وقت انکے نام کی طرز بدلتے تھے اور نہ رہن سہن کے طور طریقوں کو تبدیل کرنے پر زور دیتے تھے۔اس لئے بظاہر تبدیلی کچھ ایسی نمایاں اور اچانک معلوم نہیں ہوتی تھی۔

روزگار کا واحد ذریعہ زمینیں تھا جو انگریزی قانون کے تحت سرکار کی ہو گئی تھیں اس لئے روزگار کے متبادل وسیلے پیدا کرنے والی سرکار کے مذہب کو اپنا لینا رعائتوں کا باعث ہونے سے رجحان بھی بڑھا۔ان سب باتوں کو سمجھنے والوں کی بھی کچھ ایسی کمی نہیں تھی بلکہ برسا منڈا نے جسے قبائلی عقیدت سے برسا بھگوان کہتے تھے،عیسائیت کے اس طرح اطلاق کے خلاف آواز بھی اٹھائی تھی جو بعد میں وہاں قومی آزادی کے لئے بغاوت کے دوران وہاں نعرے کے طور پر ابھری۔آگے چل کر کچھ حد تک تعلیم و تربیّت کی طرف بھی رجوع کیا گیا۔جو اہم بات تھی۔

باورچی خانے سے کچھ گرنے کی آواز آئی تو عاصمہ بیگم کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

سندری کام سنجیدگی سے کرتی تھی۔مگر غلطیوں کی تعداد کام سے زیادہ ہو جاتی۔اس کے الٹے سیدھے کاموں سے عاجز عاصمہ بیگم کمل کو بلاتی تو سندری برتن دھونے والے صابن سے لتھڑے ہاتھ لئے حاضر ہو جاتی۔

''کمل بھیا باجار گئی۔مے برتن دھوتا ہوں۔''

''اچھا۔۔جا۔۔دھو برتن۔۔دھو چکے تو یہاں آ جانا۔''عاصمہ بیگم سر خم کر کے اسے دیکھتیں۔

''کیا توڑا سندری۔۔''عاصمہ بیگم ٹوٹ پھوٹ کی صدا پر چونک کر کہیں سے پکار اٹھتیں۔

''اِکلا گلاس چھے میں سے بچا تھا نا۔۔او ای ٹوٹا۔۔''سندری عاصمہ بیگم کے باورچی خانے میں پہنچ جانے پر ٹوٹے گلاس کا پیندا حاضر کرتی ہوئی اطلاع دینے کے انداز میں کہتی ، کچرے کے ڈبے کی جانب لپکتی۔

''کیوں سندری۔۔تیرے ہاتھ کیا کانپتے ہیں۔۔کچھ نہ کچھ توڑتی رہتی ہے۔''

''وہ مین صاب۔۔میرے کو چھوٹے میں پونیو ہو گئی تھی نا۔میں چلتا نہی تھا ایک دم پھر دوائی کھایا۔تب ٹھیک ہوا''

''اوہ ہاں۔۔پولیو ہوا تھا۔۔اب تو ٹھیک ہو نا۔۔؟''عاصمہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتیں۔

'' ٹھیک اے ہوں۔۔نیکِل (لیکن)کبھی کبھی۔۔''

''اور۔۔یہ ۔۔یہ کیا ہے۔۔؟''عاصمہ بیگم نے برتنوں کی الماری کے قریب اپنی پسندیدہ نیلے گلابی پھولوں والی نہائت باریک چینی کی رکابی کے بیل کی ساخت میں ترشے سنہرے کنارے کا کونا ٹوٹا دیکھ کر حسرت سے پوچھا۔

''او۔۔۔یہ۔۔جانتا نہی۔۔کمل بھیا توڑی ہوگی۔۔۔مے نہی کیا۔۔''اس نے برتن دھوتے گردن موڑ کر بڑے بھول پن سے جواب دیا تو ہاتھ میں پکڑے دھل رہے گلاس کا کنارہ نل سے ٹکرایا۔

''اوہ۔۔سنبھل کے ۔۔''عاصمہ بیگم ہاتھ ہلا کر رہ گئیں۔

'' سوری مین صاب۔۔میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔۔''اس نے بڑی شرمندگی سے سر جھکا کر ٹوٹے

کنارے پر انگلی پھیری۔

''نہیں نہیں۔۔ہاتھ کٹ جائے گا۔۔'' عاصمہ بیگم نے گلاس اس سے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔اس کی زبان سے 'سوری' سن کران کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔وہ کمرے میں لوٹ آئیں۔

''سندری کتنی بار سکھایا ہے۔۔چادر سیدھی بچھایا کر۔۔''

''سیدھے ای ہے نا مین صاب۔۔اے دیکھو۔۔آپ۔۔ادھر سے۔۔ذرا سا'' وہ بڑے یقین سے کہتی اور چادر کا کونہ ہلکے سے کھینچتی۔اس کی خود اعتمادی سے عاصمہ بیگم کو مسّرت سی ہوتی۔

ملک کے آزاد ہوتے وہاں کے مختلف گرجا گھروں میں الگ الگ قبائل کے مقامی پادری بھی چن لئے گئے تھے۔اور ۱۹۴۹ء میں علیحدہ جھارکھنڈ ریاست کی مانگ کرنے والے تقریباً سبھی لیڈر مقامی عیسائی تھے۔

۲۰۰۰ء میں اسے بہار سے علیحدہ کر دیا گیا۔سوائے حقِ رائے دہی کے عام طور سے یہاں کے باشندوں کے لئے حالات کچھ زیادہ نہیں بدلے۔مختلف سیاستیں کبھی مذہب کا رنگ چڑھانے کے نعرے سے وفاداری طلب کرتی ہیں کبھی مذہب کا رنگ اتارنے کی اہمّیت پر زور دیکر ساتھ مانگتی۔اور روزگار کا مسئلہ وہیں کا وہیں۔

اس مسئلے سے سندری جیسے لوگ بھی دوچار تھے۔۔۔۔۔۔سلمان صاحب نے بتایا تھا۔

سندری کمرے سے جا چکی تھی مگر عاصمہ بیگم کی کی آنکھوں میں اس کا چہرہ گھومتا رہا۔۔اچھی غذا سے اس کے رخساروں میں چربی بڑھ گئی تھی جس کے سبب چہرے کی جلد کچھ کچھی جانے سے اس کا رنگ ذرا صاف نظر آنے لگا تھا۔ہنستے ہوئے اس کے صاف ستھرے دانت اب بھرے سے چہرے کے تناسب میں زیادہ بڑے نظر نہیں آتے تھے۔دوزاویوں سے دیکھتی ہوئی آنکھیں جیسے کہ اس کے نادانی کی حدتک پہنچے بھولپن میں اضافہ کرتی معلوم ہوتیں۔عاصمہ بیگم باورچی خانے میں لوٹ آتیں۔

'' ہم تم کو آنکھوں کی کسرت سکھائیں گے۔۔'' انہوں نے سندری کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔

''آنکھ کو کیا ہوگا مین صاب۔۔''

''آنکھیں سندر ہو جائیں گی۔۔بس جب بیٹھا کروتو۔۔ہاتھ کی پہلی انگلی کے ناخن کو دیکھتے ہوئے ناک کی سیدھ میں آنکھ کے قریب لانا اور دور لے جانا۔''

''مین صاب مے آپ کو ایک بات۔۔بتانا تھا۔۔''

''ہاں۔۔کون سا بات۔''

''میں جب چھوٹا تھا نا۔۔تو اندھی ہو گیا تھا۔۔'' وہ خوش خبری سنانے والے انداز میں ہنستی ہوئی بولی۔میرا موسا جی بولا باجا (ریڈیو) ادھر دو۔تو میں ان کے اوپر گر گیا۔۔وہ میرے کو ڈانتا کہ دیکھتا نہی۔۔'' وہ کچھ سنجیدگی سے بولی۔

''دکھونا مین صاب۔۔وہ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ مے گلتی چل رہا تھا۔۔مے تو اندھا ہو گیا تھا۔۔اس کو تو بولنا تھا نا

کہ تو اندھی ہو گیا ہے۔۔میرے کو ای بولتا رہا۔۔میرا گلتی تو نہیں تھا۔۔''

وہ عاصمہ بیگم کے چہرے پر اپنی بات کا ردِعمل تلاش کرنے کی غرض سے مزید سنجیدگی سے انہیں دیکھنے لگی تو عاصمہ بیگم کا مارے ہنسی کے برا حال ہو گیا۔اور انہیں ہنستا دیکھ کر وہ بھی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

''پھر۔۔ٹھیک کیسے ہوئیں۔۔'' انہوں نے قہقہے کو بمشکل تمام روک کر پوچھا۔

''پھر۔ پھر ٹامن (وائٹامن) دوائی دیا ادھر دور کا گاؤں میں دوائی والا (سرکاری دواخانہ) بیٹھتا ہے نا۔۔او ای دیا۔۔ایک ہی مہینہ کھایا۔۔مے ٹھیک ہو گیا۔۔''

کمل کے گھر سے فون آیا کہ اس کے ہاں بچہ ہوا ہے۔حالانکہ وہ اپنی اس سال کی چھٹّیاں گزار آیا تھا مگر اسے چھٹّی دینا پڑی۔بلکہ اس کے لوٹنے کے بارے میں بھی کچھ غیر یقینی والی صورتِ حال تھی کہ پچھلے سال اس کا پہلا بچہ بچ نہیں پایا تھا۔دوسرے ملازم کا انتظام کیا جانے لگا۔سندری تنِ تنہا سارا کام سنبھالنے کی بھرپور کوشش کرتی رہی۔

عاصمہ بیگم نے دیکھا اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔انہوں نے اس کی کلائی ٹٹولی۔

''بخار تو نہیں ہے تجھے۔۔پیلی پڑ گئی ہے۔۔کیوں؟۔کام زیادہ ہو گیا نا تیرے ذمے۔۔'' انہوں نے نرمی سے کہا۔

'' کام تو ٹھیک اے ہی ہے مین صاب۔۔نیکل۔۔جب سے شام بھّیا گئی ہے۔۔مے۔۔کچھو کھانے نہی سکتا۔۔''

وہ اداس سی آواز میں بولتی کام میں مصروف رہی۔

کچھ دن بعد بڑے چوڑے جبڑوں، پھیلی ناک، بھدی آواز اور چہرے پر بے شمار دانے لئے ایک اور آدی واسی ملازم آیا، کوئی بیس بائیس سال کا۔اس کا نام فلتوش تھا اور وہ بھی شہر پہلی بار وارد ہوا تھا۔سندری بڑے اعتماد سے اس پر حکم چلانے لگی۔اس نے سندری سے سندری کی طرح کام کرنا اور بولنا سیکھا۔

سندری کے مصروف ہونے کی صورت میں وہ بڑی چستی سے حاضر ہو جاتا۔

''میں ابھی کرتی ہوں جی۔۔'' وہ پلکیں تیزی سے جھپک کر کہا کرتا۔

وہ بھی ادارے کی طرف سے گیارہ ماہ کے معاہدے پر آیا تھا۔کام بھی سمجھ جاتا تھا مگر ایک دن دوپہر کے بعد جب وہ کافی دیر کمرے سے نہیں آیا تو سندری اسے بلانے گئی۔

''مین صاب وہ میرے کو بولتی ہے۔۔تیرے کو کاٹ دونگا۔۔'' سندری فوراً لوٹ آئی۔

''کیا۔کون۔۔''

''مجھ سے بولا اہے فلتوش بھیا۔۔۔؟''

''کیوں۔۔؟'' عاصمہ بیگم حیرت سے اس کا منہ تکتی رہ گئیں۔

''مے کچھو نہی بولا تھا مین صاب۔۔ وہ کپڑا کا رسی کاٹنے کو چاقو لے گیا تھا نا او۔۔ ہاتھ میں تھی۔۔چاقو آگے کیا میرا منہ پاس۔۔بولی چپ کر کاٹ دوں گا۔۔وہ بوت گوصّہ والا ہے۔۔''

’’تجھے لگتا ہے وہ ایسا کرسکتا ہے‘‘ عاصمہ بیگم آئے دن اخباروں میں نوکروں کے حملوں کی خبروں کو یاد کرنے لگیں۔

’’مالوم نہی مین صاب۔نیکل، وہ بوت گوصّہ والا ہے۔میرے کو آج پتہ چلی کہ اس کے اندر بوت ہئی گوصّہ ہے۔۔‘‘

فلتوش کو چھ ماہ ہوئے تھے۔عاصمہ بیگم نے شوہر کو روداد سنائی۔وہ قانون کی عزت کرنے والے قانون دان اور راست باز سے آدمی تھے۔مسئلے حل کرنے کے معاملے میں جلد باز بھی واقع ہوئے تھے۔

’’ہم نہ کہتے تھے احمق ہے۔فوراً اسے نکال باہر کیجئے۔۔خطرناک مجرم ہوسکتا ہے۔فون کیجئے پلیسمینٹ والوں کو۔ کسی کو بھی پکڑ لائیں گے کیا۔ہونہہ۔۔‘‘

وہ ایک ہاتھ میں ذیابیطس کی گولی اور دوسرے میں پانی کا گلاس لئے عاصمہ بیگم کو دیکھتے رہے۔عاصمہ بیگم نے ان سے جیسے جواب کی توقع کی تھی ویسا ہی پایا۔سلمان صاحب نے بیگم سے نظریں ہٹا کر گلاس کی طرف دیکھا اور ٹکیا نگل لی۔اس کے بعد باہر جانے کی بجائے صوفے پر بیٹھ گئے اور ڈرائیور کو اندر کے دروازے تک بلوایا۔

’’پہلے اسے پلیسمنٹ چھوڑ آئے۔۔کہہ دیجئے۔۔ہم بعد میں جائیں گے۔‘‘

کچھ روز پھر سندری کو اکیلے کام چلانا پڑا۔ضرورت پوری ہو جاتی تھی لیکن سلیقہ ناپید رہا۔مگر جلد ہی نیا ملازم آ گیا۔ بھولی سی صورت والا اٹھارہ انیس برس کا لڑکا جو سریلا گاتا تھا اور فلمی اداکاروں کی نقل کرتا تھا۔یہ اطلاعات سندری نے عاصمہ بیگم کو بہم پہنچائی تھیں۔

’’اچھا ہے۔۔نیکل۔۔میرے سے چھوٹا ہے۔۔میرے کو دیدی کہتا ہے۔۔‘‘ سندری نے سنجیدگی سے کہا تو عاصمہ بیگم نے اسے چونک کر دیکھا۔

’’تو کیا ہوا۔تم اس سے بڑی ہو تو دیدی بلائے گا نا۔۔‘‘

’’ہاں عمر تو میرا جادہ ہے۔۔دوائی سے بال بھی پک گیا ہے۔۔۔نیکل مے کلر کرتی ہے نا۔تو میرا بال اچھی لگتی ہے ۔۔میرے کو پسند نہی دیدی بولنا۔۔۔مے اس کو بولے گی میرے کو نام سے بلائے۔۔‘‘

عاصمہ بیگم نے اس کی بات کو سمجھنے کی جیسے کچھ کوشش سی کی۔

اچھا۔۔جو تیرا جی چاہے کر۔۔‘‘ انہوں نے سر جھٹک کر کہا اور اندر کی طرف گئیں۔

اب کام کچھ بہتر طرح ہونے لگا تھا۔سندری سے اس کے نئے شاگرد چمن نے خاصی تربیّت حاصل کر لی تھی۔چمن کام خوش اسلوبی سے کرتا۔اور اس کا فی الحال چھٹی لینے کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔عاصمہ بیگم اس خوش انتظامی سے مطمئن ہوا ہی چاہتی تھیں کہ ایک صبح سندری حواس باختہ سی تھکے تھکے چہرے پر پریشان سی آنکھیں لئے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

’’مین صاب۔۔میرے کو۔۔میرے کو مہینہ نہیں ہوئی۔‘‘ اس نے عاصمہ بیگم کے چہرے کی جانب نظر ڈال کر سر جھکا لیا اور مسہری کے پاس فرش پر دھپ سے بیٹھ گئی۔

’’ تو اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔۔ہو جائے گا۔۔ایک دو دن اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔‘‘

’’نہی مین صاب کل چار دن ہو گیا۔۔آج بھی نہیں ہوا۔۔پانچ دن ہو گیا۔۔‘‘ اس نے ہاتھ کی انگلیاں پھیلا کر دکھائیں۔۔‘‘ اس کے چہرے پر گہری تشویش صاف عیاں تھی۔

’’ کیا۔۔مطلب تو نے ۔۔تو نے کچھ۔۔‘‘ عاصمہ بیگم فوراً بولیں۔

’’جانتی ہے نا تو۔۔غلطی کرنے سے مہینہ نہیں ہوتا بچہ ہو جاتا ہے۔۔تو کہیں ماں۔۔‘‘

’’مین صاب۔۔او چمن میرے کو پکڑ لیا تھا۔۔‘‘ اس نے ایک نظر اوپر دیکھا اور سر جھکا لیا۔

’’کیا بک رہی ہے۔۔کب۔۔؟‘‘

’’پچھلے ہفتے۔۔‘‘

’’تو۔تو نے مجھے بتایا ہی نہیں اتنے دن۔۔اس بدتمیز کو میں۔میں پولیس میں۔۔‘‘ عاصمہ بیگم کچھ کہتے کہتے رکیں۔

’’کتنی بار پکڑا تھا اس نے تجھے۔‘‘

’’ تین بار۔۔ میرا مرجی نہیں تھا۔۔‘‘

’’اوہ۔۔اچھا۔۔ تیرا مرجی نہیں تھا۔‘‘ عاسمہ بیگم نے گہری سانس لی۔

’’اس فلتوش نے بھی کبھی ایسا کیا تھا۔۔‘‘ عاصمہ بیگم نے کچھ حیرت اور بے یقینی سے پوچھا۔

’’ہاں جی بہت بار۔۔میرے کو ایسے ہی بوت چنتا لگتا تھا۔۔مگر وہ کہتا تھا میرے کو پتہ ہے کچھو نہی ہوگا۔۔نیکل پھر مہینہ ہو جاتی تھی۔۔‘‘

’’اور کمل نے۔۔‘‘ عاصمہ بیگم ہکا بکا بولیں۔

’’ہاں جی اور کیا۔۔مگر وہ سمجھدار تھا۔۔اس کو پتہ تھی کہ کیسے کیا کرنا ہے۔۔باجار میں کدھر کیا ملتا ہے۔۔لاتا تھا۔۔، میرے کو ایک دم چنتا نہیں ہوتا تھا۔۔‘‘

’’بدتمیز ۔۔‘‘ عاصمہ بیگم کا ہاتھ بے اختیار اس کے چہرے کی طرف اٹھا مگر انہوں نے اسے تھپڑ نہیں لگایا اور دانت پیس کر رہ گئیں۔

تُو۔۔تُو بھیّا بلاتی تھی۔۔اُسے۔۔اور۔۔اور وہ کمبخت کہتا تھا کہ بال بناتے وقت تو۔۔ایکدم۔۔ایکدم۔۔‘‘ عاصمہ بیگم کا سانس بے ترتیب سا ہو گیا۔

تو میری پرہیزگار ماں کو۔۔ناپاک۔۔‘‘ عاصمہ بیگم کانپتی آواز میں بولیں۔

’’نہی مین صاب مے نہاتا تھا۔۔‘‘ وہ جلدی سے بولی۔

عاصمہ بیگم کا سر چکرا گیا۔انہوں نے انگلیوں کے پوروں سے کنپٹیاں تھام لیں۔کئی پل ایسے ہی گزر گئے۔

’’اچھا۔۔وہ۔۔فلتوش نے تجھے پھر کیوں کہا تھا مار ڈالے گا؟‘‘

’’میرے کومہینہ نہیں ہوئی تھی نا۔۔ مے اس کو بولی نہی ہوئی تو مے مین صاب کو بولے گا تو میرا شریر کو چھوا ہے۔۔اسے گوصہ آگیا تھا۔۔‘‘

عاصمہ بیگم کچھ لمحے سن سی اسے تکتی رہ گئیں۔

’’پچھلی دفعہ کب ہوا تھا۔۔‘‘

’’جس دن آپ صاب اور بھیّا لوگ کھانے پر گیا تھا نا باہر۔۔مے چوڑی دار پہنی تھی۔۔جو آپ لوگ انمیسر ی (اینیورسیری) کے دن ٹِپ دیا تھا نا۔۔تو میں منگل باجار سے۔۔‘‘

’’ بکواس بند کر۔۔‘‘ عاصمہ بیگم کی آواز اچانک اونچی ہوگئی۔

’’مہینہ کب ہوا تھا۔۔تاریخ بتا۔‘‘ انہوں نے آواز دھیما کرنے کی شعوری کوشش کی۔

’’او۔۔مہینہ۔۔جس دن مین صاب آپ سے بولی تھی نا۔۔آج باجار سے سودا مے لائے گی۔۔میرے کو نیپکی (نیپکن) لانا ہے۔۔اس کا دوسرا دن ہوئی تھی۔۔‘‘

’’تاریخ بھی تو ہوگی نا کچھ ۔۔‘‘

’’میرے کو یاد نہیں مگر بہت دن ہوگیا۔۔‘‘

عاصمہ بیگم نے ذہن پر زور دیا۔ وہ اس دن اپنے بڑے بیٹے کی دوست کو دوپہر کا کھانا کھلانے میریڈئن لے گئی تھیں۔لوٹنے پر غالباً اسی دن سندری نے نیپکن لانے کی بات کہی تھی۔مگر وہ اسے دوبارلے گئی تھی۔ایک بار بیٹے کے کہنے سے دوسری دفعہ خود عاصمہ بیگم کا دل اس سے ملنے کو چاہا تھا کہ اسکے گھر میں بیٹی کی کمی کے احساس نے اس کے دل میں ہمیشہ کسی بیٹی جیسے تعلّق کی خواہش کو سیراب کیا تھا ۔

جب انہوں نے دیبا کے لئے اپنے سنگھاردان سے نازک سی زنجیر والا پینڈنٹ اور اس سے ملتے جلتے کرن پھول ڈھونڈ کر پرس میں رکھے تھے۔عاصمہ بیگم کو دیبا کا نازک سا گلا یاد آگیا جس پر ہوٹیل میریڈین کے ریستوراں میں بیس سے بھی کم سیلسیس پر ٹھہرے ہوئے درجہءحرارت میں پسینے کی بوندیں چمک اٹھی تھیں۔بے سبب ہی۔۔اسے کیا معلوم کہ۔۔۔۔

عاصمہ بیگم کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہی تھی کہ انہیں موجودہ حالات کی نزاکت کا تیزی اور شدّت سے احساس ہوا۔انہوں نے سر جھٹک کر سندری کو دیکھا۔

’’کیا کروں اب بتا۔۔سوائے اس کے کہ تمہیں تمہارے گھر بھیج دوں۔۔‘‘ کچھ دیر فضا پر خاموشی طاری رہی۔

’’مگر تم پریگنینٹ ہو بھی یا ۔۔۔‘‘

’’کیا مین صاب۔۔‘‘

’’کچھ نہیں۔۔تم۔۔تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔‘‘

عاصمہ بیگم فرش کی طرف دیکھتی رہیں، اسی مقام پر بیٹھی بیٹھی، کتنی ہی دیر تک۔

بڑا بیٹا جوان ہوگیا تھا۔۔دوسرے کا قد بھی نکل آیا تھا۔۔شوہر بھی خیر سے جوان لگتے ہیں۔۔ سچ مچ امید سے ہوئی کمبخت تو۔۔لوگ۔۔۔جانے کیا سوچیں گے۔۔چمن کل چھٹی مانگ رہا تھا۔۔اور دو مہینے کی تنخواہ بھی۔۔ایک مہینے کی تنخواہ پلیسمنٹ والا لے گیا۔۔

سرخ کنارے اور قوس وقزح رنگ کے مہین پھولوں والے کشمیری ریشمی قالین کے درمیان سمندر جیسے نیلے رنگ کی زمین پر بنی گہری سبز بیل پر بیٹھی خوش رنگ بلبل کے تاج پر سے نظریں ہٹا کر عاصمہ بیگم نے دریچے سے باہر نظریں گاڑ دیں۔ ہرے ہرے درخت کے گھنے پتوں میں اٹکی ایک پھٹی ہوئی پتنگ بہت بری لگ رہی تھی۔

بھاگ ہی نہ جائے کہیں مردود پیسے ملتے ہی۔۔اور ۔۔ یہ لڑکی۔۔ بھاڑ میں جائے بے شرم۔۔دفع کردوں گی اس کو بھی۔۔ کیا کیا گل کھلاتی رہی اور ہم۔۔ہم ہیں کہ۔۔۔بے وقوف بنتے رہے۔۔گاؤں میں کرے ان کالی کرتوتوں کی نمائش۔۔ بے حیا کہیں کی۔۔سلمان صاحب سے سب کہنا پڑے گا۔۔ہاں۔

عاصمہ بیگم نے کچھ مطمئن ہوکر کھڑکی سے نظریں ہٹالیں۔اور دو صوفوں کے درمیان شیر کے پاؤں کی ساخت کے پایوں والی پتھر کی میز پر رکھا کرسٹل کے شفاف کانچ کا بنا چوکڑیاں بھرتا ہرن ہاتھ میں لے لیا۔

۔۔۔مگر سوتیلی ماں۔۔اس کا جینا اور مشکل کردے گی۔اسے سارے گاؤں میں بدنام کرے گی۔۔اسے کسی نے سمجھایا ہی نہ ہوگا۔۔اچھا برا کیا ہے۔ ۔ماں ہی جب۔۔اور سوتیلی ماں، کھانا اپنی مرضی سے نکالنے پر کڑچھی سے مارنے والی، اسے کھلے عام مارنے کا جواز حاصل کرلے گی۔۔اسے اس کے باپ کے سامنے ذلیل کرے گی۔۔گاؤں میں جانے کیسے اس کا حمل گرایا جائے گا۔۔ان چاہا حمل۔۔سوتیلی بیٹی کا۔۔کسی بھی سستی سی ناتجربہ کاردائیہ سے۔۔اس کا جانے کتنا خون بہہ جائے گا۔لاپرواہی ہوجائے گی ۔۔زیادہ بہہ گیا تو۔۔۔

شادی کے دو ماہ بعد خود اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا اس کی ڈاکٹر نے کہ شاید اس سے اس کی امید ٹوٹنے سے بچ جائے۔۔اور وہ کم عمری کے باعث ناداں اور بلاوجہ شرم کے سبب خاموش بستر پر پڑی رہی۔امید تو جاتی رہی ،نسوں سے بھی خون نچڑتا گیا۔ربر کے دبیز بیس انچی گدّے سے ہوتا جب پلنگ کے تختے کو نم کرچکا تو اسے اچانک محسوس ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ برف ہوگئے ہیں۔امید کے دنوں میں اس کے پیر ٹھنڈے رہا ہی کرتے تھے۔معاً اسے خیال آیا تھا کہ کچھ غلط ہورہا ہے۔ہسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ اللہ کو پیاری ہونے ہی والی تھی۔

جب اس پر۔۔شہر کی سب سے مشہور ڈاکٹر کی نگرانی میں یہ ستم ہوسکتا تھا تو۔۔کہ امید ختم ہونے کے ساتھ جینے کی امید بھی ختم ہونے کو تھی۔۔تو۔۔اس۔۔اس غریب کا کیا ہوگا۔۔اسے تو نجات مطلوب ہے اس سے۔۔ جانے کتنا خون بہہ جانے کے بعد یا جب بھی اسکے جسم سے الگ نہ ہوتو۔۔جب تک، کہ ماہر ہاتھوں سے اُسے

الگ نہ کیا جائے۔۔اور ماہر ہاتھ۔۔اس کے نصیب میں۔۔

باورچی خانے سے زور زور سے برتن دھوئے جانے کی آواز آرہی تھی۔

عاصمہ بیگم باورچی خانے کی طرف گئیں۔

’’ سندری۔۔میں نے سوچ لیا ہے۔۔‘‘

’’جی مین صاب۔۔‘‘ اس کی تشویش ناک سی اداس آواز ابھری۔ا س نے پلٹ کرنہیں دیکھا۔

’’اوہ۔۔ادھر تو دیکھ۔۔رو رہی ہے تو کیا۔۔‘‘

’’مے کیا کروں گا جی۔۔میرے کو گاؤں والا لوگ۔۔‘‘ وہ ہچکیاں لینے لگی۔

’’ارے پاگل میں تھوڑے ہی بھیجوں گی اس حال میں تجھے گاؤں۔۔جو ہوگا دیکھیں گے۔۔تم فکر نہ کرو۔۔میں خود دیکھتی ہوں۔۔ابھی تو تمہیں دنوں کے بارے میں ہی کنفیوژن ہے۔۔‘‘ عاصمہ بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا تھا مگر ایسا نہیں کیا۔

’’چار دن اور نہیں ہوا تو میں ہسپتال لے جا کر تمہارا یورین ٹیسٹ کرواؤں گی۔میرے خیال سے ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا ہے۔۔بھوک تو لگتی ہے نا اچھے سے۔۔‘‘

’’ہا جی ۔۔لگتا ہے۔۔‘‘

’’اور متلی وغیرہ۔۔ابکائی۔۔؟‘‘

’’نا، جی۔۔‘‘

’’بس باقی اوپر والے پہ چھوڑ دو۔اور مجھ پر بھروسہ رکھو۔اب جو ہونا تھا ہو چکا۔۔اس۔اس مصیبت میں تمہیں۔۔‘‘ وہ اسے دیکھتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولیں۔

’’اکیلے نہیں چھوڑیں گے تجھ کو۔۔‘‘

سندری نے رضامندی میں گردن کو خم دیا۔

عاصمہ بیگم کمرے میں لوٹ آئیں۔

لے کر۔۔کیسے جاؤں گی ہسپتال اسے۔۔سکینڈل بن سکتا ہے۔۔اس بات کا۔۔اکیلے بھیجوں۔۔راستے کہاں آتے ہیں اسے۔۔ڈرائیور کے ساتھ بھیج دوں اسے۔۔کوئی جرم تو رہا نہیں اب۔۔اب۔۔اب تو لڑکیوں سے شادی کے بارے میں ہی پوچھتے ہیں نہ فی ٹس (foetus) کے باپ کے بارے میں۔۔قانوناً جائز قرار دے دیا گیا ہے ابیارشن۔۔

سلمان صاحب تھکے ہوئے لوٹے تھے۔ان سے بات کرنا مناسب بھی نہ تھا۔۔پریشان ہو جائیں گے۔۔ ان سے بات کرنا مناسب تھا بھی۔۔؟ پریشان کر دیں گے۔۔

اپنے بیتابانہ ردِّ عمل سے۔۔اس کی پریشانی میں بھی اضافہ کر دیں گے۔عاصمہ انہیں بے خیالی میں دیکھتی رہ گئی۔

رات عاصمہ بیگم سو تو گئیں مگر پریشان کن خوابوں نے انہیں اپنے نرغے میں لئے رکھا۔اور صبح کے تازہ خواب نے انہیں اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیا تھا۔ برآمدے میں پہنچ کر انہوں نے پلٹ کر سندری کی طرف دیکھا۔

وہ۔۔وہ دیکھ۔۔اِس گلی کے اُس طرف ۔۔جہاں سڑک نظر آرہی ہے نا۔۔؟ مدر ڈیری تک تو تُو جاتی ہی ہے ۔۔ادھر سے داہنی جانب جا کر چھوٹی سی سڑک سے بائیں اور مڑ جانا۔۔سامنے بالا جی ٹینٹ والے کا بڑا سا بورڈ لگا نظر آئے گا۔۔اس کے سامنے جہاں ننھے سے بچے کے منہ میں ڈاکٹر دوائی کی بوند ٹپکا رہا ہے نا۔۔ایک دم ادھر ہی ۔۔بس سیدھی اندر چلی جانا۔۔وہی سرکاری ہسپتال ہے۔۔دس منٹ کا ہی تو راستہ ہے ۔۔گھبرانا بالکل نہیں ۔۔میں۔۔‘‘ عاصمہ بیگم نے رخ اس کی طرف موڑا تو سندری ادھ کھلا منہ لئے ان سے کچھ کہنے کو بیقرار سی نظر آئی۔

’’ہوگئی میرے کو مین صاب۔۔‘‘ وہ سر ہلا کر مسکرائی۔

’’مطلب۔۔تو۔۔تیرا مطلب ہے کہ تُو۔۔‘‘ عاصمہ بیگم کے چہرے پر بے قراری مسکرانے لگی۔

’’ ہا جی ۔۔ مین صاب۔۔مہینہ ہوگئی میرے کو۔۔‘‘

’’کب۔۔؟‘‘ انہوں نے اس کے شانے تھام لئے۔

’’رات ہئی کو۔۔‘‘

’’سچ۔۔؟ شکر ہے۔عاصمہ بیگم نے آسمان کی طرف نظر ڈال کر واپس اس کی طرف دیکھا پھر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے رکھے اسے اپنے سے ذرا دور کھڑا کیا اور اس کے چہرے پر نظریں ٹھہرا دیں۔

’’اب دوبارہ ایسی غلطی مت کرنا۔۔نہیں تو میں تجھے سچ مچ ہی گاؤں بھیج دونگی۔۔‘‘

’’کسم کھاتا ہوں مین صاب۔۔اب نہی کروں گا۔۔‘‘ وہ مسکرائی۔

’’مین صاب چمن چلا گیا۔۔‘‘

’’ہاں۔۔کب۔۔؟‘‘

’’معلوم نہی۔۔۔مے سویرے جاگا تو کمرے میں نہیں تھا۔‘‘

’’تُو اس کے کمرے میں کیا لینے گئی تھی۔۔۔‘‘

’’گئی نہیں تھی۔۔کمرہ کھلا تھی تو۔۔نجر پڑ گیا۔۔سب سامان لے گیا۔۔‘‘ وہ بغیر کسی تاثر کے بولی۔

’’ابی سارا کام کھُدا ای کرنا پڑے گا۔۔‘‘

’’چلو۔۔بھاڑ میں جائے۔۔بدتمیز کہیں کا۔۔دوسرا آ جائے گا۔۔تجھے کیوں کرنا پڑے گا۔۔ایک دو دن کی بات ہے۔۔۔سارا کام تیرے بس کا نہیں اور بچّوں کے زیادہ تر کام کے لئے لڑکا ہے بھی ضروری۔۔۔۔خیر۔۔۔تُو ذرا ۔۔۔اُن لوگوں سے کہوں گی کوئی سمجھدار سا لڑکا بھیجیں اور۔۔۔تُو بھی ۔۔ ۔۔۔۔‘‘

اور دوسرے دن سمجھدار لڑکا آ گیا۔

''مین صاب وہ آ گیا۔۔'' دروازے کی گھنٹی سن کر سندری نے اسے گھریلو ملازمین مہیا کرنے والے شخص کے ساتھ دیکھا تو دوڑتی ہوئی آئی۔ ''درواجا کھول دوں مین صاب۔۔؟''

''ہاں۔۔ہاں کھول دے نا۔۔''

لڑکا دیکھنے میں پہلے تینوں سے بہتر تھا۔فیشن کے مطابق اس نے بال بھی بڑھا رکھے تھے۔عاصمہ بیگم نے لڑکے کی طرف سے نظر ہٹا کر سندری کی جانب دیکھا جو مبہوت سی اسے دیکھ رہی تھی۔وہ سامان رکھنے پچھواڑے کی طرف گیا تو سندری مسکراتی ہوئی باورچی خانے کو پلٹی۔اور عاصمہ بیگم اس کے پیچھے پیچھے اندر آئیں۔

'' کام کرنے والا نہیں لگتا نا مین صاب۔۔؟ بھیّا لوگ اور ان کا دوست جیسا لگتا ہے نا۔۔'' وہ فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے بولی۔

''اب جو بھی ہے سندری۔۔تُو خدا کے لئے باز آ جا۔۔اس کو بخش دے۔۔ورنہ سچ مچ میں اب کے تجھے۔۔'' عاصمہ بیگم سمجھانے کے انداز میں بولیں تو سندری ہنسنے لگی اور اپنے دونوں کان پکڑ لئے۔

'' کان پکڑتا ہوں مین صاب۔۔۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور زور سے کان کھینچے۔عاصمہ بیگم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔وہ کان پکڑے پکڑے ہنسی۔عاصمہ بیگم اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہیں۔

اسکی معصوم سی ہنسی ۔۔نادان سی ہنسی۔۔۔ پرسکون سی۔۔بے خبر سی ہنسی۔۔

''نہیں سمجھی نا تُو۔۔دیکھ سندری۔۔ادھر دیکھ۔اب پلیز تُو۔کچھ مت کرنا'' عاصمہ بیگم کے چہرے پر التجا ہی التجا تھی۔

'' ہاتھ جوڑوں کیا۔۔؟'' عاصمہ بیگم نے ہاتھ جوڑ دئے۔

''نہی نہی مین صاب۔۔میں کسم کھاتا ہوں۔۔جس کا قسم مرجی لے لو۔۔'' وہ کان پکڑے بولتی رہی۔۔اور ہنستی رہی عاصمہ کے جڑے ہاتھ دیکھ کر بھی اس کی ہنسی نہیں رکی تھی مگر آنکھیں کچھ پھیل گئی تھیں۔

ایک آنکھ کا رخ داہنی جانب تھا اور دوسری کا بائیں اور۔

''نہ نہ مین صاب۔۔ایسا مت کرو۔۔مے سچ مچ سے کسم کھاتا ہوں'' وہ عاصمہ کے ہاتھوں کو دیکھتی ہوئی بولی۔

''میں بھگوان کا کسم کھاتا ہوں مین صاب! میں اپنا مرا ہوا ماں کا کسم کھاتا ہوں مین صاب۔اب ایسا نہی کروں گا''

اس نے قہقہوں کے درمیان رک رک کر کہا۔اور بڑے ہی خلوص سے عاصمہ بیگم کو دیکھتے ہوئے اس نے نہائت عاجزی سے گردن کو خم دیا اور ایک قدم ان کی طرف بڑھی۔

''مے۔۔مے۔۔آپ کا کسم کھاتا ہوں مین صاب۔۔آپ میرے کو ماف کر دو۔۔'' اس نے دھیمی سی آواز میں کہا اور مسکراتی رہی۔عاصمہ بیگم نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

افسانہ (پشتو ادب سے انتخاب)

اجمل اند (کابل)

ترجمہ: عبدالہادی حیران

بریکنگ نیوز

سارا راستہ وہ بوڑھا آدمی میری آنکھوں کے سامنے رہا جس کا گریبان چاک اور داڑھی نسوار سے لتھڑی ہوئی تھی۔وہ بار بار مجھے پکار رہا تھا۔'' دیکھئے جناب۔۔۔میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔۔۔وہ کالے رنگ کی گاڑی تھی۔۔۔سرکاری گاڑی تھی۔۔۔میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔۔۔گاڑی کے شیشے بھی کالے تھے۔۔۔میں۔۔۔نے۔۔۔۔''

پولیس والے اسے دھکے دے کر مجمع سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ ہماری طرف زور لگا رہا تھا۔وہ اپنی گلوگیر آواز میں کہہ رہا تھا ''صبح سویرے۔۔۔جب میں اپنی دکان کھولنے لگا تھا تو۔۔۔اس وقت اس کالی گاڑی سے یہ لاش پھینک دی گئی۔۔۔میں نے دیکھا۔۔۔وہ سرکاری لوگ تھے۔۔۔۔''

میں نے لوگوں سے یہ بھی سُنا کہ ''یہ بوڑھا آدمی یہاں موچی ہے''۔

میں اپنے صحافی دوست کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا اپنے دفتر کی طرف جا رہا تھا مگر اس دلخراش منظر نے میرے رونگھٹے کھڑے کر دیئے تھے۔سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کونسا غم اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ایک بیش بہا اور حسین جوانی کے لُٹ جانے کا غم یا اپنی ادھوری رپورٹ کا غم، جو جائے واردات تک جانے کے باوجود ادھوری تھی۔

وہ بوڑھا آدمی بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔لگتا تھا کہ اس کے پاس واقعہ کے بارے میں کافی معلومات ہیں جو میری رپورٹ کی تکمیل میں معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔میں نے بھرپور کوشش کی کہ اس کی تمام باتیں ریکارڈ کروں۔لیکن پولیس نے آنکھ جھپکتے ہی اسے وہاں سے غائب کرا دیا۔جب میں واپس لاش کے پاس آیا تو وہاں کئی دیگر صحافی بھی اپنے فوٹو گرافروں کے ساتھ کھڑے تھے۔معلوم ہوا کہ ہم اور پولیس بہ یک وقت جائے واردات پر پہنچے ہیں۔

لاش ایک جوان لڑکی کی تھی۔پولیس نے چہرہ دیکھ کر کہا کہ لاش کی شناخت چہرے سے ممکن نہیں ہے۔لاش پر پڑی ہوئی بوسیدہ چادر، جو اس موچی کی لگ رہی تھی، سے اس کے پاؤں باہر کو نکلے ہوئے تھے جس سے یہ اندازہ

لگانا آسان تھا کہ لڑکی کا قد کافی اونچا ہے۔اس کی برف جیسی سفید پنڈلیوں پر ضرب کے نشانات دکھائی دے رہے تھے جن کے اوپر خون کے دھبے سوکھ گئے تھے۔اس نے بلیورنگ کا کاؤبوائے پتلون پہن رکھا تھا۔پولیس کسی کو لاش کا چہرہ دیکھنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔نہ کسی کو لاش کے نزدیک جانے دے رہی تھی۔پولیس والے مسلسل ایمبولینس کو طلب کر رہے تھے۔اسی وقت پولیس کا ایک اعلیٰ افسر وہاں پہنچ گیا۔تمام صحافیوں نے اس کی طرف دوڑ لگادی۔اس نے صحافیوں کو اپنی طرف دوڑ لگاتے ہوئے دیکھ کر اپنے کوٹ پر ہاتھ پھیرا اور پوز کے انداز میں کھڑا ہوگیا تاکہ ٹی وی پر تصویر خوبصورت آئے۔اس کے ساتھ ہی وہ بول پڑا۔''پلیز مجھے زیادہ تنگ نہ کیجئے۔۔۔پہلے ہمیں اپنی تحقیقات پوری کرنے دیجئے۔۔۔فی الحال ہمارے پاس بھی زیادہ معلومات نہیں۔۔۔''

''یہ جو لاش پڑی ہے اس کے بارے میں آپ کی معلومات کیا ہیں؟'' کسی نے اس کی وضاحت کے باوجود پوچھ لیا

''میں نے بتایا نا کہ ہمارے پاس زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اس علاقے کی ایک بیس سالہ لڑکی دو دن پہلے یونیورسٹی سے گھر جاتے ہوئے اغواء ہوگئی تھی۔۔۔ابتدائی تحقیقات کے مطابق ہوسکتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہو۔۔۔''

''تو کس نے اغواء کیا تھا اس لڑکی کو اور کیوں؟'' کسی نے پھر سوال داغا۔

''میں نے آپ کو کہہ دیا کہ زیادہ معلومات دستیاب نہیں۔۔۔۔تحقیقات ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔۔میں نے جو کہا یہ صرف اندازہ ہے۔۔۔۔۔۔اس سلسلے میں تحقیقات جاری ہیں۔۔۔۔بہت جلد ہم معلوم کرلیں گے۔۔۔۔''

اسی لمحے ایمبولینس بھی آ گیا۔لاش ایمبولینس میں رکھ دی گئی۔پولیس افسر بھی اپنی گاڑی کی طرف لپک گئے۔اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بھی صحافیوں کو اپنی وہی بات دہرادی۔

''زیادہ معلومات نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔تحقیقات جاری ہیں۔۔۔''

یہ سب باتیں یاد کرتے ہوئے مجھے اپنے چیف پر بہت غصہ آ گیا۔اس نے صبح سویرے ہی مجھے اس بے سروپا کیس میں پھنسا دیا۔آپ یقین کریں میں میدانِ جنگ سے رپورٹس دینے پر خوش ہوں مگر اس شہر کے کرائم رپورٹس سے میری جان نکلتی ہے۔۔۔۔۔یہاں کے واقعات انتہائی عجیب اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔یہ صرف میرا مسئلہ نہیں ہے۔بہت سخت دل لوگ بھی یہ واقعات دیکھ کر ماتم کرنے لگ جاتے ہیں!۔مگر مرتا کیا نہ کرتا۔اب یہ رپورٹ میرے ذمہ تھی۔کچھ بھی ہو اب مجھے یہ کام کرنا تھا۔

پاس بیٹھے ہوئے دوست نے پوچھا''کیوں اتنے پریشان ہو یار؟''

''پریشان کیوں نہ ہوں؟ ایک تو وہ واقعہ پریشان کرنے والا تھا اور دوسرا یہ کہ اب میں اس ادھوری رپورٹ سے ریڈیو کے لئے کیا تیار کروں؟ نہ لاش کی شناخت ہوسکی نہ واقعہ کے بارے کچھ معلوم ہوا۔اس بابا کی باتیں ایک عینی شاہد کے طور پر لی جاسکتی تھیں۔مگر یہ لڑکی کون تھی؟ کس نے اسے قتل کیا؟ کیوں اتنے دردناک طریقے سے اسے

مارا؟ ان تمام سوالوں کے جوابات نہیں۔۔۔۔جب تک یہ جوابات نہ ملے ہوں رپورٹ تیار نہیں ہوسکتی۔۔۔۔''

صحافی دوست، جو ایک اور خبری ادارے کے ساتھ کام کرتا ہے، نے اتفاق میں سر ہلا کر کہا

''ٹھیک کہا آپ نے۔اس پولیس افسر نے بھی کوئی کام کی بات نہیں کی''۔

''تو اب کیا کریں اس رپورٹ کے ساتھ؟''

''ہوووو، ایسا کرتے ہیں کہ تم اپنے دفتر جاؤ اور میں تھانہ جاتا ہوں۔پوسٹ مارٹم سے کوئی بات ہاتھ آ گئی تو تجھے فون کر کے بتادوں گا۔''

کچھ دیر بعد میں اپنے دفتر میں بیٹھا اس شہر کے مقدر پر سوچ رہا تھا۔آج کا واقعہ یہاں معمول کی بات ہے۔یہاں ہر روز ایسے کئی واقعات رونما ہوتے ہیں۔یہ زورآور لوگوں کا شہر ہے۔یہاں ایسے زورآور لوگ رہتے ہیں کہ جن کے پاس اسلحہ اور زور کی کوئی کمی نہیں ہے۔۔۔اور میری بدقسمتی دیکھو۔میں ایسے واقعات کی رپورٹوں سے دور بھاگتا ہوں۔وجہ یہ ہے کہ ایسے واقعات دیکھ کر میری کیفیت بدل جاتی ہے۔مگر آج پھنس گیا ہوں۔اب مجھے یہ رپورٹ تیار کرنی تھی۔تیار نہ کرتا تو چیف مجھے کسی اور مخمصے میں پھنسا دیتا۔میں انہی سوچوں میں گُم تھا کہ میرا موبائل بجنے لگا۔دوسری طرف میرا وہی صحافی دوست تھا۔وہ کہہ رہا تھا''میں نے معلوم کرلیا''

''مجھے جلدی جلدی بتاؤ''

''یہ وہی لڑکی ہے جو دو دن پہلے یونیورسٹی سے لاپتہ ہوگئی تھی''

''اسے قتل کس نے کیا ہے؟''

''پولیس افسر کہہ رہا ہے کہ اس کے خیال میں ڈاکوؤں کے ایک گروپ نے سرکاری گاڑی سے فائدہ اٹھا کر اسے اغوا اور پھر قتل کیا ہے''۔

''قاتل تو پھر بھی معلوم نہیں ہوسکے؟''

''انہیں تو ایک سال کی تحقیقات کے بعد بھی کوئی معلوم نہیں کرسکے گا''

''اُف۔۔۔تو میں رپورٹ میں کیا کہوں؟''

''رپورٹس میں روزانہ ہم کیا کہتے ہیں؟ تم نے کبھی یہ بھی سُنا ہے کہ قاتل پکڑے گئے ہیں؟''

''تو اَب میں کیا کروں؟''

''بس ایک رپورٹ تیار کرو۔اس میں پولیس کا حوالہ دیکر کہو کہ ڈاکوؤں کے ایک گروپ نے سرکاری گاڑی استعمال کر کے لڑکی کو اغواء اور پھر قتل کردیا ہے۔تحقیقات جاری ہیں''۔

''ویسے مجھے یہ تو بتاؤ کہ پوسٹ مارٹم کا نتیجہ کیا ہے کہ اسے کیوں قتل کیا گیا ہے؟''

''پوسٹ مارٹم کا نتیجہ یہ ہے کہ قتل کی گئی لڑکی کے ساتھ دو دن مسلسل اجتماعی زیادتی کی گئی ہے۔اور گزشتہ آدھی رات کو

اسے اذیتیں دے دے کر قتل کر دیا گیا ہے‘‘

’’بس بس۔۔۔شکریہ‘‘

موبائیل فون بند کر کے دیکھا تو چیف میرے پاس ہی کھڑا تھا۔اس نے فوراً پوچھا’’صبح والے کیس کا کیا بنا؟‘‘

’’وہ۔۔۔دو دن پہلے ایک لڑکی کو یونیورسٹی سے اغواء کیا گیا اور گزشتہ رات اسے قتل کر دیا گیا ہے‘‘

’’نہیں۔نہیں۔صبح تم کو شہر کے جنوبی علاقہ میں بھیجا تھا ایک کیس کی رپورٹ کے لئے۔اس کا کیا بنا؟‘‘

’’سر!۔۔وہی بتا رہا ہوں۔وہاں اس لڑکی کی لاش پھینک دی گئی تھی۔پولیس کا کہنا ہے کہ اغواء کاروں نے سرکاری گاڑی سے فائدہ اٹھا کر اسے اغواء اور اجتماعی زیادتی کے بعد قتل کیا ہے‘‘

’’اوہ۔۔۔یہ تو اتنا اہم واقعہ نہیں جس پر رپورٹ تیار کی جا سکے۔۔۔کوئی دوسرا موضوع ڈھونڈ لیتے ہیں۔۔۔‘‘

میں نے دل ہی دل میں اسے کئی گالیاں دیں’’اہم کیوں نہیں سر! میں نے لاش اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔پولیس رپورٹ ہے۔عینی شاہد ہے۔پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے۔لڑکی کے رشتہ داروں سے بات کی ہے۔۔۔‘‘

’’پاگل مت بنو۔۔۔وہی کرو جو کہتا ہوں۔۔ایسے واقعات تو روزانہ سینکڑوں ہوتے ہیں۔ہم ریڈیو کے لئے ہر چھوٹے چھوٹے واقعے پر تو رپورٹ نہیں بنا سکتے۔ان واقعات کی خبری اہمیت کوئی نہیں۔۔۔‘‘

’’اوکے سر! تو پھر کیا کروں؟‘‘

’’کوئی نئی خبر آئی تو اس پر کام کرو‘‘ یہ کہہ کر وہ دفتر سے نکلنے لگا۔مگر دروازے سے واپس میری طرف آ کر کہا،

’’ہاں۔۔ایک کام ہو سکتا ہے‘‘

مجھے اب اس پر بہت غصہ آ رہا تھا اس لئے’’سر‘‘ کے لفظ کے استعمال کے بغیر ہی کہا:’’کیا ہو سکتا ہے؟‘‘

’’اگر تم کل بھی اس پر کام کرو اور شہر میں گزشتہ ایک ہفتے میں ایسے واقعات پر ایک تفصیلی رپورٹ تیار کرو تو بات بن جائے گی‘‘

’’کوشش کر لوں گا‘‘ میں نے بے دلی سے کہا۔

’’اب کہیں نہیں جانا۔کوئی دوسرا مسئلہ پیدا ہو تو اسے تعقیب کرو۔ میں ایک کام سے چند منٹ کے لئے باہر جا رہا ہوں۔۔۔کوئی بات ہو تو فون کر لو‘‘۔اس کے نکل جانے کے بعد میں نے اپنا غصہ میز پر بکھرے ہوئے ان یادداشتوں کو پھاڑ ڈالنے پر نکالا جو میں نے اس رپورٹ کے سلسلے میں لکھی تھیں۔

’’عجیب بات ہے۔۔۔کہتا ہے اس کی خبری اہمیت نہیں ہے۔۔۔ایک چنار قد دوشیزہ جو یونیورسٹی کی طالبہ ہے دن دیہاڑے اغواء ہوئی ہے۔اس پر تشدد ہوا ہے۔وہ مسلسل دو دن اجتماعی زیادتی کا شکار ہوئی ہے۔اغوا کاروں نے اس واردات میں سرکاری گاڑی استعمال کی ہے۔یہ تو Breaking News ہے۔وہ کہتا ہے اس کی خبری اہمیت نہیں ہے۔۔۔خبری اہمیت پھر کس چیز کی ہے؟؟؟؟؟‘‘ایک ایک لمحہ گزرنے کے ساتھ میرا غصہ سر کو چڑھ رہا تھا۔

اچانک میرا خیال اس طرف گیا جس طرف عموماً ایسے حالات میں جاتا ہے۔ یعنی میں انٹرنیٹ پر جاب سرچ میں لگ گیا۔جب بھی میں کام سے بور ہو جاتا ہوں تو انٹرنیٹ پر جاب سرچ کرتا ہوں کہ شاید کوئی موزوں جاب مل جائے۔اگرچہ مجھے کبھی بھی انٹرنیٹ جاب سرچ سے کوئی جاب ملی نہیں ہے۔

میں تھوڑی دیر اسی کام میں مگن تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف چیف کی آواز تھی،

’’جی سر!‘‘

’’سنو ایک ارجنٹ خبر ہے‘‘

’’اچھا سر!‘‘

’’اپنا ای میل چیک کرو۔صدر صاحب کے دفتر سے ایک پریس ریلیز جاری ہوا ہے۔وہ تم کو ای میل کر دیا گیا ہے‘‘

’’پریس ریلیز کس بارے میں ہے سر!‘‘

’’دو وزیروں کو ہٹا دیا گیا ہے‘‘

’’دو وزیر۔۔۔۔؟‘‘

’’ہاں۔ہاں۔جلدی کرو۔۔۔اس سے ایک مختصر رپورٹ لکھ کر Breaking News کے طور پر Live سناؤ‘‘

’’اوکے سر!‘‘ میں نے فوراً ای میل چیک کیا۔پریس ریلیز پڑھا تو سمجھا کہ بات اہم ہے۔دو وزیروں کو ہٹا دیا گیا تھا اور ان کی جگہ نئی تقرریاں بھی کر دی گئیں تھیں۔فوراً ایک مختصر رپورٹ تیار کی اور اسٹوڈیو جا کر انتہائی تیزی کے ساتھ Live نشر کی تاکہ ہم سے کوئی آگے نہ ہو جائے۔جب رپورٹ نشر ہو چکی اور میں واپس اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا تو فون کی گھنٹی انتہائی بے صبری کے ساتھ بج رہی تھی۔دوڑ کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے چیف اپنی موٹی آواز میں دھاڑ رہا تھا:’’یہ تم نے ریڈیو پر کیا بکواس کی؟‘‘

’’سرررررر!۔۔۔و۔۔ہی۔۔۔پریس ریلیز۔۔۔‘‘

’’وزیروں کو کرپشن کی وجہ سے ہٹا دیا گیا ہے۔۔۔انہوں نے کوئی قتل نہیں کیا ہے‘‘

’’نہیں سر! میں نے تو قتل کی کوئی بات نہیں کی۔۔۔۔میں نے کرپشن کا۔۔۔۔‘‘

’’تم نے قتل کہا۔۔۔اور۔۔۔دوسرا جو بکواس تم نے کیا اس کی کیا ضرورت تھی؟۔۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں سر!۔۔۔میں نے تو وہی کہا جو پریس ریلیز میں تھا‘‘

’’ابھی آتا ہوں میں۔۔۔وہیں تمہیں سمجھا دوں گا‘‘ اور فون بند ہو گیا۔

میں نے ایک بار پھر صدر صاحب کے دفتر سے ای میل کیا گیا پریس ریلیز غور سے پڑھا۔اس میں کہا گیا تھا کہ دو وزیروں کو کرپشن کی وجہ سے ہٹا دیا گیا ہے۔پھر کمپیوٹر میں اپنی ٹائپ کی ہوئی خبر پڑھنے لگا تو مجھے لگا جیسے مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہو۔میں نے لکھا تھا:’’افغانستان کے صدر نے آج ایک صدارتی فرمان کے ذریعے دو وزیروں کو قتل

کے الزام کی وجہ سے اپنے عہدوں سے برطرف کر دیا ہے۔ جناب صدر نے یہ اقدام ایسے وقت میں اٹھایا ہے کہ آج صبح سویرے شہر کے جنوب میں ایک بیس سالہ طالبہ کی لاش پڑی ہوئی ملی جسے دو دن پہلے یونیورسٹی سے گھر جاتے ہوئے سرکاری گاڑی میں اغواء کیا گیا تھا۔ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کے ساتھ دو دن مسلسل اجتماعی زیادتی کی گئی ہے اور پھر اسے اذیتیں دے کر مارا گیا ہے''۔

میں نے چیف کے آنے تک یہ خبر کئی دفعہ پڑھی مگر سمجھ پھر بھی نہیں آئی کہ یہ میں نے کیسے لکھ دیا۔ بے شک یہ اس ریڈیو میں میری آخری خبر تھی۔

''عالمِ اسلام کی مجموعی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے اگر سعودی عرب اور پاکستان کی حکومتوں (عرب وعجم) کو مثالی نمونے مان لیا جائے تو اس سے صورتحال کافی حد تک واضح ہو سکتی ہے۔ان دونوں ملکوں کے معاملات میں زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں صرف سامنے کے دو محکموں کی کارکردگی سے ہی بہت کچھ سمجھ میں آجاتا ہے ۔دونوں ملکوں کا ٹریفک کا نظام اور دونوں ملکوں کی پولیس کا نظام ۔۔دونوں نظام مل کر نظامِ حکومت کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔دونوں ملکوں کی ٹریفک کا نظام افراتفری اور نفسا نفسی کا مظہر ہے جبکہ پولیس کے دو کام ہیں ایک حکمرانوں کے ذاتی اقتدار کا مکمل تحفظ اور دوسرا اپنے ہی عوام کی تذلیل۔۔۔۔۔۔۔۔۔قانون کی حکمرانی کے لمبے چوڑے دعوے تو موجود ہیں لیکن عملاً ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ان کے برعکس امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی پولیس اور ٹریفک کے دو محکموں کی کارکردگی سے ہی ان سارے ممالک کی مجموعی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔قانون کی خلاف ورزی کوئی بڑے سے بڑا اعلیٰ عہدیدار کرے اسے اسی طرح قانونی کاروائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے کسی بھی عام شہری کو کرنا پڑتا ہے۔ان ملکوں کی پولیس کے پاس بے پناہ اختیارات ہیں لیکن ان کی پولیس کا عمومی رویہ قانون کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنا ہی ہے۔اسی لئے کسی بھی عام شہری کو کسی پولیس مین یا ان کے اعلیٰ افسر سے بات کرتے ہوئے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

امریکہ نے تیسری دنیا یا اسلامی دنیا کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے، وہ سب اپنی جگہ لیکن خود اپنے شہریوں کے ساتھ اس کا رویہ ان کی عزت نفس کا احترام کرنے کا ہی نہیں بلکہ ان کی عزت نفس کی حفاظت کرنے کا بھی ہے۔اس ایک بنیادی فرق سے ہی اسلامی ملکوں کے حکمرانوں اور اور مغربی دنیا کے حکمرانوں کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔''

(**حیدر قریشی** کی کتاب **منظر اور پس منظر** کے آخری کالم سے اقتباس

صفحہ نمبر ۱۲۰، ۱۲۱، کالم مطبوعہ ۱۸ر نومبر ۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر بلند اقبال (کینڈا)

اندھا فرشتہ

محبت ۔۔بس امر بیل کی طرح ہوتی ہے۔کبھی دھیمے سے دل کی منڈیروں پر چڑھ جاتی ہے تو کبھی چپکے سے کواڑوں میں اُلجھ جاتی ہے۔کبھی چاندنی راتوں میں چاند سے شرما جاتی ہے تو کبھی شبنم کے قطروں کی طرح پتیوں کے دل میں سمٹ جاتی ہے۔محبت ۔۔بس تتلیوں کے رنگوں کی طرح ہوتی ہے۔کبھی بنفشی تو کبھی سُرمئی، کبھی عُنابی تو کبھی زعفرانی۔۔جیسے پھولوں کے بوسوں سے تتلیوں کے کنوارے بدن پر سہاگن کے رنگوں کی طرح۔اور نہیں تو پھر محبت ۔۔کسی حسین مورنی کی طرح ہوتی ہے جیسے خانم بیگم کی محبت، چاندی کے پازیب باندھے چھن چھنا چھن قاسم میاں کے دل کے نہاں خانوں میں ناچ رہی تھی۔

مگر جسم کیا جانے تتلیوں کے کیا خواب ہوتے ہیں؟ ست رنگی کرنوں میں چھپے ہوئے کون سے آفتاب ہوتے ہیں؟ تو خانم بیگم کی بنجر زمین میں بھی پھول کھل نہ سکے اور لمس، جنس کی لذت سے آشنا ہو کر بھی تتلیوں کے خواب بُن نہ سکے۔۔خانم بیگم اجڑی کوکھ کے غم میں ساری عمر اشکبار ہی رہیں مگر قاسم میاں اپنے دل کے آبگینوں میں اُن کی محبت کی چاندنی میں سرشار رہے۔مگر جسموں کی تو عمر ہوا کرتی ہے۔وہ کب محبت کی طرح وقت کے پنجرے سے آزاد ہوا کرتے ہیں؟ تو پھر وقت چپکے چپکے گزرتا رہا اور قاسم میاں کے بالوں میں سفیدی اور خانم بیگم کی آنکھوں میں اُداسی بھرتا رہا۔ بالآخر ایک رات ایسی آندھی چلی کہ قاسم میاں کے دل کے چراغ بجھتے چلے گئے اور پھر وہ سیاہ رات آئی کہ اُس گھپ اندھیرے سے چاند سورج بھی پناہ مانگنے لگے۔

خانم بیگم کو اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

کچھ دنوں تک تو قاسم میاں بے بس نگاہوں سے زمین کو تکتے رہے اور جب کوئی جواب نہ ملا تو آسمان کو دیکھ کر بلک بلک کر رو دیے۔غم اشک بن جائے تو دوا ہو جاتا ہے اور اگر درد بن جائے تو سوا ہو جاتا ہے۔قاسم میاں خانم بیگم کی یاد میں ایسے روئے کہ اپنی بینائی ہی کھو بیٹھے۔عزیز و اقارب قاسم میاں سے منت سماجت کرتے تھے۔ اُنہیں اپنے ساتھ رہنے پر راضی کرتے تھے مگر قاسم میاں اپنے گھر کی دیواروں سے جُڑے بیٹھے تھے۔ بالآخر عزیز و اقارب نے تنگ آ کر اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب خالی گھر میں قاسم میاں دیواروں سے باتیں کرتے تھے۔کبھی زمین تو کبھی آسمانوں سے باتیں کرتے

تھے۔بس ایک ہی آرزو میں جیتے تھے کہ کبھی خانم بیگم اُن کے پاس آئیں گی اور وہ اُن کے دکھڑے اپنے آنسوؤں سے دھوئیں گے۔تو ایک رات وہ محبت کے مارے نابینا بوڑھے کے خواب میں آہی گئیں۔

اماوس کی اُس سیاہ رات میں جب چاند بادلوں کی اوٹ میں بھی نہ تھا، قاسم میاں کے دل کے نہاں خانوں میں محبت کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔محبت۔۔وہ کب وقت کی محتاج ہوتی ہے۔وہ تو لمحے بھر میں دل کی منڈیروں اور کواڑوں پر امر بیل کی طرح پھیل جاتی ہے۔خانم بیگم نے پیار سے اپنے ہونٹوں کو قاسم میاں کے اشکوں سے نم کر لیا۔اور اُن کی نابینا آنکھوں کو محبت سے چوم لیا۔پھر دھیمے سے کہنے لگی۔۔دیکھو نا! مجھے دیکھنے کے لیے تو تمھیں بینائی نہیں چاہیے۔اور سنو جی۔۔تمھیں پتہ ہے نا؟۔۔۔

وہاں ساری حوریں بانجھ ہیں۔۔میری طرح

اور سارے فرشتے خدا کی محبت میں اندھے ہیں۔۔تمھاری طرح۔

میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے اس سے پہلے ایک دفعہ میں اپنے وقت سے پچاس برس پہلے آیا تھا اور جب پچاس برس بعد میں دوبارہ آیا تھا تو میں نے یہ دیکھا تھا کہ میں اپنے وقت سے ایک صدی پہلے آ گیا ہوں....پھر جب میں ایک صدی بعد آیا تو میری آمد اپنے وقت سے دوسو سال پہلے تھی۔اور جب میں دوسو سال بعد آیا تو میری آمد میں چارسو سال رہتے تھے اور پھر جب میں چارسو سال بعد آیا تو میں اپنے وقت سے آٹھ سو سال پہلے آیا ہوا تھا۔اور اب جب میں آٹھ سو سال بعد آیا ہوں تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو سال پہلے آ گیا ہوں۔

میں جو روشنی کی بشارت ہوں۔ ہر لحظہ اس دنیا سے دور ہو رہا ہوں وہ کون سی صفر مدّت ہے۔جس میں یہ تمام صدیاں اور زمانے سمٹ آئیں گے اور میری آمد قبل از وقت نہ ہوگی۔ وہ صفر مدّت جب انسان نور کا انکار کر کے آگ کی بھینٹ نہیں چڑھے گا۔ مجھے اس مدّت کا انتظار کرنا ہوگا۔

اب جب میں سولہ سو برس کے بعد آؤں گا تو میری آمد میں بتیس سو سال رہتے ہوں گے۔اور جب میں بتیس سو سال بعد آؤں گا تو میری آمد میں چونسٹھ سو سال رہتے ہوں گے۔اور اسی طرح کئی ہزار برس بیت جائیں گے۔لیکن وہ صفر مدت کب آئے گی جب میرا آنا بروقت ہوگا۔اور جب میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورج سوا نیزے کی اَنی پر آ جائیں گے۔تب کوئی انکار کی جرأت نہ کر سکے گا۔میں اپنے گزرے ہوئے اور آنے والے برسوں کا بوجھ اپنی روح پر اٹھائے پھر شہر میں آتا ہوں۔شہر کے سب سے بڑے بازار میں پہنچ کر میں اعلان کرتا ہوں: ''لوگو! تم نے میری بشارت پر ایمان نہ لا کر خود کو روشنی سے محروم کر لیا ہے...''

(افسانہ **روشنی کی بشارت** از **حیدر قریشی** سے اقتباس)

حیدر قریشی (جرمنی)

کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار

یہ ایسے کہانی کار کا قصہ ہے جس کے سامنے کہانیاں بار بار آتی ہیں کہ وہ انہیں اپنا تخلیقی لمس عطا کر کے ادبی دنیا کے سامنے پیش کرے لیکن کہانی کار ان کہانیوں سے بھاگا پھر رہا ہے۔اتنی ساری کہانیاں جو اس کا ایک نیا افسانوی مجموعہ تیار کر دیں۔ یہ کہانی کار صحافیانہ طرز کے افسانے اور ناول لکھنے والا ہوتا تو اب تک ایسی ہر کہانی کی دو دو تین تین کہانیاں بنا کر دو تین مجموعے چھپوا چکا ہوتا۔دراصل کہانی کار کی جان ایک کہانی میں اٹکی ہوئی تھی اور وہ کہانی پوری طرح اس کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔بس فلمی عشق جیسی سچوئیشن ہو رہی تھی، جو کہانیاں کہانی کار کے پیچھے تھیں، وہ انہیں لفٹ نہیں کرا رہا تھا اور وہ جس کہانی کے تعاقب میں تھا وہ ٹھیک سے اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

کہانی کار جس کہانی کے تعاقب میں تھا وہ دراصل ایٹمی جنگ کے بعد کی فضا کے موضوع سے متعلق تھی۔ایٹمی جنگ کے بعد چند انسان روئے زمین پر کسی طرح بچ گئے تھے اور بدقسمتی سے وہ سب الگ الگ مذاہب اور الگ الگ فرقوں کے لوگ تھے۔پانی کے عظیم طوفان، طوفانِ نوح میں اچھے اچھے جوڑوں کو کشتی میں محفوظ کر کے بچا لیا گیا تھا تا کہ دنیا کو اس کے گناہوں کی سزا دینے کے بعد پھر سے زندگی سے لبریز کیا جا سکے۔لیکن یہ کہانی جو کہانی کار کے قابو میں نہیں آ رہی، اس میں پانی کے طوفان سے زیادہ بڑا اور ہولناک ایٹمی طوفان آ چکا ہے۔اتنی ترقی یافتہ اور ہنستی بستی دنیا پتھر کے زمانے میں چلی گئی ہے لیکن پتھر کے زمانے جیسی بے خبری سے بھی محروم ہو چکی ہے۔ پہلے پہل زندہ بچنے والے ایک فرقے کے فرد نے جب دیکھا کہ وہ زندہ بچ گیا ہے تو اُس نے اسے اپنے مسلک کی سچائی قرار دے کر خود کو خدا کا پسندیدہ بندہ سمجھ لیا۔لیکن جب معلوم ہوا کہ ایسے کتنے ہی ''خدا کے پسندیدہ بندے'' بچ گئے ہیں اور وہ سب کے سب متحارب مذاہب اور فرقوں کے افراد ہیں تو پھر ان سب کے درمیان مذہبی مخاصمت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔سب ہی خدا کے نیک بندے ہیں اور سب ہی ایک دوسرے کی تکفیر و تکذیب کر کے اپنی صداقت کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔اتنے بڑے پیمانے پر ہو جانے والی انسانی تباہی اور ساری دنیاوی ترقیات کے خاتمہ کی بھی ان لوگوں کو پرواہ نہیں ہے اور اب بھی یہ سارے بچے کھچے مذہبی لوگ ایک

دوسرے کے خلاف اپنا اپنا زہر اگل رہے ہیں۔ایک دوسرے کی تکفیر و تکذیب کر رہے ہیں۔

کہانی کار جو ہمیشہ سے اس دھرتی پر انسانوں کے کے رہنے کی تمنا کیا کرتا تھا،اس منظر پر حیرت زدہ ہے اور سارے فرقہ پرستوں کی پرانی متعصّبانہ روش سے تنگ آ کر دھرتی سے انسانوں کے مکمل خاتمہ کی دعا کرنا چاہتا ہے لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہی کہ کہانی کو کیسے مکمل کرے۔کیا بددعا پر کہانی کو ختم کیا جائے یا پھر کوئی آسمانی آفت لا کر سارے بچے کھچے متعصب انسانوں کو ختم کیا جائے۔اگر آسمانی آفت لائی جائے تو کیسی ہو؟ کہانی کار ابھی تک اس مسئلے میں الجھا ہوا ہے اور کہانی اسی وجہ سے اس کے قابو میں نہیں آ رہی۔

جو ڈھیر ساری کہانیاں کہانی کار کے پیچھے پڑی رہتی ہیں ان میں سے کئی واقعی بڑی عمدہ کہانیاں ہیں۔کہانی کار اپنے مخصوص انداز کے ساتھ انہیں بہترین کہانیوں کا روپ دے سکتا ہے لیکن اس کا دل تو اسی کہانی میں اٹکا ہوا ہے۔

ایک اولڈ ہوم میں ملازمت کے باعث کہانی کار کو اولڈ ہوم کے ہر کردار میں ایک جاندار کہانی ملتی ہے۔Frau Wells جب اس ہوم میں آئی تھی تو پوری طرح باہوش و حواس تھی۔چلنے پھرنے،اٹھنے بیٹھنے،کھانے پینے میں ایک وقار جھلکتا تھا۔چند دنوں کے بعد ہی اس کی ذہنی حالت متغیر ہوگئی۔ایسے لگتا جیسے کوئی کوما کی حالت میں چل رہا ہو۔Frau Bongers تو جب ہوم میں آئی تب ہی سے گمشدہ دکھائی دی۔Frau Olbrisch ,Frau Voss, اور Frau Hoppe کی سوئیاں جیسے اپنی اپنی زندگی کی کسی ایک ہی جگہ پر اٹکی ہوئی تھیں۔فراؤ اول برِش وقفے وقفے سے بی بی مریم اور یوسف (نجار) کے رشتے پر کچھ ایسی بات کرتی کہ کچھ سننے والے ہنس پڑتے اور کچھ خاموشی میں ہی عافیت سمجھتے۔کہانی کار بھی کبھی اس کے اسٹیریو ٹائپ جملے پر ہنس پڑتا اور کبھی بیزاری کی حد تک بیگانگی محسوس کرتا۔ایک بار یونہی اسے خیال آیا کہ اگر فراؤ اول برش اس کے پرانے وطن میں ہوتی اور وہاں ایسی یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات کہتی تو اس کی غیر حاضر دماغی کے باوجود اور پچانوے سالہ عمر کے باوجود وہاں کے دینی غیور حضرات اسے ہلاک کر کے ثواب کما چکے ہوتے۔فراؤ فوس کی سوئی بھی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔وہ تین الفاظ باری باری بولتی اور بولتی ہی رہتی۔Bitte mal kommen, hallo, aua..(براہِ کرم ادھر آؤ،ہیلو،ہائے مجھے تکلیف ہو رہی ہے)یا پھر Hilfe کی صدا لگا کر مدد کے لئے پکارتی۔کئی بار ایسا ہوا کہ کہانی کار خود اس کی پہلی صدا پر اس کے پاس پہنچا۔اس کی خیریت دریافت کی۔سب خیر ہے نا؟ پوچھا۔فراؤ فوس اس کے باوجود اپنے جملے دہراتی رہی۔تب کہانی کار نے اس کے پہلے تین الفاظ کو ردھم کی صورت میں گنگنانا شروع کر دیا۔بِٹّے مال کومِن ،ہلّو۔اوّا۔۔۔بِٹّے مال کومِن ،ہلّو۔اوّا۔۔۔فراؤ ہوپے کی سوئی بھی پہلے دن سے دو باتوں پر اٹک گئی۔میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور میں کہاں رہتی ہوں؟ جب بھی اسے کھانا دینے لگو وہ یہی کہتی کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔اور جب کھانا کھا لیتی تو پوچھنا شروع کر دیتی کہ میں کہاں رہتی ہوں۔ایک دو بوڑھیاں تو کبھی کبھار

کپڑوں سے بھی بے نیاز ہونے کی تگ و دو کرتیں۔وہ تو خدا بھلا کرے ان نرسوں کا جوان کی نیپیز اتنی کس کر باندھتی تھیں کہ اسٹرپ ٹیز کا آخری مرحلہ آنے کی نوبت نہیں آ پاتی تھی۔ورنہ اپنی لہر میں آئی ہوئی نوے سالہ بی بیوں کو کوئی روک نہ سکتا۔یہ سب گمشدہ لوگ تھے۔اپنے آپ سے اور اپنے سارے پیاروں سے بچھڑے ہوئے لوگ۔ایسے پیاروں سے جو خود انہیں اس برزخ میں لا کر چھوڑ گئے تھے اور منتظر تھے کہ کب ان کی وفات کی خبر آئے اور وہ دل گرفتہ سے ان کی آخری رسومات کا فرض ادا کر کے اس فرض سے سبک دوش ہو سکیں۔

اسی اولڈ ہوم میں ہی زندہ دلی کی کئی کہانیاں بھی موجود تھیں۔Herr Wirth نے اپنی عمر بھر کی کمائی اپنی اکلوتی بیٹی کے نام کر دی تو وہ بہلا پھسلا کر باپ کو اولڈ ہوم میں داخل کرا گئی۔ہر وِرتھ تنومند بزرگ تھے۔دراز قد ہونے کے ساتھ جسم بھی تنا ہوا تھا لیکن بیٹی کے طرزِ عمل نے انہیں گہرا زخم لگایا تھا۔اولڈ ہوم میں جب jasica داخل ہوئی تو اس نے ہر وِرتھ کی میز کا انتخاب کر لیا۔ہوم کے ریستوران میں ان کی دوستی کی گہرائی کو ہر کوئی محسوس کر رہا تھا۔اس دوستی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہر وِرتھ اپنی بیٹی کے دیئے ہوئے دکھ کو بھول سے گئے اور نقصان یہ ہوا کہ وہ جیسیکا کی دوستی میں اس حد تک چلے گئے جس حد کی ان کی عمر اجازت نہیں دیتی تھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا سے ہی رخصت ہو گئے۔لیکن کہانی کار کا خیال ہے کہ اس نقصان میں بھی ان کا فائدہ ہی ہوا کہ دنیا کے ہر جھنجھٹ سے نجات پا گئے۔

Herr Rebsch،Frau Kruschel، Frau Meixner، Frau Muller اور کئی ایسے کردار جو وہیل چیئر پر ہوتے ہوئے بھی ہر وقت ہنستے اور ہنساتے رہتے ہیں۔فراؤ زالس گیبر بھی انہیں میں شامل ہے لیکن ایک دن پتہ نہیں اس بانوے سال کی خاتون کو کیا ہوا کہ بے ساختہ رونے لگ گئی۔جب اس سے رونے کا سبب پوچھا تو کہنے لگی کچھ نہیں بس مجھے تھوڑا سا رو لینے دو،ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔

Frau Grossman رکھ رکھاؤ والی لیکن زندہ دل خاتون تھی۔ایک بار پتہ نہیں کیسے ایک عجیب سا واقعہ ہو گیا۔اولڈ ہوم کی پانچویں منزل پر مرمت کا کچھ کام ہو رہا تھا۔وقفہ کے دوران ایک مزدور نے ایک کمرے میں جھانک کر دیکھا تو کمرہ خالی تھا۔وہ وہیں بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھ لگ گئی۔اتفاق سے اس کمرے کی رہائشی فراؤ برگ من ریستوران سے اپنے کمرے میں آئی تو اپنے بیڈ پر ایک مرد کو دیکھ کر اس نے ہنگامہ کر دیا۔اس ساری صورتحال میں خرابی والی کوئی بات نہ تھی اس لئے معاملہ معمولی تفتیش کے بعد رفع دفع ہو گیا لیکن فراؤ گروس من کی زندہ دلی اگلے دن بھی جاری تھی۔"بھئی ایسا ہوتا رہا تو لگتا ہے کبھی میری پوتی مجھے ملنے آئے تو آگے اسے دادی کے ساتھ اپنا نیا چچا بھی دیکھنے کو ملے۔۔۔سچ تب تو بڑی شرمندگی ہوگی"

Frau Wirth سے کہانی کار کو کچھ کوفت سی ہوتی تھی۔اس کی اتنی خدمت کرنے کے باوجود ایک بار اس نے خود سنا کہ وہ کسی کے ساتھ اپنے ملک میں آ کر بس جانے والے غیر ملکیوں کے خلاف بات کر رہی

تھی۔اسے بہت دکھ ہوا۔لیکن یہ لوگ عمر کے ایسے مقام پر ہیں کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی بحث کرنا یا کسی ناراضی کا اظہار کرنا بجائے خود زیادتی ہے۔ایک دن پتہ نہیں کیوں کہانی کار کا دل چاہا کہ آج فراؤورتھ کے آنے سے پہلے اس کے لئے اس کا پرہیزی مگر پسندیدہ ناشتہ وہ خود تیار کر رکھے۔اس نے اس کے لئے بریڈ کے ٹکڑوں کو اچھی طرح سے مارملیڈ لگایا اور جو کچھ وہ چاہا کرتی تھی ویسا کر کے اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔جونرس اسے وہیل چیئر پر لے کر آیا کرتی تھی۔وہ آئی تو اس نے یہ خبر سنائی کہ فراؤورتھ فوت ہوگئی ہے۔وہ دیر تک فراؤورتھ کے لئے تیار کردہ ناشتے کو دیکھتا رہا اور پتہ نہیں کیا کچھ سوچتا رہ گیا۔

یہ تو صرف اولڈ ہوم کی بے شمار کہانیوں میں سے چند کہانیوں کی جھلکیاں ہیں جو ایک عرصہ سے کہانی کار سے تقاضہ کر رہی تھیں کہ وہ انہیں لکھے۔انٹرنیٹ پر کہانی کار کو کئی کہانیوں نے الگ سے گھیرا ہوا تھا۔chat اور cheat کے فرق کو مٹاتی ہوئی کہانیاں بھی اور محبت واخلاص کی کہانیاں بھی۔مختلف شناختی ناموں کے ساتھ اپنی عظمت کا پرچم خود ہی بلند کرنے والے ادیبوں کی کہانیاں بھی اور واقعتاً ادب کی خدمت کرنے والے تخلیق کاروں کی کہانیاں بھی انٹرنیٹ پر مل رہی تھیں۔خود کہانی کار نے ایک نیک دل خاتون سے رابطہ ہونے پر اسی کے تعاون کے ساتھ اپنا ایک ادبی منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا تھا۔اس نیک دل خاتون کے اخلاص کی کہانی میں جان تھی۔پھر ایک امریکن خاتون سے دوستی۔۔۔جب اس نے اسے اپنا ایک مسئلہ بتایا تو وہ اس کے حل کے لئے نہ صرف راضی ہوگئی بلکہ جرمنی بھی پہنچ گئی،لیکن پھر وہ مسئلہ کوئی اور صورت اختیار کر گیا اور وہ امریکن خاتون اداس سی واپس چلی گئی۔

کہانی کار کے جعلی ادیبوں سے تعلقات کبھی بھی اچھے نہیں تھے کہ ایسا کرنا کہانی کار کے مزاج کے خلاف تھا۔اس کے مخالفین نے اس کے ساتھ کئی کھیل کھیلنے کی کوشش کی لیکن ہر بار منہ کی کھائی۔مخالفین کی انٹرنیٹ پر سرگرمیوں کی اپنی الگ کہانی تھی۔ایک بار انہوں غزالہ کے فرضی نام سے ای میل کی۔جس نے لکھا کہ میں میرپور خاص میں ریڈیو اناؤنسر ہوں،کہانیاں لکھنے کا شوق ہے،آپ کی مداح ہوں اور آپ سے کہانیوں پر نظرِ ثانی کرانا چاہتی ہوں۔کہانی کار پہلی نظر میں ہی ''عرفانِ سائبر'' سے آشنا ہوگیا۔اس نے جواب لکھا کہ ذرا اپنا ٹیلی فون نمبر بھیجئے۔آپ سے چند باتیں پوچھنی ہیں۔''ریڈیو اناؤنسر غزالہ'' نے جواب لکھا کہ ہمارا گھریلو ماحول ذرا سخت سا ہے اس لئے ٹیلی فون نمبر نہیں دے سکتی۔اور کہانی کار اس معصومانہ جواب پر زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔

دوسری بار ڈٹسن باخ یا اوفن باخ سے کسی کنول بی بی نے رابطہ کیا۔میں آپ کی تحریروں کی مداح ہوں۔مجھے شاعری کا شوق ہے۔میری خالہ بھی میرے ساتھ ہیں (کہانی کار کی عمر کا خیال کرتے ہوئے مداح کے ساتھ کہانی کار کی سہولت کے لئے ہم عمر خالہ بھی شامل کر دی گئی)۔کنول بی بی انٹرنیٹ سے ٹیلی فون پر آگئی۔گویا غزالہ والے ڈرامے میں جو کسر رہ گئی تھی اسے اب پورا کیا جا رہا تھا۔کہانی کار پر انٹرنیٹ سے ہونے والا یہ وار بھی خالی گیا۔کچھ عرصہ کی خاموشی کے بعد یار لوگوں نے خاصی محنت کے ساتھ انتظامات کئے۔اس بار فیصل آباد سے کسی بشریٰ سراج

نے ڈائرکٹ ٹیلی فون کر دیا۔''سر! میں نے آپ کو پڑھا ہے،میں آپ کی بہت بڑی مداح ہوں۔۔۔میں نے آپ کو ابھی ای میل کی ہے لیکن پھر مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور میں نے آپ کو ٹیلی فون کر دیا۔اگر آپ اجازت دیں تو میں کبھی کبھار آپ کو فون کر لیا کروں؟''

کہانی کار نے اسے سمجھایا کہ مجھے آپ کے ٹیلی فون کے آنے سے خوشی ہوگی لیکن اس میں آپ کا کافی خرچہ ہو جایا کرے گا۔اس لئے بہتر ہے آپ انٹرنیٹ سے رابطہ رکھیں۔تب بشریٰ سراج نے پہلا جوش و جذبہ برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ ہم بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں اس لئے خرچے کی آپ فکر نہ کریں۔پہلی ای میل میں بشریٰ سراج نے خود کو قریشی ظاہر کیا جسے کہانی کار نے نظر انداز کر دیا۔البتہ اسے لکھا کہ آپ اپنا پوسٹل ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر بھیج دیں۔خوشحال اور کھاتے پیتے گھرانے والی بی بی نے دونوں چیزیں بھیج دیں لیکن ٹیلی فون کا نمبر پی پی تھا اور پوسٹل ایڈریس میں والد کا نام رانا سراج درج تھا۔باپ رانا اور بیٹی قریشی۔پھر اسی پر بس نہیں ہوا،بشریٰ سراج یاہو کے چیٹ بکس میں جن اوقات میں آتی وہ جرمنی کے اوقات سے تو میل کھاتے تھے لیکن پاکستان کے اوقات سے ان کا کوئی میل نہیں تھا۔جرمنی میں رات کے دس بجے کوئی بھی آن لائن ہو سکتا ہے لیکن تب پاکستان میں رات کے دو بجے ہوتے ہیں اور بشریٰ سراج رات کے دو بجے آن لائن ہوتی تھی۔کہانی کار عرفانِ ذات کی بجائے عرفانِ سائبر سے مزید آشنا ہوا اور ان مخالفین پر پہلے ہنس دیا اور پھر رو دیا جو اس کے لئے اتنے پاپڑ بیل رہے تھے۔یہ واقعات بھی کہانی کار سے کچھ لکھنے کا تقاضہ کر رہے تھے۔

جرمنی میں بہت سارے ہم وطنوں کی بہت ساری انوکھی کہانیاں بھی اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔بالے نے جب پہلی بار جرمنی میں مزدوری کا کام شروع کیا اور اسے ایک کار والے نے تھوڑی سی رقم بطور ٹپ دے دی،اس دن وہ بہت دل گرفتہ تھا۔دوستوں کو یہ بتاتے ہوئے اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں کہ ہم جو اپنے وطن میں دوسروں کو ٹپ دیا کرتے تھے اب ہمیں یہاں ٹپ دی جا رہی ہے۔آخر اس نے ٹپ دینے والے کو ایک موٹی سی گالی دی اور پھر اسے کچھ قرار سا آ گیا۔اور اب چند برسوں کے عرصہ میں ہی اسی بالے کا یہ حال ہے کہ جس دن اسے ٹپ نہیں ملتی یا کم ٹپ ملتی ہے،اس دن وہ ان سارے لوگوں کو گالیاں دے رہا ہوتا ہے جو کنجوس ہو گئے ہیں۔اس کہانی کی بہت ساری جزئیات ہیں جو پاکستان سے جرمنی تک پھیلی ہوئی ہیں۔کہانی کئی بار کہانی کار کا پیچھا کر چکی ہے لیکن کہانی کار کو اپنی اس محبوب کہانی کے علاوہ کسی کی فکر نہیں جو اس کے قابو میں نہیں آ رہی۔

جرمنی کے ظفری میاں کی کہانی تو بہت سارے چٹ پٹے مسالوں کے ساتھ درسِ عبرت بھی لئے پھرتی ہے لیکن کہانی کار اس کے لئے بھی وقت نہیں نکال رہا۔ظفری میاں جب جرمنی آئے تھے تو انہوں نے یہاں سیٹ ہونے کے لئے ایک جرمن لڑکی سے شادی کر لی۔

لڑکی ان کے ساتھ مخلص تھی لیکن ظفری میاں اپنی موج میں تھے۔جب خود کو سارے قانونی تحفظات مل گئے تو انہوں

نے بیوی سے بات کی کہ میں چاہتا ہوں میرا چھوٹا بھائی بھی یہاں آجائے اور سیٹ ہو جائے۔ بیوی تو تم میری ہی ہو۔ اسلامی نکاح ہمارا بحال رہے گا لیکن سرکاری شادی کو ہم ختم کراتے ہیں اور پھر تم میرے چھوٹے بھائی سے قانونی شادی کر لینا، اس طرح وہ آسانی سے جرمنی میں آجائے گا۔ چنانچہ منصوبے کے مطابق سب کچھ انجام پا گیا اور ظفری کا چھوٹا بھائی نہ صرف جرمنی میں آ گیا بلکہ جرمنی میں سیٹ بھی ہو گیا۔ اس کے بعد ظفری نے اپنے ایک ماموں زاد کو اور پھر ایک پرانے دوست کو بھی باری باری اسی طرح جرمنی بلوایا اور یہاں سیٹ کرا دیا۔ یہاں تک تو کہانی ٹھیک رہتی ہے لیکن مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جب ظفری کی جرمن بیوی خود کہانی کار کے پاس گئی اور اسے رو رو کر بتانے لگی کہ تمہارے دوست نے مجھ سے اس حد تک کام لئے اور میں اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی جسمانی اور ذہنی طور پر صرف اسی کے ساتھ رہی ہوں لیکن اب وہ مجھے اپنانے سے انکار کر رہا ہے۔ کہانی کار اس صورتحال پر کافی دکھی ہوا۔ اس سے ہمدردی کرتا رہا لیکن اس کی کہانی کو ابھی تک لکھ نہیں سکا۔

پھر ان مولوی صاحب کی کہانی جنہوں نے یورپ میں سیٹ ہونے کے لئے اپنے ایک مقتدی سے کہا کہ کسی میم سے صرف پیپر میرج کرا دو۔ میں ان مشرک اور فاحشہ عورتوں کے ساتھ کوئی جسمانی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ بس قانونی تحفظ کے لئے پیپر میرج کروں گا۔ جب کاغذی کاروائی کا بنیادی مرحلہ مکمل ہو گیا تو مولوی صاحب میم کی منت کرنے لگے کہ چلو جب تک یہ کاغذی کاروائی قائم ہے تب تک ہم مل بھی لیا کریں لیکن میم نے طے شدہ باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ اُس کی کافرانہ اداؤں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مولوی صاحب کے نورانی چہرے سے ذرہ بھر بھی متاثر نہیں ہوئی تھی، نہ ہی ان کی منت سماجت سے اس کا دل پسیجا تھا۔ حالانکہ مولوی صاحب کی اچھی خاصی رقم اس پروجیکٹ پر لگ چکی تھی اور ابھی مزید کافی خرچہ ہونا تھا۔ تب مولوی صاحب اپنے مقتدی کی منت کرنے لگے کہ اسے راضی کر دو۔ یہ کہانی خاصی عبرتناک تھی لیکن کہانی کار نے اس کو بھی نظر انداز کر دیا۔

پھر ان دو فنکار بھائیوں کی کہانی جو یہاں کے قوانین سے ٹیکنیکل فائدے اٹھانے کی ترکیبیں سوچتے اور ان پر عمل کرتے رہتے۔ ایک نسبتاً اچھی کار لیتا۔ اس کی اچھی انشورنس کراتا۔ پھر دوسرا بھائی اس گاڑی کو اپنی گاڑی سے ٹکر مارتا۔ پہلے بھائی کو انشورنس کی بڑی رقم مل جاتی جسے دونوں مل کر بانٹ لیتے۔ جب تین چار بار انہیں دو بھائیوں کے ہی ایک جیسے ایکسیڈنٹ ہونے لگے تب انشورنس کمپنی کا ماتھا ٹھنکا اور تب دونوں کا فراڈ پکڑا گیا۔

جرمن انتظامیہ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والی کہانیاں۔۔۔۔ جب پاکستانی نئے نئے یہاں آتے تھے سب کو ہر طرح کی عزت دی جاتی۔ ان کی ہر بات کو سچ سمجھا جاتا۔ ڈرائیونگ لائسنس کے حصول کے لئے لوگوں نے اپنے پاکستانی راشن کارڈ یہ کہہ کر جمع کرائے کہ یہ ہمارے پاکستانی ڈرائیونگ لائسنس ہیں۔ انتظامیہ نے یقین کیا اور ایسے لوگوں کو لائسنس جاری کر دیئے۔ پھر کئی ایسے حادثات ہونے لگے کہ ون وے روڈ پر مخالف سمت سے

گاڑی ڈال دی گئی۔ تب راشن کارڈوں کی جانچ پڑتال شروع ہوئی اور اب سب کو ڈرائیونگ لائسنس کے حصول کے لئے ایک جان لیوا ٹیسٹ سے گزرنا ہوتا ہے۔ اور اب ان کے ہر سچ کو بھی شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح کی کئی کہانیاں جو قوم کو احساس دلا سکتی ہیں کہ تم لوگ جو پہلے یہاں آتے تھے اور تمہاری اتنی عزت کی جاتی تھی تو اب جو تمہارے تئیں رویے بدلے ہیں تو اس میں خود تمہاری اپنی ہیرا پھیریوں اور فراڈ بازیوں کا قصور ہے۔ لیکن کہانی کار ان کہانیوں کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ رہا۔

کہانی کار کے بڑے پوتے کی عمر ساڑھے پانچ سال ہے۔ اگرچہ سارے بچے ایک ہی شہر میں رہتے تھے اور ہفتہ میں ایک دو بار سب سے ملنا ملانا ہو جاتا تھا۔ تاہم سوتے سب اپنے اپنے گھر میں ہی تھے۔ اس دن پتہ نہیں دادا پوتے دونوں ہی کس لہر میں تھے کہ دادا نے پوتے کو اپنے پاس رہنے کے لئے کہا اور پوتا فوراً راضی ہو گیا۔ رات کو دادا نے پوتے کو اپنے ساتھ لٹا لیا اور اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے اپنے پوتے سے کچھ مخصوص دعاؤں کے بارے میں پوچھا۔ بچے کو چند دعائیں یاد تھیں جو اس نے سنا دیں۔ پھر کہانی کار نے اپنے پوتے سے پوچھا ’’کیا تمہیں کوئی حدیث شریف بھی یاد ہے؟‘‘۔۔۔ پوتے نے فوراً کہا ’’جی دادا ابو! مجھے ایک حدیث شریف یاد ہے۔‘‘ اسے حیرت ہوئی کہ بچے کو حدیث کا بھی پتہ ہے اور کچھ یاد بھی ہے۔ اس نے کہا اچھا شاباش حدیث شریف سناؤ!۔۔۔۔۔۔ بچے نے بڑی روانی کے ساتھ بولنا شروع کیا

’’حدیث شریف ہیلپنگ ہینڈ کے تعاون سے پیش کی جا رہی ہے۔ ماماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے‘‘

کہانی کار کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ نکلا۔ ایک ٹی وی چینل پر اذان سے پہلے ایک خیراتی ادارہ ہیلپنگ ہینڈ کی جانب سے اشتہار دیتے ہوئے کوئی حدیث پیش کی جاتی تھی۔ یہ حدیث اس کے پوتے نے وہاں سے سنی تھی اور اپنی سادگی میں سپانسر کرنے والوں کا ذکر بھی روانی میں کر دیا تھا۔ اور جہاں کچھ دقت محسوس ہوئی وہاں ترجمہ بھی بدل لیا تھا۔ پوتا اپنے دادا کی ہنسی کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر ہنسنے کے بعد کہانی کار کو خیال آیا کہ اپنے پوتے کو اپنے بچپن کی سنی ہوئی کہانیاں سنائی جائیں۔ چنانچہ دادا نے سب سے پہلے اپنی بوا سے سنی ہوئی ایک کہانی سنانی شروع کی۔ لیکن کہانی کو بیان کرتے وقت اسے شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ پوتے کو بات سمجھانے کے لئے اسے اصل کہانی میں کافی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔

’’ایک بوڑھی عورت بھٹی والی سے مکئی کے دانے بھنوا کر جا رہی تھی کہ رستے میں اسے ٹھوکر لگی اور اس کے دانے زمین پر بکھر گئے۔‘‘ یہ کہنا مشکل لگ رہا تھا۔ بچے کو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔

’’ایک بوڑھی عورت ایک مارکیٹ سے پاپ کارن خرید کر نکلی۔۔۔۔‘‘ کہانی کار نے پوتے کو سمجھانے کے لئے کچھ ایڈجسٹ منٹ کرنا شروع کی لیکن صاف لگ رہا تھا کہ وہ کہانی سنانے کی بجائے کہانی کا ترجمہ کرنے لگ گیا ہے۔ وہ بوڑھی اماں کے مخالف کوّے کی بات سناتا تو پوتا اسے جرمنی میں دکھائے جانے والے مقبول کارٹونز کے

کردار پیٹرک کی بات سنانے لگ جاتا۔وہ پوتے کو باتیں کرنے والی ڈانگ،نہر،وغیرہ کا بتاتا تو پوتا اسے sandy, Tadios, spongebob وغیرہ کی بات سنانے لگ جاتا۔وہ کہانی میں آنے والے بلی اور چوہے کا ذکر کرنے لگا تو پوتا چھلانگ مار کر ٹام اینڈ جیری کے کئی ایپی سوڈز اسے سنانے لگ گیا۔یوں اس کی بوا والی کہانی تو ادھوری رہ گئی لیکن پوتے کی کہانیاں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔اسے خوشی بھی ہو رہی تھی اور افسوس بھی۔بوا والی کہانی کے ادھورے رہ جانے سے زیادہ اسے اس بات کا دکھ تھا کہ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اگلی نسل کے ساتھ اتنے گہرے ربط کے باوجود ایک گہرا فاصلہ پیدا ہو رہا ہے لیکن خوشی اس بات کی تھی کہ پوتا اسے خود سے اور اپنے عہد سے ہم آہنگ کر رہا تھا۔بوا کی سنائی ہوئی کہانیوں کا اپنا مزہ تھا لیکن اب کارٹون کہانیوں میں بچوں کے لئے دلچسپی کا سامان کہیں زیادہ ہے۔شاید اتنا زیادہ کہ پرانے بڑے بھی ٹی وی کے آگے بیٹھ جائیں تو بچوں کی طرح مزہ لینے لگیں۔

پھر وہ رات، جب تک دونوں جاگتے رہے، دادا نے پوتے سے کہانیاں سننے میں گزار دی۔اور اسی رات کہانی کار نے سوچا کہ اپنی ادھوری کہانی میں کسی امتیاز کے بغیر ہر مذہب و مسلک کے سارے کے سارے انتہا پسندوں کو ایٹمی جنگ سے ہلاک کر کے صرف اپنے پوتے جیسے انسانوں کو بچایا جائے اور انہیں کے ذریعے نسلِ انسانی کو پھر سے دھرتی پر آباد کیا جائے۔لیکن ابھی یہ صرف کہانی کار نے سوچا ہے، کہانی لکھتے وقت کیا روپ اختیار کر جائے! اس کا تو خود کہانی کار کو بھی علم نہیں ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے اس انٹرویو میں یہ بھی کہا تھا کہ اگر کوئی اچھا لکھتا ہے، اس میں کچھ دینے کی صلاحیت ہے تو وہ اس بات کے پھیر میں نہیں پڑتا کہ وہ لوگوں سے اپنے کو منوائے۔ایک دوسری بات بھی ہے بدقسمتی کی، کچھ لوگ تنہائی کا شکار ہو گئے۔بیدی اپنے زمانے کو یاد کرتے ہوئے یہ بھی کہتے تھے۔۔۔مان لیجیے کسی ادیب نے ایک افسانہ لکھا اور اس میں کچھ ہے تو اس کا سارے لاہور میں ذکر ہوتا تھا۔اور آج کے اس بدلے ہوئے ماحول میں کوئی کتنی بھی معیاری چیز لکھے تب بھی کہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔۔آج ملک کا بنیادی ڈھانچہ ڈالر اور پونڈ سے بندھا ہونے کی وجہ سے سب کچھ گول مال سا ہو گیا ہے۔

بیدی نے آخر میں یہ بات بھی کہی کہ آج ہمارا قارئین کا طبقہ ''وار اینڈ پیس'' جیسے ضخیم ناول کو پڑھنے کی بجائے اس پر بننے والی فلم دیکھنا چاہتا ہے۔آج وہ اسٹیج نہیں رہا جہاں ادیب ایک ساتھ بیٹھ کر مقابلے کا احساس کر سکیں۔پھر ایسی حالت میں ادیب جوڑ توڑ میں پڑتا ہے اور اپنے آپ کو جلا ڈالتا ہے۔

(**راجندر سنگھ بیدی کا ایک یادگار انٹرویو** سے اقتباس

بحوالہ روزنامہ انقلاب بمبئی۔انٹرنیٹ ادبی ایڈیشن ۱۱/مارچ تا ۱۷/مارچ ۲۰۰۶ء)

وزیر آغا (سرگودھا)

کہا کس نے!

کہا کس نے
مکاں بوڑھے نہیں ہوتے!
کبھی تم بھی
سمندر پار جانے پر اگر مجبور ہو جاؤ
تو دیکھو گے
کہ جب دھرتی
پگھلتے ٹمٹماتے آخری ایام میں
تم کو بلائے گی
اور اک ریشم کی ڈوری سے بندھے
تم لوٹ آؤ گے
تو وہ چاندی سا اجلا گھر
جسے روتا ہوا تم چھوڑ کر
پردیس کی جانب سدھارے تھے
خمیدہ، بھاری جُثّہ
اپنے سُوجے پاؤں پر رکھے
پُرانی، کتنے خم کھاتی
لرزتی، چرچراتی سیڑھیاں اُترے گا
اور دہلیز پر رُک کر
تمہیں سینے سے چمٹا کر کہے گا:
یار، اتنی دیر کیوں کر دی!

وزیر آغا

بہت اندر کی دنیا دیکھ لی

بہت اندر کی دنیا دیکھ لی
باہر بھی اب دیکھیں / سمندر کی ہوا پھانکیں
مکانوں پر لکھے نمبر پڑھیں
کھوئے ہوؤں کو رات بھر ڈھونڈیں
جلائیں آگ ٹھنڈی راکھ سے لبریز چولہے میں
سُنیں بھوری، پرانی کیتلی
کے بجتے دانتوں سے نکلتی بھاپ کی آہیں
اُٹھائیں فرش سے چڑیا کا ٹوٹا گھونسلا / پھر فریم لکڑی کا
نکالیں فریم کی کمزور مٹھی میں پھنسی تصویر
جس کے نقش سارے بھر چکے ہیں
سُنیں اندھے مکاں کی تہہ سے آتی
پھول سی زخمی صدا / تتلی کی صورت
نرم پنکھوں سے ہمیں چھوتی
یقین و بے یقینی سے گزرتی

کہیں: ہم لوٹ آئے ہیں
نکل آئے ہیں ہم / اپنے بدن کے تنگ معبد سے
کہیں اُس سے کہ تم بھی
اب نکل آؤ
زمیں کی راکھ ہوتی قبر کے
بے نور محبس سے۔۔۔۔!

تاجدار عادل (کراچی)

سوال

تم اپنے خواب نہ توڑو نہ میں شکستہ کروں
کہ تم نہ چاہو مجھے، میں بھی ترکِ غم نہ کروں
کہ خواب جیسے بھی سہی
خواب تو ہمارے ہیں
کہ یہ متاع کسی کی بھی ہو عزیز تو ہے
کہ درد یہ ہو کسی کا لہو رلاتا ہے
پھر اس کے ساتھ ہی یہ ایک بات اور بھی ہے
کہ تجربہ ہے جراحت کا کچھ تمہیں نہ مجھے
ملے گا زخم تو کیسے اُسے سنبھالیں گے
کسی نے حال جو پوچھا تو کیا کہیں گے۔۔ کہو

ناظم خلیلی (گلبرگہ)

گجرات

۲۰۰۲ء تا ۲۰۰٦ء!

سارے ان چھوئے جذبے چھو لیئے گئے
انا کی ساری چوٹیاں بھی سر کر لی گئیں
اور روح کے سارے زخم بھی
گن لئے گئے!
ہونٹوں کو شہد کی اور پستانوں کو دودھ کی ندیاں
مان کر
قرن ہا قرن سے چلی آنے والی عقلِ سلیم
کسی بابری مسجد کے ملبے، یا
رام للے کے مندر تلے دبی آخری سانسیں لے رہی ہے
فضا میں جلے ہوئے ماس کی گند
اور لٹی ہوئی عصمتوں کی سڑن صاف کہہ رہی ہے کہ
ابھی محمد ﷺ کے میم سے مسلمان کے میم
اور ہندو کی ہ سے ہری کی ہ کے بیچ
وہی فاصلہ ہے
جو جنت کی جیم اور جہنم کی جیم میں ہے۔!

شہناز نبی (کلکتہ)

پھانسی

بہت بھلا تھا وہ شخص جس نے
زمیں پہ کھینچیں عجب لکیریں
تمام دریا، پہاڑ جنگل
سلگتے صحرا
برستے آنگن
ہزار ٹکڑوں میں بٹ گئے ہیں
بہت بھلا ہے وہ شخص جس نے
کلام اللہ
عدالتوں میں پرکھنا چاہا
کہ رتھ پہ ایسا دھوج پھرایا
زمیں لہو سے نہا گئی ہے
دھوئیں سے گھٹتا ہے دَم فضا کا
چلو کہ اب وہ گھڑی ہے آئی
تمام اچھے
عظیم لوگوں کو ڈھونڈ کر ہم
وہ جن کے دل میں
اُمڈتے رہتے ہیں حبِّ قومی کے تند دریا
جنہیں دلوں کے
زبانوں کے، ذہن کے
وبھا جن نے سرخرو کیا ہے
انہیں پکڑ کر لگا دیں پھانسی

شہناز نبی

منتظم

ہمارے جیسے عجیب لوگوں کی رنجشوں کا
ملال کس کو
زمین کرتی ہے بین
آنسو فلک بہاتا ہے چپکے چپکے
فضا میں سسکی سی تیرتی ہے
ہیں سر بہ زانو تمام منظر
کہیں چھِنی ہے کسی کی گڑیا
کہیں پھٹی ہیں نئی کتابیں
کسی کی شہ رگ پہ کوئی چھینٹا
کسی کی گلیوں میں خون بکھرا
سنا ہے ہم نے کہ اس شجاعت پہ تمغہ ملے گا اس کو
بڑی نفاست سے اس نے چھانٹے ہیں اپنے ریوڑ
مویشی سارے بٹے ہوئے ہیں
بہ رنگ و ذات و نسل ان کے بنے طویلے
سب اپنی خوشیوں، غموں کو بانٹیں گے اپنی حد میں
کہ بھیڑ بکری سے مل نہ پائے
نہ گائے بھینسوں میں ہوں کلیلیں
سنا ہے اس کے نظامِ ملکی پہ سب ہیں نازاں
اسے ہی بخشیں گے پھر سے وہ منصب ہزاری
ہمارے جیسے عجیب لوگوں کی آنکھوں میں
کیوں ہے اتنا پانی

شہناز نبی

پاپ

بُرا نہ مانو
نمازیں اب بھی یہیں پڑی ہیں
یہ سجدہ گاہیں اُٹھا کے جانے کدھر چلے تھے
وہ صبح تم کو بھی یاد ہوگی
الگ تھے گھر اور علیحدہ چولہے
تمہارے پرچم کا رنگ الگ تھا
وطن تمہارا نیا نیا تھا
سبھی تو بانٹا تھا آدھا آدھا
مگر پڑی ہے وہاں پہ اب تک
ہماری رادھا کی ایک پائل
ہمارے کرشنا کی ایک بنسی
یہ ہیر کیسے اٹھا کے دے دیں
کہاں سے لائیں تمہارا رانجھا
کہ ہم سے پاگل
حساب رکھتے نہیں دنوں کا
ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں ہے
کہ آریائی سے بابری ہم بنے تو کیسے
ہمیں تو شنکھ اور اذاں ہے یکساں
ہماری تاریخ کے کتنے صفحے
چرائے تم نے؟

کہاں کہاں سے نشاں ہمارے
مٹائے تم نے؟
ہماری ہولی تمہارے بن ہے اداس کتنی
تمہیں پتہ کیا
ہماری عیدوں کو تم سے ملنے کی پیاس کتنی
کہاں چلے تھے اٹھا کے منبر
کہاں سجائی دکان تم نے
کہاں پہ بیچے ہیں مال کتنے
کہو منافع کمایا کتنا
ہمارے جیسے
تمہارے جیسے
خدا کے بندے
جو اپنے حصے کا پانی
کھودیں کنواں تو پائیں
جو اپنے تن کو دھواں بنائیں تو روٹی کھائیں
ہمیں لکیروں کے کھیل سے کیا
ہمیں تجارت سے واسطہ کب
جنہیں تھا سود و زیاں سے مطلب
وہ کاروبارِ جہاں سے رخصت
یہ آگ اب بھی بھڑک رہی ہے
چلو بزرگوں کے پاپ دھوئیں
ہمارے مندر سنبھالو تم سب
تمہاری مسجد کے ہم نگہباں

مصطفیٰ شہاب (لندن)

پیوند

ایمرسن ہاؤز
اک گورِ غریباں ہے
سڑے حمام، اجڑے ہال۔۔
کونا کونا فریادی۔۔۔
کچن میں مستقل بدبو
چھتیس برسوں سے برساتی
دواروں کی دراڑوں میں چھپی
صدیوں کی تاریکی
مگر چاروں طرف
پھیلی ہوئی ہے شہر کی
خوش باش آبادی

بہت سے لوگ جو سڑکوں پہ
دروازوں کے سایوں میں
کسی محراب میں، پل کی کمانوں میں
سیاہی رات کی جسموں پہ اپنے اوڑھ لیتے ہیں
یہی بے گھر
ستم گر رتجگے کے بعد
میلی تھیلیوں میں
زندگی بھر کے اثاثے کو سمیٹے

صبح ہوتے ہی
ایمرسن ہاؤز آ کر
اپنی سب بے خوابیاں چہرے کی دھو کے
کچھ غذا کھا کر
پرانی زندگی سے اپنا ناطہ جوڑ لیتے ہیں

سنا ہے ''رچ'' نئی تہذیب میں ایسا ہی ہوتا ہے
کبھی تو گندگی پر
ریشم و کمخواب کا پردہ گراتے ہیں
کبھی کر کے نمائش جسم کے ناسور کی
دولت کماتے ہیں
کبھی سب کوڑے کرکٹ کو
دکھاوے کی صفائی کے لیے
قالین کے نیچے چھپاتے ہیں

ترنّم ریاض (دہلی)

کہیں کوئی نہیں

یہ کس نے بوئی ہیں چنگاریاں تیری زمینوں میں
یہ کس نے آگ سی سلگائی ہے معصوم سینوں میں
کوئی ویران موسم آبسا بارہ مہینوں میں
کہ جیسے ہوں نہ تاثیریں ہی اب جھکتی جبینوں میں

کسی نے باغباں بن کر جلایا مرغزاروں کو
کسی نے سائباں بن کر اجاڑا ہے بہاروں کو

خزاں نے دیکھ ڈالا گھر ترے سب لالہ زاروں کا
نشاط و چشمہ شاہی، ڈل، ولر کا شالماروں کا
ترے جھرنوں، پہاڑوں، ندّیوں کا، آبشاروں کا
سکوں کے ہر خزانے پر ہے پہرا شاہماروں کا

سبھی تیری زمیں پر چاہتے ہیں آسماں اپنا
جڑوں کو گھُن لگا کر ٹہنیوں پر آشیاں اپنا

تری ہر آبجو میں سمِّ قاتل کیوں ملایا ہے
ترے سب گلشنوں کو کس نے گورستاں بنایا ہے
یہ بلبل کے سریلے گیت کو کس نے ڈرایا ہے
دھنک رنگ آسماں پر یہ دھواں کیوں آن چھایا ہے

تری عظمت کے قائل شاہوں کی ہر یاد روتی ہے
ہزاروں سال کی تاریخ شرمندہ سی ہوتی ہے

خدائی نے کسی انصاف میں یوں دیر کی ہے کیوں
ترے صوفی بزرگوں نے خموشی سادھ لی ہے کیوں
خفا خورشید تجھ سے اور روٹھی چاندنی ہے کیوں
تری دشمن بنی آخر تری یہ سادگی ہے کیوں

تری چڑیوں کے نوحوں میں ترنّم کون لائے گا
ترے مجروح ہونٹوں پر تبسّم کون لائے گا

فرشتہ امن کا اجڑے گھروں کو کب بسائے گا
جواں جانوں کے غم کی جھرّیوں میں مسکرائے گا
کنواری بوڑھیوں کی مانگ میں موتی سجائے گا
کہیں کوئی نہیں، کوئی نہیں ہے، کون آئے گا

مخالف ساعتوں میں تجھ کو ہم دم کون رکھے گا
مری وادی ترے زخموں پہ مرہم، کون رکھے گا

جان عالم (مانسہرہ)

وہ جو مرتا نہیں

(سانحہ آٹھ اکتوبر پر اللہ سے تعزیت)

وہ جو مارے گئے
اپنی آسودگی اور تعیش کی مستی میں گم
....
وہ جو مارے گئے
اپنے اجداد کی زندگی کی کمائی کے خمیازہ میں
سربلند، قلعہ بند مسکنوں میں مکیں

وہ جو مارے گئے بے خبر، بے گماں
اپنے کل کے لئے......
اپنی نسلوں کو مکتب میں بیساکھیوں کے
نئے کارخانے لگانے،
پرانے نصابوں کے سانچوں میں ڈھلتے، پگھلتے ہوئے
دیکھتے
وہ جو مارے گئے، بے خبر، بے گماں....!

جن کے بازو کٹے،
جن کے پیروں کو دیوار نے چل کے تیشہ کیا
کنگنوں کے لئے جن کی باہیں چرائی گئیں
بھوک نے سرد لاشوں میں پیشہ کیا

وقت کی اک تسلی کے ہمراہ اُڑ جائے گا
گزرے پل کی قیامت کا ہر سانحہ

مائیں......آنکھوں کی کھیتی میں
پھر سے نئی نسل کی فصل کے خواب بونے لگیں گی
باپ......اپنے لئے پھر سے بیساکھیوں کی
نئی کھیپ تیار کرنے میں مصروف ہو جائیں گے
اترے چہروں کے مہتاب کھل جائیں گے
اور دریدہ بدن پھر رفو گر دلاسوں سے سل جائیں گے
برفباری میں ٹھٹھری، بلکتی ہوئی کونپلوں پر
نئے موسموں کی چمکتی ہوئی دھوپ سایا کرے گی،
درد ہنستا ہوا خیمہ بستی سے باہر نکل کر خوشی سے ملے گا

وقت کی اک تسلی کے ہمراہ اُڑ جائے گا،
گزرے پل کی قیامت کا ہر سانحہ
میں فسردہ ہوں اُس کے لئے
جس کے کنبے کے لاکھوں مرے،
وہ جو مرتا نہیں.........!
وہ جو ماؤں سے زیادہ مہربان ہے،
وقت جس کو دلاسا بھی دیتا نہیں (دے بھی سکتا نہیں)
اُس کا شاید میں تنہا عزادار ہوں
☆☆☆

فیصل عظیم (امریکہ)

جزیروں میں بٹے لوگ

ایک جزیرہ تیرے گھر کا
ایک جزیرہ میرے گھر کا
ایک جزیرہ بازاروں کا
ایک جزیرہ وہ ہے جس پر خود کو بیچ کے آ جاتا ہوں
ایک جزیرہ خوشیوں کا ہے
ایک جزیرے پر مسجد ہے
ایک پہ رقص اور موسیقی کے ساز سجے ہیں
اور جزیروں کو آپس میں
سڑکیں جوڑ دیا کرتی ہیں

اب کے چھٹی کا دن ہوگا
تو ہم پھر اپنی گاڑی میں
اُن سڑکوں پر بہتے ہوں گے

فیصل عظیم

پیاسا دریا

اپنے چہرے پہ اک داستاں لکھ رکھی تھی
اور آنکھوں میں اپنی
میں کتنے سوالوں، جوابوں کی تحریر لے کر چلا تھا
مگر چہرہ پڑھنے کی فرصت کسے تھی!
کسے فکر تھی
کہ یقین اور حیرت کے یہ رنگ کس کے لئے ہیں
کسے جستجو تھی
میں کیا سوچتا ہوں
میں کیا کہہ رہا ہوں
سبھی تو کسی اور وحشت میں گم تھے
مرے دوستو، لو
میں اپنا سا منہ لے کے پھر آ گیا ہوں
مگر تم کو بھی اِس کی فرصت کہاں ہے!

فیصل عظیم

میرا برگد

تم تو فٹ سے کہہ دیتے ہو
''چھوڑ و وہ بوسیدہ کمرے
اُس بستی سے باہر آؤ
اور اِس دنیا میں بس جاؤ''
لیکن میں برگد سے کیسے
اُس کی مٹّی کو چھڑواؤں
وہ جو دور تلک پھیلی ہیں،
اُس کی جڑیں، کیسے ہلواؤں
اُس کے پتّوں نے جو رنگ
کئی برسوں میں اپنایا ہے
اُس پر اپنا رنگ چڑھاؤں؟
اُس کے تنے پر نقش بنے ہیں
وہ سب کے سب کیوں مٹواؤں
اُس کی شاخوں پر بیٹھے ہیں
میں وہ پرندے کیوں اُڑواؤں
گھونسلے جن کے برسوں سے ہیں
میں وہ گھونسلے کیوں گرواؤں
برساتوں کے نقش ہیں اُس پر
اُن کو بے لذّت پانی سے
کیوں دھلواؤں، کیوں مٹواؤں
اُس کے سائے میں جو بیٹھے ہیں
بیدردی سے کیوں اُٹھواؤں
اُن کو بھی بے سایہ کر دوں،
اور اُس کو تنہا کر جاؤں؟
اُس کی ہوائیں چھین لوں اُس سے،
اپنی ہواؤں میں لے جاؤں؟
اُس نے اب تک جو دیکھے ہیں
سارے منظر چھین لوں اُس سے؟
سب آوازیں بند کروں کیا؟
اپنی آوازیں سنواؤں؟
تم تو بس یہ کہہ دیتے ہو
لیکن برگد پھر برگد ہے
جاؤ بابا، ہم کو بخشو!
اِس کے سائے میں رہ لینے دو

فیصل عظیم

فیونرل سروس

Funeral Services

سنا تم نے؟
وہاں، گھر سے ذرا کچھ دُور
ایسا اِک اِدارہ ہے
جہاں خاصے مناسب دام پر
وہ لوگ
بندوبست سب کرتے ہیں،
سبزہ بھی اُگاتے ہیں
وہ خوشبو بھی چھڑکتے ہیں
صفائی روز کرتے ہیں
وہ کتبہ خود لگاتے ہیں
اُسے گرنے نہیں دیتے
جو تم بے نام ہو جاؤ!
مناسب دام لے کر
وہ بہت آرام دیتے ہیں

فیصل عظیم

سرخوشی

تھرک تھرک کر
ساز کی دُھن پر
گھوم گھوم کر
جھوم جھوم کر
اپنا آپ اُٹھائے کوئی
صدیوں بعد
بہت مستی میں ناچ رہا ہے
جتنی آوازیں ہیں باہر
وہ سب نغمے، گویا
دل کی شہنائی سے پھوٹ رہے ہیں
دل کے ساز سے اُٹھنے والے
سُر سب منظر لُوٹ رہے ہیں

جدید ادب

ارشد خالد (اسلام آباد)

جنت کے گھر

ہم اپنے بچپنے میں ساحلِ دریا پہ جا کے
پیروں کو بھر کے
ریت کے کچھ خوشنما سے گھر بناتے تھے
پھر اپنے پھول ہاتھوں سے
انہیں مسمار کرتے تھے
یہ لگتا ہے بڑے ہو کر بھی ہم اب تک۔۔۔
ابھی تک بچپنے میں ہیں
کہ اپنی خواہشوں کی جنتیں پانے کی خاطر
نیکیوں کے نام پر
جنت کے گھر تعمیر کرتے ہیں
پھر ان جنت گھروں کو خود جہنم زار کرتے ہیں
ہر اپنی خوشنما تعمیر اپنے ہاتھ سے مسمار کرتے ہیں
فقط نادانیوں سے پیار کرتے ہیں

اکمل شاکر (پسنی)

پیاس

میرے دل کے برتن میں
پانی میٹھا رہتا تھا
ایک کنواری پیاس مری ہمسائی تھی
لیکن کل میں پانی بھرنا بھول گیا تھا
ایک صدی تک جینا مرنا بھول گیا تھا

احساس

تری تصویر میں
اک اور دنیا کی کہانی ہے
جو باقی ہے
جو فانی ہے

اتفاق

کبھی میں تھا، کبھی تو تھی
کبھی امید اور خوشیوں کا میلہ تھا
کبھی تو بھی اکیلی تھی
کبھی میں بھی اکیلا تھا

ایک گوشہ ڈاکٹر انور سدید کے لئے

تعارف

انور سدید۔۴ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ضلع سرگودھا (شاہ پور) کے دور افتادہ قصبہ میانی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم سرگودھا اور ڈیرہ غازی خان کے عام سکولوں میں حاصل کی،میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں اوّل رہ کر پاس کیا۔مزید تعلیم کے لیے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ان کا رجحان ادب کی طرف تھا لیکن والدین سائنس کی تعلیم دلا کر انجینئر بنانا چاہتے تھے۔کالج میں فزکس اور کیمسٹری کی تعلیم مشکل نظر آنے لگی۔اس دور میں اسلامیہ کالج لاہور میں تحریک پاکستان کی سرگرمیاں زور پکڑ چکی تھیں،انور سدید بھی ان میں شرکت کرنے لگے اور ایف ایس سی کا امتحان نہ دیا۔اس وقت ان کے افسانے رسالہ ''بیسویں صدی''، ''نیرنگ خیال'' اور ''ہمایوں'' میں چھپنے لگے تھے۔عملی زندگی کی ابتدا محکمہ آب پاشی (اری گیشن ڈپارٹمنٹ) میں لوئر گریڈ کلرک سے کی، نا آسودگی محسوس کی تو گورنمنٹ انجینئرنگ سکول (منڈی بہاءالدین) میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے داخل ہو گئے اور اگست ۱۹۴۸ء میں اوّل بدرجہ اوّل آنے اور طلائی تحفہ پانے کے بعد اری گیشن ڈپارٹمنٹ میں سب انجینئر کی ملازمت پر فائز ہو گئے۔یہاں بھی انہوں نے نا آسودگی محسوس کی تو دوبارہ تعلیم کی طرف راغب ہوئے اور ایف اے، بی اے اور ایم اے کے امتحانات پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت میں دیئے۔ایم اے میں فرسٹ کلاس بدرجہ اوّل حاصل کی اور خارجی طلبہ میں ریکارڈ قائم کیا۔انور سدید نے ''اردو ادب کی تحریکیں'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کے داخلی راہنما ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔پنجاب یونیورسٹی نے ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور ڈاکٹر شمس الحسن صدیقی کو ان کا ممتحن مقرر کیا۔دونوں نے ان کے مقالے کو ایسی نظیر قرار دیا جو آئندہ طلبہ کو راہنمائی فراہم کر سکتا تھا۔اس دوران انور سدید نے انجینئرنگ کا امتحان اے ایم آئی اے انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز ڈھاکہ سے پاس کیا اور محکمہ آب پاشی پنجاب سے ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے سے ۶۰ برس کی عمر پوری ہونے پر دسمبر ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہو گئے۔ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ماہانہ ''قومی ڈائجسٹ''، ہفت روزہ ''زندگی''، روزنامہ ''خبریں'' لاہور میں چند سال کام کرنے کے بعد وہ ملک کے نظریاتی اخبار ''نوائے وقت'' کے ادارے میں شامل ہو گئے۔اس ادارے سے انہوں نے ''دوسری ریٹائرمنٹ'' جولائی ۲۰۰۳ء

میں حاصل کی لیکن جناب مجید نظامی چیف ایڈیٹر ''نوائے وقت'' نے انہیں ریٹائر کرنے کی بجائے گھر پر کام کرنے کی اجازت دے دی۔چنانچہ اب وہ کل وقتی ادیب اور صحافی ہیں۔تنقید، انشائیہ نگاری، شاعری اور کالم نگاری ان کے اظہار کی چند اہم اصناف ہیں۔

انور سدید نے اپنے بچپن میں ہی ادب کو زندگی کی ایک بامعنی سرگرمی کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ابتدا بچوں کے رسائل میں کہانیاں لکھنے سے کی، افسانے کی طرف آئے تو اس دور کے ممتاز ادبی رسالہ ''ہمایوں'' میں چھپنے لگے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے ''اوراق'' جاری کیا تو انہیں تنقید لکھنے کی ترغیب دی اور اپنے مطالعے کو کام میں لانے کا مشورہ دیا۔انہوں نے رسالہ ''اردو زبان'' سرگودھا کے پس پردہ مدیر کی خدمات انجام دیں، ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ''اوراق'' کے معاون مدیر کی حیثیت میں بھی کام کیا۔روزنامہ ''جسارت''، روزنامہ ''نوائے وقت''، ''مشرق''، ''حریت''، ''امروز''، ''زندگی''، ''قومی زبان'' اور ''خبریں'' میں ان کے کالم متعدد ناموں اور عنوانات سے چھپتے رہے۔''دی اسٹیٹسمین'' اور ''دی پاکستان ٹائمز'' میں انگریزی میں ادبی کالم لکھے۔انہیں تعلیمی زندگی میں تین طلائی تمغے عطا کیے گئے۔ادبی کتابوں میں سے ''اقبال کے کلاسیکی نقوش''، ''اردو ادب کی تحریکیں'' اور ''اردو میں حج ناموں کی روایت'' پر ایوارڈز مل چکے ہیں۔آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی نے انہیں بہترین کالم نگار کا اے این ایس ایوارڈ عطا کیا۔

اب تک انور سدید نے ۵۶ کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں، چند کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔''فکر و خیال'' ۲۔''اختلافات'' ۳۔''کھردرے مضامین''
۴۔''اردو افسانے کی کروٹیں'' ۵۔''موضوعات'' ۶۔''برسبیل تنقید''
۷۔''شمع اردو کا سفر'' ۸۔''نئے ادبی جائزے'' ۹۔''میر انیس کی اقلیمِ سخن''
۱۰۔''محترم چہرے'' ۱۱۔''اردو ادب کی تحریکیں'' ۱۲۔''اردو کی مختصر تاریخ''
۱۳۔''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' ۱۴۔''اردو ادب میں سفرنامہ'' ۱۵۔''اردو ادب میں انشائیہ''
۱۶۔''اقبال کے کلاسیکی نقوش'' ۱۷۔''اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش'' ۱۸۔''ذکر اس پری وش کا''
۱۹۔''غالب کے نئے خطوط'' ۲۰۔''دلاور فگاریاں'' ۲۱۔''قلم کے لوگ''
۲۲۔ادیبانِ رفتہ'' ۲۳۔''آسمان میں پتنگیں'' ۲۴۔''دلی دور نہیں''
۲۵۔''ادب کہانی ۱۹۹۶ء'' ۲۶۔''ادب کہانی ۱۹۹۷ء'' ۲۷۔''اردو افسانہ۔۔عہد بہ عہد
۲۸۔''میر انیس قلم رو'' ۲۹۔''وزیر آغا ایک مطالعہ'' ۳۰۔مولانا صلاح الدین احمد، فن اور شخصیت'' ۳۱۔حکیم عنایت اللہ سہروردی۔۔حالات و آثار۔
۳۲۔''جدید اردو نظم کے ارباب اربعہ'' ۳۳۔''کچھ وقت کتابوں کے ساتھ'' ۳۴۔مزید ادبی جائزے''

انور سدید کی چند کتابوں مثلاً ''اردو ادب کی تحریکیں''۔''اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش''۔ ''اردو ادب میں سفر نامہ''۔''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ''۔اردو ادب میں انشائیہ'' کو موضوع کے اعتبار سے اوّلین تصنیف ہونے کا درجہ حاصل ہے۔انور سدید ان دنوں ''نوائے وقت'' سنڈے میگزین میں کتابوں پر تبصرے بھی لکھ رہے ہیں۔۲۰۰۳ء میں انہوں نے ایک سال میں ۲۲۵ کتابوں پر تبصرے لکھ کر ریکارڈ قائم کیا۔

انور سدید کے فن اور شخصیت پر پروفیسر سیّد سجاد نقوی نے ایک کتاب ''گرم دمِ جستجو'' شائع کی ہے۔ رسالہ ''اوراق''، ''تخلیق''، ''ارتکاز''، ''جدید ادب''، ''کوہسار جنرل''، ''چہار سو'' اور ''روشنائی'' میں ان پر گوشے چھپ چکے ہیں۔ان کے بارے میں چند اکابرین ادب نے رسالہ ''روشنائی'' کے گوشے میں لکھا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا: ''۱۹۶۵ء کے بعد ابھرنے والے اردو کے ناقدین میں انور سدید اپنی تنقیدی بصیرت، انصاف پسندی اور بے بہا خلوص کے باعث بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ان کے نرم اور شائستہ لہجے میں بلا کا تیقن ہے۔اس اعتبار سے میں انہیں اردو کا مردِ آہن سمجھتا ہوں۔اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کے وہ قائل نہیں۔تنقید ان کے لیے نہ تو حصولِ جاہ کا ذریعہ ہے نہ حصولِ زر کا۔وہ تنقید اس لیے کرتے ہیں تا کہ ادب پارے سے غلاف اتار کر اس کی اصل صورت دکھا سکیں۔''

ڈاکٹر سیّد عبداللہ: ''پہلے مجھے بتایئے کہ آپ کھاتے، پیتے اور سوتے کس وقت ہیں؟ کیوں کہ جس رفتار سے آپ کی معلومات افزا نادر کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان کو دیکھ کر گمان گزرتا ہے کہ آپ کے نظام الاوقات میں کھانے، پینے اور سونے کے لیے وقت نظر نہیں آتا۔ بسیار نویسی اور فقرہ نگاری کا اجتماع اگر کہیں دیکھنا ہو تو وہ انور سدید کے پاس ہے۔''

مشفق خواجہ: ''تنقید، تحقیق، انشائیہ طنز و مزاح، یہاں تک کہ شاعری بھی۔آخر کون سی صنف ادب ہے جس میں انور سدید کے کمالات کا اظہار نہ ہوا ہو۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ انور سدید ایک فرد کا نام نہیں، کئی افراد کا ''مجموعی نام'' ہے۔جو ادب کے الگ الگ طبقوں میں سرگرم عمل ہیں اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ۔''

ڈاکٹر انور سدید کی بیشتر کتابیں کالج اور یونیورسٹی طلبا کے علاوہ اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانات میں شریک ہونے والوں کی معاونت کرتی ہیں اور کئی یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں شامل ہیں۔

انور سدید کی چار تصنیفات اور بھی ہیں۔ یہ ان کے چار بیٹے: مسعود، امتیاز، انس اور ندیم ہیں جنہیں وہ اپنے انشائیے تصور کرتے ہیں۔ان کے دو بیٹے ڈاکٹر اور دو انجینئر ہیں۔ان کا خاندان اب پوتے پوتیوں سمیت ۲۱ رافراد پر مشتمل ہے۔ان کے ہاں ''جائنٹ فیملی سسٹم'' خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔وہ ڈاکٹر وزیر آغا، اور احمد ندیم قاسمی کو اپنا محسن تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان دونوں نے انہیں ہمیشہ متحرک رکھا ہے۔*****

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

غازی انور سدید

معاصر ادب کا مرد میدان۔جابر سلطانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے والا دوستی میں سدید، دشمنی میں شدید، کسی کو موٹا اور کسی کو باریک کاٹنے والا۔ گفتگو میں سیدھا۔تحریر میں سیدھا کر دینے والا محقق۔نقاد، کالم نگار، شاعر، انشائیہ نگار، عصر حاضر کا سلطان محمود غزنوی، سومنات پر سترہویں حملے کی تیاری میں مصروف فاتح میدانِ ادب، غازی انور سدید میرا آج کا موضوع ہے!!

شاعری کی زبان میں پہلوان سخن استاد امام بخش ناسخ کا ہم پایہ و ہمسایہ، مخالفوں کو بیچ میدان للکارنے والا مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ صرف چھینٹے اڑیں زخم نہ لگیں۔کسی نے کیا لکھا اس سے غرض نہیں مگر کسی نے کیا کیا، اس سے بے تعلق نہیں۔عصری ادب سے پوری طرح آگاہ۔ناشتے میں برصغیر کے روزناموں کے ادبی صفحوں کا حلوہ پوری۔عصرانے میں دنیا بھر کے ادبی و نا ادبی رسائل کے چکڑ چھولے۔عشایئے میں دیسی اور بدیسی کتب کے مرغان مسلّم سے مشق کام و دہن کرنے والا!!

کہتے ہیں کہ مرزا غالب رات سونے سے قبل بستر خواب پر لیٹے عالم سرخوشی میں فکر سخن کرتے تھے اور ہر شعر پر آزار بند میں گرہ دے لیتے تھے۔صبح اٹھ کر شعر لکھتے جاتے تھے اور آزار بند کی گرہیں کھولتے جاتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید سونے سے قبل ہم عصر ادیبوں پر ''فکر سخن'' کرتے ہیں اور آزار بند کو گرہیں دیتے چلے جاتے ہیں۔ نماز فجر کے بعد ایک ایک گرہ کے عوض ایک ایک اخباری کالم لکھتے ہیں اور گرہیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔سنا ہے یہ گرہیں ان کے ''ممدوحین'' کے دلوں میں پڑتی رہتی ہیں!!

ہر بڑے آدمی کے اگر کچھ دوست ہوتے ہیں تو کچھ اختلاف رائے رکھنے والے بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے اختلاف رائے رکھنے والے جب سامنے آنے لگے تو انور سدید نے دفاع کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور پھر اس ذمہ داری کو اپنے دوسرے ادبی کام کا حصہ بنا لیا۔اس ضمن میں وہ خاصے ''نیک نام'' بھی ہوئے مگر ''کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا'' سے بے تعلق ہو کر انہوں نے اس کام کو فرض منصبی کی طرح پورا کیا۔بے شک انور سدید آغا جی کی حفاظت کا فریضہ احسن طور پر سرانجام دیتے رہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتے تو آغا جی زیادہ محفوظ رہتے۔ادھر حملہ آوروں کی ایک فوج ظفر فوج کالموں، رسالوں اور کتب سے لیس ہو کر برسرِ پیکار، ادھر انور

سدید تن تنہا ہر محاذ پر نہ صرف دفاع کے لیے تیار بلکہ اکثر پیش قدمی و پیش دستی کرتے ہوئے اس نے دشمن کے علاقے کو تاخت و تاراج کیا۔ بعض نے ان سے متعلق زبان غیر میں شرح آرزو کی۔ بعض نے تلخ کلام ہو کر تھوک دیا۔ بعض نے کہا اس نام ہی سے ان کی زبان پلید ہوتی ہے انور سدید نے صلہ و ستائش، نیک نامی و بدنامی سے بے نیاز ادبی سیاست اور صحافت میں اپنا کردار جاری رکھا۔

آج ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید کی دوستی مشہور ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ انور سدید نے اپنی شخصیت کی قیمت پر ڈاکٹر وزیر آغا کو خریدا ہے۔ گو بڑے مہنگے داموں خریدا ہے مگر وہ تو کہہ رہا ہے۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای　　　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اس ادائیگی سے اکثر ڈاکٹر وزیر آغا کی قیمت ادا ہوتی ہے یا نہیں مگر شخصیت سے زیادہ کوئی اور کیا قیمت ادا کر سکتا ہے۔ سو جہاں ماما تو وہاں ڈالڈا کی طرح جہاں ڈاکٹر وزیر آغا وہاں انور سدید بھی۔ اس رشتہ محبت کو کوئی بھی نام دے لیا جائے بہر حال اس زمانے میں اس کی مثال ملنی محال ضرور ہے۔ اگر ناممکن نہیں!! شخصیت کی قربانی شاید جان کی قربانی سے بھی مشکل ہے!! کوئی اسے ولن کی محبت کہنا چاہے تو کہہ لے آخر ولن بھی تو محبت ہی کرتا ہے۔ ہیرو تو بڑی باعزت محبت کرتا ہے اور محبوبہ کے علاوہ دوسروں کی واہ واہ بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اپنے پلّے سے تو کچھ نہیں دیتا الٹا نیک نامیاں بٹورتا رہتا ہے۔ ولن تو اپنی ساری عزتیں اور نیک نامیاں داؤ پر لگا کر محبت کرتا ہے۔ (ایسی محبت سے محبوبہ کا کیا حال ہوتا ہے یہ ایک الگ مضمون ہے) کچھ اس قسم کی خودسپردگی انور سدید کی محبت میں ہے۔ اس نے تو اپنے آپ کو اس محبت میں فرقہ ملامتیہ کا ایک فرد بنا لیا ہے۔ وہ اس پر نادم بھی نہیں الٹا مطمئن ہے۔ مگر انور سدید نے ققنس کی طرح اس آگ میں جل کر ایک نئی زندگی بھی پائی ہے۔ وہ محض جلا ہی نہیں۔ زندہ بھی ہوا ہے!! اس نے صرف کھویا ہی نہیں پایا بھی ہے!!

محبت اور نفرت کی اس جنگ میں انور سدید نے بہت زخم کھائے ہیں اور اس کے جسم کا بہت سا خون بہہ گیا ہے۔ خون زیادہ بہہ جائے تو چہرے کی قدرتی چمک دمک تو بحال نہیں رہتی نا۔ اہمیت کے لحاظ سے اس بات کو کہاں لے جائیں کہ انور سدید نے اپنے آپ کو حرب و ضرب کے میدان میں منوایا ہے۔ سو زمانہ اس کی سپاہیانہ اور جنگ جویانہ صلاحیتوں کا تو معترف ہو گیا ہے مگر اس کی معرکتہ الآراء تنقید کو نظر انداز کر رہا ہے۔ جب ذرا وقت کی گرد بیٹھے گی تو نظر آئے گا کہ انور سدید کے ہاتھ میں سپاہی کی تلوار ہی نہیں ادیب کا قلم بھی ہے۔ وہ سر قلم ہی نہیں کرتا سرفراز بھی کرتا ہے۔ اس عہد کا کوئی بھی اخبار، رسالہ اٹھا کر دیکھ لیجیے اس میں آپ کو انور سدید کی جھلک ضرور ملے گی۔ ہر آدمی یہ سوچ سوچ کر دم بخود ہے کہ وہ اس قدر لکھنے کا وقت کہاں سے لاتا ہے۔ میرے خیال میں انور سدید کی گھڑی پر بارہ نہیں چوبیس بجتے ہیں۔ بارہ تو اس کے بجتے ہیں جس پر انور سدید کا کالم اخبار میں چھپتا ہے۔

انور سدید کی تمام تحریریں جمع کی جائیں تو اونٹ کا بوجھ بنے گا، کہتے ہیں بعض پرانے زمانوں کے

بزرگوں کی کتب اونٹ کے بوجھ برابر تھیں۔ بہر حال ادب، ادیب اور ان کے مسائل پر اس دور میں ڈاکٹر انور سدید نے سب سے زیادہ لکھا ہے۔ انور سدید کی بعض کتب تو اپنے زمانے کا منظر نامہ ہیں۔ ’’غالب کے خطوط‘‘، ’’اردو ادب کی تحریکیں‘‘، ’’انشائیہ اردو ادب میں‘‘ جیسی کتب گواہ ہیں۔ انور سدید نے ایک مثبت انداز فکر رکھنے والے نقاد کی طرح جس صنف ادب پر لکھا ہے اسے پروجیکٹ کیا ہے۔ جب کہ ہمارے بعض نفسیاتی ناقدین نے جن اصناف ادب پر لکھا ہے انہیں بے وقار کر کے رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت بنیادی طور پر ایک مثبت انسان کی شخصیت ہے، مگر وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ

ہم پہلے نرم پتوں کی ایک شاخ تھے مگر
کاٹے گئے ہیں اتنے کہ تلوار ہو گئے

رزم حق و باطل نے اس مرد آہن کو نہ صرف بظاہر منفی بنا دیا بلکہ متنازعہ بھی۔ ممکن تھا یہ مرد آہن ہمیشہ کے لیے اپنی آہنی زرہ میں غرق ہو جاتا اس نے وطن سے نکل کر کچھ ادبی سرفروشی ہی کے طور پر جانا پہچانا۔ یہ صورت حال انور سدید کے مخالفین کے لیے ابھی تک ایک لمحہ فکریہ ہے!!

ڈاکٹر انور سدید کی زندگی کے اس خارجی رخ کا موازنہ جب انور سدید کی داخلی زندگی سے کیا جائے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آندھی اور طوفان قسم کا یہ شخص ذاتی زندگی میں یا اپنے حلقہ احباب میں خاموش، پرسکون، نرم مزاج، روادار، محبت کرنے والا، دوست قسم کا انسان ہے، وار کرنے اور وار سہنے دونوں صلاحیتوں سے بہرور یہ مرد جری دونوں کے موقع محل کو بھی پہچانتا ہے۔ وہ با دوستاں مروت با دشمناں مدارت کا نہیں بلکہ اقبال کے اس شعر کا مثال ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم　　　　رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

انور سدید کو بات کہنے کا ہنر آتا ہے۔ انور سدید کی تحریروں کے بین السطور نہایت پر معنی بلکہ معنی خیز ہوتے ہیں۔ یہی معنی خیزی ان کے مخالفین کے لیے کیمیائی ہتھیاروں کی طرح ہلاکت آفریں ثابت ہوتی ہے!!

انور سدید کو پیشہ کے لحاظ سے انجینئر، کام کے لحاظ سے ادیب یا اہل قلم اور عادت کے اعتبار سے اہل سیف کہا جا سکتا ہے۔ یہ تینوں انور سدید کے مزاج کے تار و پود ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں اپنا اپنا اظہار کرتے رہتے ہیں!! ظاہری طور پر بھی وہ بلند، بھاری اور بے باک تیور کا آدمی نظر آتا ہے!!

بہر حال مجھے یقین ہے آنے والے زمانوں کے بے لحاظ ادبی مورخین کسی نہ کسی لحاظ سے انور سدید کا نام ضرور لیتے رہیں گے۔ نقاد اور تخلیق کار کے لحاظ سے بھی اور میدان ادب کے سرفروش غازی کے طور پر بھی!!

ادبی دنیا میں انور سدید کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت قلمکار کی اور دوسری ڈاکٹر وزیر آغا کے دوست کی۔ برصغیر کے بہت سے لوگ وزیر آغا سے محبت کرتے ہیں لیکن انور سدید شاید پرستش کرتے ہیں۔ محبت میں

سپردگی کی کیفیت ہوتی ہے مگر پرستش میں تو اپنی نفی کرنی پڑتی ہے۔نفی ذات کی یہی وہ منزل ہے جو سب سے مشکل ہوتی ہے۔انور سدید نے یہ منزل سر کر لی ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا کی پرستش میں نفی ذات کے عمل سے گزر گئے ہیں۔ نفی ذات کا عمل ایک صوفی کے لیے تو آسان ہو سکتا ہے مگر کسی ادیب کے لیے نفی ذات کا عمل خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو مار دینے کا عمل ہے۔نفی ذات کا عمل ایک تخلیق کار کے لیے اس لیے بھی مشکل ہے کہ تخلیق کار کا تو سارا عمل ہی نفسیاتی طور پر اظہارِ ذات کا عمل ہے۔اس میں نفیٔ ذات کا تو کوئی خانہ ہی نہیں!!

اس نبرد عشق میں ان کے پاؤں ہی زخمی نہیں ہوئے بعض اوقات ہاتھ بھی خراب ہوئے ہیں مگر انور سدید نے کسی احساس ندامت کے تحت اپنے خراب ہاتھوں کو کبھی چھپایا نہیں بلکہ اظہار تفاخر کے طور پر اکثر ان کی نمائش کی ہے۔عشق و محبت کی یہ ادا نفی ذات کے مراحل میں سے گزرنے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔اس گئے گزرے اور نفسا نفسی کے زمانے میں ایثار کی ایسی مثالیں کہاں ملیں گی؟ ذرا سرزمین ادب پر نظر ڈال کر جواب دیجیے!؟ میرا خیال ہے آج کی ادبی دنیا میں اس مخلصانہ دوستی کی مثال نہیں ملتی۔ادبی دنیا میں بڑے آدمیوں کی تو کوئی کمی نہیں مگر میں نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو پورے ادبی منظر میں مجھے انور سدید جیسا چھوٹا آدمی ایک بھی نظر نہیں آتا جس کا دل اتنا بڑا ہوا۔

مجھے یقین ہے جب تک انور سدید جیسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے اس وقت تک ہماری دوستی کی روایت بھی زندہ رہے گی اور دوستوں کے لیے معرکہ آرائی کی روایت بھی!!

ڈاکٹر انور سدید ایک فتح نصیب جرنیل ہے جسے بجا طور پر غازی انور سدید کے لقب سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

''اردو میں خاکہ نگاری کا کوئی خاص فن نہیں۔مختلف لوگوں نے شخصیتوں کو اپنی اپنی نظر سے دیکھا اور اپنے اپنے اسٹائل میں لکھا۔ممتاز مفتی تو خاکہ نگاری کو ''شخصیہ'' کہتے ہیں۔اکبر حمیدی نے اپنے اسلوب اور اپنی نظر سے ان شخصیتوں کے اندر جھانکا اور انہیں خاکے کا روپ دیا۔ان کی نثر کی لطافت میں، ان کی انشائیہ نگاری کی مشق بھی شامل ہے۔۔ان کے خاکوں میں ایک نرمی، شخصیت کے ساتھ مفاہمت، دوستی اور پیار کی جھلک نے ان کے رویے میں ایک اعتدال اور شگفتگی پیدا کی ہے جس سے یہ خاکے شخصیتوں کے بہت عمدہ پورٹریٹ بن گئے ہیں، ایک ایسا پورٹریٹ جو ظاہری رنگوں سے بھی نظر کو متوجہ کرتا ہے اور سانس لیتا اور بولتا ہوا بھی محسوس ہوتا ہے۔'قد آدم' اردو خاکہ نگاری میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، یہ اکبر حمیدی کے فن کی تازہ کاری اور ان کی نئی منزل کا استعارہ بھی ہے''

(**ڈاکٹر رشید امجد** کے مضمون **قد، آدم۔ایک جائزہ** سے اقتباس)

ڈاکٹر انور سدید سے مکالمہ

عمران نقوی (لاہور)

عمران نقوی: آپ نے ''اردو ادب کی تحریکیں'' لکھی۔لمحہ موجود میں کسی ادبی تحریک کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

انور سدید: اپنی کتاب ''اردو ادب کی تحریکیں'' لکھتے وقت مجھے احساس ہوا تھا کہ ادب کی تحریک بھی اولمپک کی شمع کی طرح ہوتی ہے جو مختلف اوقات میں معانی کے لحاظ سے محوِ سفر رہتی ہے۔میں نے اس کی مثال فرانس کی مشہورِ زمانہ رومانوی تحریک سے دی تھی جس کا اساسی آغاز جرمنی میں ہوا تھا لیکن جسے معنوی طور پر فرانس نے پروان چڑھایا اور طویل وقفے کے بعد انگلستان میں اسے فروغ ملا تو اس تحریک کے آغاز کو ڈیڑھ دو سو برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔برصغیر میں رومانوی تحریک بیسویں صدی کے ربع اوّل میں طلوع ہوئی جب کہ اس کی نمو کے آثار قدیم داستانوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔تحریک کے ضمن میں انسانی فطرت کی اس خصوصیت کا ادراک ضروری ہے کہ وہ زیادہ لمبے عرصے تک یکسانیت اور یک رنگی کو قبول نہیں کرتی اور اس کے داخل میں تغیر کی آرزو خود بخود کلبلانے لگتی ہے۔تغیر کی خواہش بذاتِ خود اتنا بڑا محرک ہے کہ ارتقائے کائنات کے بیشتر زاویے اسی کے مرہونِ منت ہیں۔تغیر کی یہ خواہش ادب میں ادیبوں کے وسیلے سے سامنے آتی ہے۔اگر یہ خواہش کسی ایک ادیب تک محدود رہے تو یہ اس کے ذاتی تجربے سے موسوم کی جاتی ہے اور اکثر اوقات چنداں اہم نہیں سمجھی جاتی تاہم اس قسم کی خواہش لاشعوری طور پر زیادہ ادبا اور شعرا کی تخلیقات میں نمو پذیر ہونے لگے تو اسے بالعموم ایک رجحان کا نام دیا جاتا ہے اور یہ رجحان قیدِ زمان و مقام کو عبور کر جائے تو تحریک سے موسوم ہونے لگتا ہے۔چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ رجحان جس تغیر کے لیے زمین ہموار کرتا ہے تحریک اس کی تکمیل کے لیے مجادلہ کرتی ہے اور بالآخر ادب پاروں کی صورت میں فتوحات کے ثمرات سمیٹتی ہے۔اگرچہ اردو ادب میں ''ترقی پسند تحریک'' اور ''ادبِ اسلامی تحریک'' ایک لکھے ہوئے دستور کے مطابق رونما ہوئی لیکن ادبی تحریک بالعموم کسی باضابطہ تحریری آئین کی پیروی نہیں کرتی اور نہ لکھے ہوئے آئین کی پابند ہوتی ہے۔ادب کی تحریک تو لالہ خودرو کی طرح اگتی ہے اور اپنی خوشبو نسیم سحر کی طرح پھیلاتی ہے۔

میں نے اوپر جس رومانی تحریک کا ذکر کیا ہے اس کے آغاز میں انگریزی اور نئے علوم کی ہندوستان میں آمد بے حد اہم ہے۔ان نئے تصورات کو شیخ عبدالقادر کے رسالہ ''مخزن'' نے فروغ دیا اور اسے بہت سے نامور ادیبوں نے جن میں علامہ اقبالؒ اور ابوالکلام آزاد سرِ فہرست ہیں پروان چڑھایا۔۱۹۳۰ء کی دہائی میں اس

رومانوی تحریک سے ''ترقی پسند'' اور ''حلقہ اربابِ ذوق'' کی تحریکیں رونما ہوئیں جن کا حلقہ اثر آزادی کے بعد تک پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان میں ترقی پسند تحریک کو ''ادبِ لطیف''، ''سویرا'' اور ''نقوش'' کے بعد رسالہ ''فنون'' نے پروان چڑھایا لیکن اب ان رسائل کی کایا کلپ ہو چکی ہے۔ دوسری طرف ''حلقہ ارباب ذوق'' کی تحریک کو ''ادبی دنیا'' اور ''نئی تحریریں'' جیسے رسائل نے فروغ دیا۔ حلقہ اب بھی قائم ہے لیکن اب اس میں پہلے جیسا دم نہیں۔ اس دور میں ہی ڈاکٹر وزیر آغا نے رسالہ ''اوراق'' جاری کیا تو اسے ''جدیدیت'' کا ترجمان رسالہ بنا دیا۔ اب چالیس برس کے بعد ''اوراق'' کی کارگزاری پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا ''اوراق'' نے ہر نئے تجربے کا خیر مقدم کیا جب کہ ''فنون'' ترقی پسند روائتی نظریے کے ساتھ چمٹا رہا اور جمود کا شکار ہوتا چلا گیا۔ اب ''اوراق'' لمبے وقفوں سے شائع ہو رہا ہے تو مجھے نئے رجحانات اور نئی تحریکوں میں بھی وقفہ لمبا ہوتا نظر آتا ہے تاہم غنیمت ہے کہ کراچی سے ''آئندہ''، ''دنیا زاد'' اور ''روشنائی'' جیسے رسائل جاری ہو گئے ہیں جو نئی تحریکوں کو کروٹ دے سکتے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ آزادی سے پہلے ادب میں فکری تحریکوں کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ آزادی کے بعد ادبی تحریکوں کی جہت نظریاتی سمت اختیار کر گئی اور اس کے ساتھ ہی نئی اصنافِ ادب کو تحریک کی صورت ملتی چلی گئی۔ تاہم کوئی بھی تحریک کسی ''ضرورت'' کے تحت رونما نہیں ہوئی۔ تحریک کو لالہ ءخودرو کی طرح اگنے کے عمل سے روکا نہیں جا سکتا۔ مجھے یہ عمل اب بھی جاری نظر آتا ہے۔ تکنیکی نوعیت کا ایک موضوع ''ساختیات'' ہے جس کا دائرۂ اثر ہندو پاک میں محدود ہے لیکن دونوں ملکوں میں اس کا مطالعہ فروغ حاصل کر رہا ہے اور گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، ضمیر علی بدایونی، قمر جمیل، قاضی قیصر الاسلام اور ڈاکٹر فہیم اعظمی کے بعد ناصر عباس نیر، شفیق احمد شفیق، رفیق سندیلوی اور رؤف نیازی جیسے نوجوان ادبا اس موضوع کی طرف راغب ہو گئے ہیں تو ایک نئی تحریک برپا ہوتی نظر آتی ہے۔ دوسری طرف وزیر آغا کی متعارفہ ''امتزاجی تنقید'' کو بھی تحریکی صورت میں ہی زیرِ عمل لایا جا رہا ہے۔ اصناف سخن میں سے ماہیا اور ہائیکو کو تحریکی صورت میں قبول کیا جا رہا ہے۔

عمران نقوی: اردو ناول نگاری کہاں کھو گئی؟

انور سدید: عمران نقوی صاحب! ناول نگاری کہیں نہیں گئی۔ درحقیقت ہمارے ادبا کرام اس سرچشمۂ تخلیق سے قطع تعلق کر چکے ہیں جس کی تھرتھراہٹ بقول ڈی، ایچ لارنس ''سالم زندہ بشر کو لرزش میں لا سکتی ہے اور شاعری، فلسفہ، سائنس یا کسی اور کتابی تھرتھراہٹ سے بڑھ کر ہے۔'' مجھے یہ بات بڑی حیرت انگیز نظر آتی ہے کہ پاکستان میں کہانی نگاروں نے زندگی کو جزو جزو افسانوں میں پیش کرنے کی کاوش تو افراط سے کی لیکن پوری زندگی پر ناول تخلیق کرنے کی بہت کم کوشش کی، اس زاویے سے مجھے عبداللہ حسین اور نثار عزیز بٹ کا نام غنیمت نظر آتا ہے کہ انہوں نے زندگی کی قاشیں پیش کرنے اور افسانے سے لو لگانے کی بجائے اپنے پورے وجود اور گرد و پیش کے پورے تناظر کو ناول میں پیش کیا............''اداس نسلیں''، ''نادار لوگ''، ....''نگری نگری پھرا مسافر''، ''نے چراغ نے گلے''، ''کاروانِ وجود'' اور ''دریا کے سنگ'' جیسے ناول لکھے۔ بلاشبہ ہمارے ہاں بانو قدسیہ، فرخندہ لودھی، عذرا اصغر، اور خدیجہ مستور نے بھی چند اچھے ناول پیش کیے لیکن یہ ان کے افسانوی اظہار کی بنیادی صنف نہیں بن سکی اور انتظار حسین نے ''بستی''، ''تذکرہ'' اور ''آگے سمندر ہے'' جیسے ناول پیش کئے لیکن افسانے کے مقابلے میں اس صنف کی طرف ان کی پوری رغبت نظر نہیں آتی۔ آغا گل، شمشاد احمد، انیس ناگی، محمد عاصم بٹ، اور اکرام اللہ نے ناولٹ لکھے اور ایک مکمل ناول ان کے تخلیقی عمل سے بھی محروم رہا۔ غلام الثقلین نقوی کی پہلی محبت بھی افسانے کے ساتھ تھی تاہم غنیمت ہے کہ انہوں نے نہ صرف تین ناولٹ لکھے بلکہ ناول ''میرا گاؤں'' بھی تخلیق کیا اور زندگی کی جبلت کو احساس کی سطح پر متحرک اور جان سوز بنا دیا۔ پاکستان کے برعکس بھارت میں ناول کی تخلیق کاری کو نسبتاً زیادہ فروغ مل رہا ہے اور معاشرے کی سالمیت کو پیش کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔ قاضی عبدالستار، عبدالصمد، جتندر بلّو، مصطفیٰ کریم، شموئیل احمد، انل ٹھکر، مشرف عالم ذوقی، صلاح الدین پرویز اور ان سب کے ساتھ قرۃ العین حیدر اور جوگندر پال نے ناول کو پوری تخلیقی توجہ عطا کی ہے۔ اب شاید یہ کہنا مناسب ہوگا کہ پاکستان میں ناول نگاری کسی بند گلی میں کھو گئی ہے۔ اس گلی کی ہر نکڑ پر کہانی نویس کو ''افسانہ'' تو گرا پڑا مل جاتا ہے لیکن وہ چھوٹے چھوٹے افسانوں کو زندگی کا پورا ''کل'' بنانے اور ماضی اور حال کے مابین ربط و تعلق پیدا کرنے کے لیے یا تو فرصت سے محروم ہے یا پہلے جز وقتی کام پر ہی قناعت کر رہا ہے اور ناول کا کل وقتی کام قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ آپ اسے پاکستانی تخلیق کار کی کاہل پسندی بھی کہہ سکتے ہیں جو غزل کے کلچر سے اس کے اعصاب پر سوار ہے۔

عمران نقوی: عہد موجود میں کوئی نقاد ہے بھی؟

انور سدید: تخلیق اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر تخلیق کا عمل جاری ہے تو تنقید پر جمود کس طرح طاری ہو سکتا ہے۔ نقاد کو ادبی منظر سے ناموجود کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ تخلیق کار اپنے فن پارے کا سب سے پہلا نقاد خود ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل کے بعد وہ فن پارے پر نقاد کی نظر ڈالتا اور اس کے حسن و قبح کا اندازہ لگاتا ہے۔ اگر فن پارہ اس کے معیار نقد پر پورا نہ اترے تو اسے مسترد کرنے میں تاخیر نہیں کرتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو ادب میں محمد حسن عسکری، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، وہاب اشرفی، جیلانی کامران، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سلیم احمد، محمد علی صدیقی، مظفر علی سیّد، دیویندر اِسر، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس اور فہیم اعظمی جیسے نقادوں کا سکہ چل رہا ہے اور ادب کی تفہیم ان کے نظریات اور آراء کی روشنی میں کی جا رہی ہے تو اس قافلہ ءتنقید میں ریاض صدیقی، شہزاد منظر، سلیم آغا قزلباش، امجد طفیل، صبا اکرام، ڈاکٹر تحسین فراقی، ناصر عباس نیر، حقانی القاسمی، جمیل آذر، سجاد نقوی، ابوالکلام قاسمی، رفیق سندیلوی، اور متعدد نئے نقاد بھی شامل ہوئے ہیں۔ یہ چند نام میں اپنے حافظے سے لکھ رہا ہوں جب کہ یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی ہے اور اب آپ سے میرا سوال ہے کہ آپ کو یہ احساس کس طرح ہو گیا ہے کہ عہدِ موجود نقاد سے خالی ہے؟

جدید ادب

عمران نقوی: آج کل آپ ادبی رسائل پر کچھ زیادہ لکھ رہے ہیں۔ وجہ؟

انور سدید: اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کے فروغ میں کتاب ایک اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کتاب میں آپ کی ملاقات بلکہ طویل ملاقات صرف ایک مصنف سے ہوتی ہے لیکن ادبی رسالے میں آپ متعدد اصنافِ ادب کے فن پاروں کے علاوہ بہت سے تخلیق کاروں اور نقادوں سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے ادبی رسالہ کتاب کے مقابلے میں فروغ ادب میں قدرے مختلف قسم کا کردار ادا کرتا ہے۔ ادبی رسالے میں آپ سینئر اور کہنہ مشق ادبا کی تخلیقات کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات سے بھی متعارف ہوتے ہیں اور اس طرح ادب کی نئی اور پرانی لہروں سے آگہی کا موقعہ ملتا ہے۔ دوسری طرف میرا یہ خیال بھی ہے کہ ٹیلی ویژن میڈیا نے ادبی رسالے کے مطالعے میں خاصی کمی پیدا کر دی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ادبی رسائل جو کبھی ہر ماہ پابندیٔ وقت سے شائع ہوتے تھے، اب باقاعدگی سے شائع نہیں ہوتے۔ نتیجہ ادب کے سنجیدہ قارئین کو بھی بعض رسائل میں چھپنے والے اچھے مضامین کی اشاعت کی خبر نہیں ہوتی۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ پاکستان کے ادبی رسائل بھارت میں اور بھارت کے ادبی رسائل پاکستان میں کم کم آتے ہیں، چنانچہ قارئین ادب بہت اچھے مضامین کے مطالعے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ادبی رسائل پر مضامین لکھ کر میں کوشش کرتا ہوں کہ ان میں چھپنے والے مضامین کا تعارف کرا دیا جائے اور قارئین کو یہ ادبی رسالہ خرید کر پڑھنے کی طرف متوجہ کرایا جا سکے۔ کیا یہ بات افسوس ناک نہیں ہے کہ کراچی کے رسائل لاہور کے سٹالز پر اور لاہور کے ادبی رسائل اسلام آباد اور پشاور کے سٹالز پر دستیاب نہیں ہوتے لیکن جب ان کا ذکر ''نوائے وقت'' میں چھپ جاتا ہے تو ان رسائل کی مانگ پیدا ہو جاتی ہے۔

عمران نقوی: ٹی وی ڈرامہ ادبی صنف کہلوا سکتا ہے۔ اگر نہیں تو کیوں؟

انور سدید: میرا خیال ہے کہ ادبی صنف میں اوّلاً لکھے جانے اور ثانیاً پڑھے جانے کی صلاحیت ضروری ہے۔ لکھی ہوئی تحریر جب زیرِ مطالعہ آتی ہے تو یہ فرد کو ذہنی طور پر متحرک کرتی اور اس کی سوچ کو مہمیز لگاتی ہے۔ میں اس کی مثال امتیاز علی تاج کے ڈرامہ ''انارکلی'' سے دوں گا جسے فلم پر پوری کامیابی سے اتارا نہیں جا سکا۔ اسی طرح جب کسی اعلیٰ پائے کے ادبی ناول کو ٹیلی وژن ڈرامے کی صورت دی جاتی ہے تو مصنف شکایت کرتا ہے کہ سکرپٹ ناول کے لطیف نکات سے محروم ہے۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ ٹی وی ڈرامہ کتابی صورت میں چھپ کر پڑھا نہیں جاتا اور نہ وہ لطافت خیال اس طرح پیدا کرتا ہے جس طرح ٹی وی کی متحرک تصویروں اور ایکٹروں کی اداکاری نے ابھاری تھی۔ اس لحاظ سے ٹی وی ڈرامہ پوری ادبی صنف قرار نہیں دی جا سکتی، اس کا ادبی ہونا ایک اضافی عنصر ہے۔

عمران نقوی: حفیظ تائب کی وفات کے بعد نعتیہ منظر نامہ کے حوالے سے آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

انور سدید: حفیظ تائب کی وفات سے ایک اعلیٰ پائے کا نعت نگار اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ حضوری کی کیفیت میں نعت لکھتے تھے اور نبی کریمؐ کی سیرۃ کے نقوش ان کے نہاں خانۂ دل میں

تاباں اور منوّر رہتے تھے، یہ نقوش ان کی نعت میں لاشعوری طور پر شامل ہو جاتے تھے۔ ان کا کیف قاری کو منتقل ہوتا چلا جاتا تھا۔ میں انہیں دورِ حاضر کا ایک بے حد اہم نعت نگار تسلیم کرتا ہوں لیکن وہ حرفِ آخر نہیں تھے۔ نعت کی اقلیم وسیع ہے اور میری نظر محدود ہے۔ اس اقلیم کو متعدد نعت نگار اپنی عقیدت کے چراغوں سے روشن کر رہے ہیں اور تا قیامت کرتے رہیں گے۔ ان میں حفیظ تائب کا نام بھی زندہ رہے گا۔

عمران نقوی: اس وقت کوئی ادیب، عہد ساز کہلانے کا مستحق ہے؟

انور سدید: میرے ناقص خیال میں اس دور کے ہر ادیب کو ''عہد ساز'' کہلانے کا استحقاق حاصل ہے۔ جو ادیب ''کھوٹے سکے'' چلانے کا ہنر جانتا ہے اور اپنے ساتھ چند ''ہاں کیوں والے'' بھی رکھتا ہے اسے عہد ساز کہلانے کا زیادہ حق ہے۔ وہ اس بنیادی بات کو آسانی سے نظر انداز کر سکتا ہے کہ اعلیٰ پائے کی تخلیق انائے کاذب کی پرورش نہیں کرتی بلکہ عجز و انکساری کو جنم دیتی ہے۔ ارتقاء کا اگلا قدم اٹھانے کی تحریک دیتی ہے اور اپنی بے بضاعتی کا احساس دلاتی ہے۔ اب یہ اعلیٰ خواص نایاب ہیں۔ اس لیے عہد ساز ادیبوں کی تعداد روز افزوں ہے۔

عمران نقوی: آپ ادبی کالم نگار ہیں۔ آپ سے پہلے جو ادبی کالم نگاری ہوئی اس کے حوالے سے آپ کے محسوسات؟

انور سدید: میری کالم نگاری صرف ایک مشقت ہے اور قطعاً غیر اہم ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ میں کالم نگاری کو صحافت کی ضرورت تسلیم کرتا ہوں۔ یہ ادب کی صنف نہیں ہے۔ کسی زمانے میں انتظار حسین اچھا ادبی کالم لکھتے تھے۔ ''سخن در سخن'' کے عنوان کے تحت خامہ بگوش رونما ہوئے، جو مشفق خواجہ کا مکمل نام تھا۔ اس کالم کی ادبی جہت اور طنز و مزاح کا انوکھا انداز بہت مقبول ہوا۔ ان کے تین مجموعے بھی چھپ چکے ہیں اور کالموں کا انتخاب مظفر علی سیّد نے کیا ہے جسے لاجواب قرار دیا جا سکتا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مشفق خواجہ اسے ثانوی نوعیت دیتے تھے۔ بہت سے ''گنجے فرشتے'' جو ادب تخلیق نہیں کر سکتے وہ کالم نگاری کو ادب قرار دیتے ہیں اور اس طرح اپنا دل پشوری کر لیتے ہیں۔

عمران نقوی: آپ نے اپنے نام کے ساتھ کسی علاقے یا شہر کے نام کو نتھی کیوں نہیں کیا؟

انور سدید: اپنے نام میں ہی کچھ نہیں رکھا تو اپنے علاقے یا شہر سے نسبت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ علاقے اور شہر کے تخصص کی ضرورت وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں ایک نام کے کئی اصحاب موجود ہوں۔ مثلاً حفیظ جالندھری، حفیظ میرٹھی، حفیظ ہوشیار پوری، حفیظ مالیگانوی وغیرہ۔ جب کہ فیض احمد فیض ایک ہی ہے، دوسرے ''فیض'' نے اپنے تخلیقی تحفظ کے لیے ''فیض لدھیانوی'' کہلوانا پسند کیا۔

عمران نقوی: اردو کے پہلے چودہ بڑے شاعر؟ معیار شاعری ہوگا زمانی ترتیب نہیں چلے گی؟

انور سدید: آپ کا یہ سوال تو بہت پریشان کن ہے؟ آپ نے چودہ کا عدد کیوں اختیار کیا ہے؟ اور اگر اختیار کیا ہی

ہے تو اس کے لیے زمانے کا تعین نہیں کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ اکیسویں صدی آغاز ہوئی اور معیاری ادبی جائزے لکھے گئے تو اٹھارویں صدی:۔ میر تقی میر کے نام ۔۔۔ انیسویں صدی: مرزا غالب کے نام اور بیسوی صدی اقبال کے نام منسوب کر دی گئی اور اسے سب نے تسلیم کر لیا ہے۔ چند سال قبل ایک ادارے نے گزشتہ ایک صدی کے ۱۲ منتخب شعرا کا کیلنڈر شائع کیا گیا اور ان کی عظمت کے ثبوت کے طور پر ان کا کلام بھی ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ یہ ترتیب حسب ذیل ہے۔

۱۔علامہ اقبالؒ　۲۔جوش ملیح آبادی　۳۔حفیظ جالندھری　۴۔ن،م،راشد
۵۔فیض احمد فیض　۶۔ناصر کاظمی　۷۔منیر نیازی　۸۔احمد فراز
۹۔جون ایلیا　۱۰۔افتخار عارف　۱۱۔فہمیدہ ریاض　۱۲۔پروین شاکر

ماہنامہ ''کاغذی پیرہن'' میں ''جدید اردو نظم کے معمار'' کے عنوان سے بیسویں صدی کے منتخب شعرا کا مدلل اور دستاویزی تعارف کرایا جا رہا ہے۔ شعرا کی اس فہرست میں اوّلین چودہ جدید شعرا کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔مجید امجد　۲۔ن،م،راشد　۳۔وزیر آغا　۴۔میراجی
۵۔فیض احمد فیض　۶۔اختر الایمان　۷۔ضیأ جالندھری　۸۔منیر نیازی
۹۔بلاج کومل　۱۰۔صفدر میر　۱۱۔عزیز حامد مدنی　۱۲۔جیلانی کامران
۱۳۔اختر حسین جعفری　۱۴۔امین راحت چغتائی

آخر الذکر انتخاب چونکہ ہندو پاک کے شعرا پر مشتمل ہے۔ اس لیے یہ نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ اقبال کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر سب نے تسلیم کیا ہے۔ آپ نے چودہ بڑے شعرا کو زمان کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔ پوری اردو شاعری کو زیر نظر رکھیں تو مندرجہ ذیل شعرا اس فہرست میں شامل ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

۱۔ولی دکنی　۲۔میرزا رفیع سوؔدا　۳۔میر تقی میر　۴۔میر ببر علی انیس
۵۔مرزا غالبؔ　۶۔الطاف حسین حاؔلی　۷۔نظیر اکبر آبادی　۸۔اکبر الہٰ آبادی
۹۔علامہ اقبالؒ　۱۰۔فراق گورکھپوری　۱۱۔فیض احمد فیض　۱۲۔مجید امجد
۱۳۔ن،م،راشد　۱۴۔وزیر آغا

آپ حیران ہوں گے کہ گزشتہ دنوں ایک اہم سبب ایسا رونما ہو گیا کہ جناب احمد ندیم قاسمی کو مرزا اسد اللہ خان غالبؔ سے بڑا قرار دینا نا گزیر نظر آیا۔ یہ نا چیز اپنی اس رائے پر قائم ہے اور آپ کو اختلاف کا حق دیتا ہے۔

☆☆☆

اس کو انور سدید سمجھے کون　　بات جو ہے گمان میں اُتری

پروفیسر شفیع ہمدم (جھنگ)

ڈاکٹر انور سدید

اردو ادب کی وادی میں پوری طرح داخل ہونے سے پہلے ہی میں ڈاکٹر انور سدید کے نام اور کام سے واقف تھا۔ اٹھائیس انتیس سال پہلے مجھے لکھنے لکھانے کا شوق تو نہیں تھا۔ البتہ ادبی رسائل اور کتب کے مطالعے سے ذوق کو تسکین ملتی تھی۔ ادبی رسائل و جرائد میں انور سدید کی تحریروں سے میرا نظری معانقہ اکثر ہوتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں بھی ادبی دنیا میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا تھا۔ اس وقت مجھے یہ قطعاً معلوم نہ تھا کہ وہ پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں۔ میں تو انہیں کسی کالج کا پروفیسر سمجھتا تھا۔ مطالعے کی محدودیت کے سبب ان کی تحریروں کے باطن میں چھپے ہوئے اسرار کے در پوری طرح کھولنے سے قاصر تھا۔ اس کے باوجود ان تحریروں کی کشش مجھے مقناطیسی انداز میں اپنی طرف کھینچ لیا کرتی تھی۔ بعض اوقات ان کے خالق کو دیکھنے کی خواہش دل میں شدت اختیار کر لیتی تھی۔ پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا تھا کہ اتنے بڑے آدمی سے سفارش یا کسی تقریب کے بغیر ملنا بہت مشکل ہے۔

کئی سال پہلے میں نے انور سدید کو پہلی مرتبہ لاہور کی ایک ادبی کانفرنس میں دیکھا تھا۔ کانفرنس کے اختتام پر ان سے مصافحہ کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ اسے پہلی ملاقات تو نہیں کہا جا سکتا کہ ملاقات میں ہم نشینی اور گفتگو کا ہونا ضروری ہے تاکہ دونوں اشخاص ایک دوسرے سے متعارف ہو سکیں۔ مصافحہ کرنے کے چند سال بعد مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے اور دیر تک گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ایک دفعہ میں اکیلا ہی ان کے دفتر ملنے گیا تھا۔ اپنا وزیٹنگ کارڈ بھجوایا تو انہوں نے بلا تاخیر مجھے اندر بلوالیا۔ جب میں نے ان کے آفس میں قدم رکھا تو ایک دراز قد کا خوش شکل کلین شیو ادھیڑ عمر آدمی سر جھکائے کسی پری وش (فائل) کی زلفوں کے پیچ و خم سنوارنے میں مصروف تھا۔ میں تو انہیں شکل سے پہچانتا تھا مگر انہوں نے مجھے وزیٹنگ کارڈ کی وجہ سے پہچانا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کھڑے ہو کر بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا اور دیر تک مزاج پرسی کرتے رہے۔ وہ گفتگو بھی کر رہے تھے اور چائے اور بسکٹ سے تواضع بھی۔ دوران گفتگو میں انہوں نے بتایا کہ ادبی رسائل و جرائد کی وساطت سے تو اکثر آپ سے ملاقات ہوتی رہتی ہے مگر بالمشافہ ملاقات آج ہوئی ہے۔ ''میں آپ سے چند سال پہلے بھی مل چکا ہوں''۔ میں نے کانفرنس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے ''مجھے تو کچھ یاد نہیں ہے۔'' مگر مجھے تو آپ کے ہاتھوں کالمس تک یاد ہے۔ میری بات سن کر وہ دھیرے سے مسکرا دیئے۔ اس روز ہم دیر تک ادبی گفتگو کرتے رہے۔ پہلی ملاقات کی خوشگوار بارش میں بھیگا ہوا جب میں ان کے دفتر سے باہر آیا تو مجھے ایسے محسوس

ہوا جیسے میرے اندر کی کثافتیں اس بارش نے دھو ڈالی ہوں اور میں سرسبز و شاداب ہو گیا ہوں۔

تقریباً دو سال بعد مجھے ان سے ملاقات کا پھر اتفاق ہوا۔ انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ گرجوشی کا مظاہرہ کیا۔ گفتگو کے دوران میں جھنگ اور جھنگ کے ادباء کا ذکر ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے ناصر عباس نیر کی خیریت دریافت کی۔ میں نے انہیں نیّر صاحب کی خیریت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا ''ہم دونوں ایک ہی کالج میں پڑھاتے ہیں۔ اس لے ان سے طویل نشستوں کے مواقع مل جاتے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور وہ دوسروں تک اپنے علم کی ترسیل کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ان کے ساتھ مکالمہ کر کے مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میرا ذہن پہلے کی نسبت زیادہ روشن ہو گیا ہے'' میری بات سن کر انور سدید بولے'' بے شک ناصر عباس نیر ایک ایسا نقاد ہے جس کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ تیز ہے۔ اس وجہ سے کم عمری میں اس کا شمار اردو کے صف اوّل کے نقادوں میں ہونے لگا ہے۔'' بعد ازاں انہوں نے خیر الدین انصاری، معین تابش اور حنیف باوا کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ تینوں آج کل شدید معاشی بحران کا شکار ہیں۔ خاص طور پر خیر الدین کی صرف مالی حالت ہی ابتر نہیں ہے۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بھی خستہ حالی کا شکار ہے۔ میری بات سن کر وہ سامنے پڑی ہوئی میز کو تکتے رہے پھر بولے'' اچھا ان کے لیے کچھ کرتے ہیں۔'' اس ملاقات کے تقریباً چھ سات ماہ بعد ایک تقریب میں جھنگ کے ناظم حمید سلطان نے خیر الدین انصاری (جواب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں) کو تیس ہزار روپے اور باقی دونوں کو پچیس پچیس ہزار کے چیک پیش کیے۔ (میں یہ بات بڑے دکھ سے لکھ رہا ہوں کہ معین تابش بھی دو روز پہلے ہمیں سوگوار چھوڑ گئے ہیں۔) یہ چیک پنجاب حکومت کے رائٹرز ویلفیئر فنڈ کی طرف سے جاری ہوئے تھے۔ یہ سب انور سدید کی تگ و تاز کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا سے سفارش کر کے دلوائے تھے۔ اس سلسلے میں جھنگ سے ناصر عباس نیر نے بھی آغا صاحب سے برابر رابطہ رکھا تھا۔ انور سدید کے سینے میں ایک دردمند دل دھڑک رہا ہے جو مصیبت زدہ لوگوں کے لیے تڑپ اٹھتا ہے۔ جو انہیں افتاد سے نکالنے کے لیے صرف دوا ہی نہیں کرتا دعا بھی کرتا ہے۔ ان کا شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں ایثار و قربانی کا مادہ وافر مقدار میں موجود ہے۔ جب ان کی ساس چھ بیٹیوں کے بعد اکلوتے بیٹے کو جنم دے کر اپنی جان ہار گئیں تو وہ اپنے خسر اور ان کے بچوں کی وجہ سے اپنی بیوی اور اکلوتے بیٹے سے اس وقت تک علیحدہ رہے جب تک کہ نومولود نے ہوش نہیں سنبھالا۔ ان کا یہ ایثار صرف اپنوں ہی سے مخصوص نہیں بلکہ غیروں کے ساتھ بھی وہ اسی حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے محکمے کا ایک افسر ٹریفک کے ایک حادثے میں اپنی جان گنوا بیٹھا۔ مرحوم کی بیوہ اور چار بچوں کی کفالت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ مرحوم کی بیوہ کو اس کا حق دلانے کے لیے چار سال تک مقدمہ لڑتے رہے۔ ان کے مقابل صاحب اقتدار لوگ تھے۔ ان سے ٹکر لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مگر انور سدید نہایت استقلال کے ساتھ ان کے مقابل ڈٹے رہے۔ بالآخر انہوں نے مقدمہ جیت لیا اور مرحوم کی بیوہ کو اس کا حق (نقدی کی صورت) میں دلا

کر دم لیا۔ ڈاکٹر صاحب کا اصل نام انوار الدین اور قلمی نام انور سدید ہے۔ انور سدید اگر مطلع ادب پر جلوہ افروز ہے تو سماجی سطح پر انوار الدین سرگرم عمل ہے جو رشتہ داروں اور واقف کاروں کی تقریباً سبھی تقاریب میں شریک ہوتا ہے اور اپنے رویے سے انہیں مطلق احساس نہیں ہونے دیتا کہ وہ آسمان ادب کا ایک روشن ستارہ ہے۔

انور سدید کو ایک مخصوص ادبی گروہ نے متنازع بنانے کی ناقابل رشک کوشش کی ہے مگر دوسری طرف ان کے قدردانوں، مداحوں اور دوستوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی موجود ہے۔ اپنے خلاف مخالفین کے حملے کو تو وہ اتنی اہمیت نہیں دیتے مگر جب کوئی شخص ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت پر حملہ آور ہوتا ہے تو ان کا راجپوتی خون جوش مارنے لگتا ہے اور حملہ آور کے ایسے لتے لیتے ہیں کہ اسے میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے۔ انہیں وزیر آغا سے بے پناہ عقیدت ہے۔ جب انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے دوبارہ تعلیمی سلسلہ شروع کیا تو مصروفیات کی وجہ سے وہ اپنے اندر کے ادیب کو تقریباً فراموش کر بیٹھے تھے۔ انہیں دوبارہ ادب کی طرف لانے والے ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ ورنہ آج وہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد دوسرے بہت سے ریٹائرڈ آفیسرز کی طرح گمنامی کی زندگی گزار رہے ہوتے۔ احباب کی محافل میں ان کے منہ سے پھول جھڑتے اور وہ زیر لب مسکراتے رہتے ہیں۔ مہمانوں سے پُر لطف باتیں کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ خاطر تواضع کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ آپ ان کی صحبت میں کچھ وقت گزار کر تو دیکھئے۔ تمام دنیوی تفکرات سے نجات حاصل کر کے تر و تازہ اور شاداب ہو کر اٹھیں گے۔

حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم انور سدید جب ادبی حریفوں سے معرکہ آرا ہوتے ہیں تو ان کی کایا کلپ ہو جاتی ہے اور وہ سراپا فولاد بن جاتے ہیں۔ وہ محبتیں کرنے اور دوستیاں نبھانے میں نہایت کشادہ دل اور پُر خلوص ہیں۔ دوستی اور محبت کے آمیزے میں دکھاوے یا ریاکاری کی آمیزش کے سخت خلاف ہیں۔ انہیں ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے جو دوستی جیسے پوتر رشتے کو اپنی ذاتی اغراض کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اپنے چہروں پر مصلحت اور خود غرضی کے نقاب چڑھائے ہوئے لوگ انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ انور سدید ان کے چہروں پر چڑھے ہوئے نقاب اتارتے ہیں تو وہ برانگیختہ ہو کر لفظوں کے تیر و تفنگ سے ان پر حملہ آور ہوتے ہیں مگر وہ بھی جب تک ان کی چیں نہ بول جائے، چین سے نہیں بیٹھتے۔

انور سدید جامع الکمال شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت نقاد، محقق، مبصر، ادیب، شاعر، مزاح نگار، انشائیہ نویس، خاکہ نگار، دانشور، مورخ، کالم نگار اور مترجم ہیں۔ اتنی ڈھیر ساری اصناف پر معیاری کام کرنا آسان نہیں ہے مگر وہ ان تمام اصناف سے انصاف کر رہے ہیں۔ قدرت نے انہیں ایسی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ تھکاوٹ اور اکتاہٹ کے لفظوں سے وہ ابھی تک ناآشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم کبھی تھکاوٹ کی زد میں نہیں آتا۔ انور سدید اب عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں عام طور پر نقاہت اور تھکاوٹ استقبال کے لیے پہنچ جاتی ہیں اور انسان کی کارکردگی کا گراف گر جاتا ہے۔ میری نظر میں ایسے بہت سے ادبی اور غیر ادبی لوگ ہیں

ضعف عمر کے سامنے جنہوں نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔انور سدید ایک ایسے قلم کار ہیں جن کے قلم پر عمر رسیدگی کے اثرات نہیں پڑے اوران کا رہوار قلم اب بھی پہلے جیسی رفتار سے جادۂ قرطاس پر دوڑ رہا ہے۔ان کی مستعدی کی وجہ اس کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے کہ انہوں نے بڑھتی ہوئی عمر کے عفریت کو اپنے اعصاب پر سوار نہیں ہونے دیا۔ان کی تصنیف وتالیف کی گئی کتب کی تعداد تین درجن کے لگ بھگ ہے اوران میں اضافے کا سلسلہ جاری ہے۔وہ اپنے ادبی کام کو توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔ایک دفعہ انہوں نے میرزا ادیب سے گفتگو کے دوران میں کہا تھا۔

روز قیامت میرے اعمال کی پرسش ہوگی تو میں اپنی ساری کتابیں اللہ میاں کے حضور پیش کر دوں گا اور کہوں گا یہ میرا اعمال نامہ ہے۔میرزا ادیب بولے۔اگر اللہ میاں نے یہ اعمال نامہ قبول نہ کیا تو؟

نہیں میرزا صاحب اللہ میاں بد ذوق نہیں ہیں۔وہ کوئی تعصب اور تنگ نظر نقاد بھی نہیں ہیں جنہیں صرف اپنوں کی تحریریں پسند آتی ہیں اور دوسروں میں سو سو کیڑے دکھائی دیتے ہیں وہ میری عبادت قبول کر کے مجھے داخل بہشت ہونے کی اجازت دے دیں گے۔

انور سدید کی نظر میں مال ومتاع اور جاہ واقتدار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔وہ محکمہ آبپاشی میں ایگزیکٹو انجینئر رہے ہیں۔جو بڑا منصب تھا مگر انہیں اس بات کا احساس تک نہ تھا کہ وہ ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔وہ تو اسے روزی روٹی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ان کی اس درویشی کا سبب یہ ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت ایسے لوگوں کے زیر سایہ ہوئی۔جن کا کردار بلند اور سینے علم کی روشنی سے منور تھے۔ان کی والدہ ایک پرہیز گار اور تہجد گزار خاتون تھیں۔ان کے والد بھی ایک درویش منش انسان تھے۔انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے والے اساتذہ بھی نہایت دیانت دار، محنتی اور باکردار اور باعمل لوگ تھے۔جو بچوں کی شخصیت سازی پر پوری توجہ دیتے تھے اورانہیں محنت کے ذریعے زندگی میں آگے بڑھنے کا سبق سکھاتے تھے۔ان برگزیدہ لوگوں کے زیر سایہ پرورش پانے اور پروان چڑھنے کی وجہ سے انور سدید کی شخصیت میں ایسا نکھار پیدا ہو گیا تھا کہ وہ تمام عمر مایا کے جال میں گرفتار نہ ہو سکے۔اگر آپ دنیا جہاں کی نعمتیں اور تعیش ان کے قدموں میں رکھ کر ان کے ہاتھ سے قلم لینا چاہیں تو وہ ہرگز تیار نہ ہوں گے۔قلم ان کی طاقت ہے جس کا سودا کرنے کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ جس طرح اساطیری کہانیوں میں دیو کی جان طوطے میں ہوتی تھی۔اسی طرح ان کی جان ان کے قلم میں ہے۔اسی لیے تو ان کا قلم ہر دم رواں دواں اور سدا جواں رہتا ہے۔ایک دفعہ میں نے ان کی بسیار نویسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔آپ اتنا کچھ کیسے لکھ لیتے ہیں ہندو وپاک کا کوئی بھی رسالہ اٹھاؤ آپ کی تحریر ضرور ہوتی ہے۔میرے خیال میں تو آپ نے کوئی جن قابو کر رکھا ہے جو لکھنے میں آپ کی مدد کرتا ہے۔میری بات سن کر وہ مسکرا کر بولے میرا شوق ایک ایسا جن ہے جو مجھ سے بے تحاشہ لکھواتا ہے اور کبھی تھکن کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ہر ذی روح کو زندہ رہنے کے لیے ہوا، پانی اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔میرے کھانے میں کتاب اور قلم کا مزید اضافہ کر لیجئے۔

انور سدید کے والد کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ ایف ایس سی میں اعلیٰ نمبر حاصل کر کے انجینئر بنیں مگر وہ تو ادب کی دیوی کے زیر اثر آ چکے تھے۔طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنے والد سے چھپ چھپ کر ادبی کتابیں پڑھتے اور افسانے لکھے تھے۔جب ان کے افسانے ادبی رسائل میں شائع ہو کر داد وصول کرنے لگے تو ان کی خوشبو ان کے والد تک پہنچ گئی۔انہوں نے اپنے بیٹے کی راہ میں حائل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ادب نے انہیں شہرت تو دلوا دی مگر اس ناموری نے انہیں محکمہ آبپاشی میں افسر کی بجائے کلرک بنا دیا۔پھر انہیں شدت سے احساس ہوا کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے شہرت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کا حصول بھی ناگزیر ہے۔چنانچہ وہ انجینئر نگ سکول رسول میں داخل ہو گئے۔اعزاز کے ساتھ امتحان پاس کر کے طلائی تمغہ حاصل کیا۔بعد ازاں انجینئر نگ میں گریجوایشن کی۔اس ڈگری نے ان پر ترقی کے در وا کرنے میں ''کھل جا سم سم'' کا کردار ادا کیا۔وہ ایس ڈی او اور ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے تک پہنچے۔دوران تعلیم انہوں نے اپنے اندر کے ادیب کو خواب آور گولیاں دے کر سلائے رکھا مگر اس کے باوجود اردو ادب کے منظر نامے سے غائب نہ ہوئے۔ان کے دوست انور گوئندی اس عرصے میں ان کے پرانے مسودات تلاش کر کے اپنے رسالہ ''کامران'' میں ان کی تحریریں شائع کرتے رہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے اندر کے ادیب کو خواب آور گولیوں کے اثر سے باہر نکالا اوران کا پہلا مضمون ''اوراق'' کی زینت بنا۔اس کے بعد تنقیدی اور تحقیقی مضامین تواتر سے شائع ہونے لگے اور بطور نقاد بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔اس کے بعد انہوں نے پرائیویٹ طور پر ایم اے کا امتحان دیا اور صوبے بھر میں اوّل رہے۔پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے وہ انور سدید سے ڈاکٹر انور سدید بن گئے۔ان کے مقالے کا موضوع تھا ''اردو ادب کی تحریکیں'' جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔انور سدید کا کلرک سے ایگزیکٹو انجینئر کا سفر اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کا حصول اس بات کا درس دیتا ہے کہ اگر قدرت نے انسان کو ذہانت جیسی دولت سے نوازا ہے تو وہ ذہانت کے گھوڑے کو محنت کی مہمیز سے سرپٹ دوڑا کر زیرو پوائنٹ سے ہیرو پوائنٹ تک پہنچ سکتا ہے۔

انور سدید کی ادبی دنیا میں شہرت اور پذیرائی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب ''روشنائی'' کے مدیر احمد زین الدین نے اپنے رسالہ میں ان کا گوشہ شائع کیا تو اہل قلم نے ان کے بارے میں اتنی تعداد میں مضامین ارسال کئے کہ رسالہ کے مدیر کو معذرت کرتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ انور سدید کے بارے میں ارسال کئے گئے مضامین کمپوز ہونے کے باوجود شامل اشاعت اس لیے نہ کئے جا سکے کہ اس سے پرچے کا توازن بگڑ جاتا۔ہنوز مضامین کے آنے کا سلسلہ جاری ہے۔احمد زین الدین کی معذرت کے آئینے میں انور سدید کی شہرت اور مقبولیت کا عکس اتنا واضح اور نمایاں ہے کہ ضعف بینائی میں مبتلا لوگوں کو بھی نظر کی عینک کے بغیر اس کے خدوخال آسانی سے نظر آ جائیں گے۔اگر اس کے باوجود کسی شخص کو دکھائی نہ دیں تو وہ اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی تعصب کی پٹی اتار کر دیکھے تو اس پر بھی اس عکس جلی کے نقوش اجاگر ہو جائیں گے۔ ☆☆☆

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

سعادت حسن منٹو۔ خطوط کے آئینے میں

ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط پر ایک کتاب مرتب کرتے وقت میں نے ''مقدمہ'' میں لکھا تھا: ''خطوط نگاری انسان کا نجی فعل ہے۔ اس لیے اسے بالعموم فن کا درجہ نہیں دیا جاتا۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ فن شخصیت کا پردہ ہے لیکن خط کسی پردے کو قبول نہیں کرتا۔ فن ابلاغ عام کا تقاضا کرتا ہے لیکن خط شرکتِ عام سے گریز کرتا ہے۔ خط کی غائت روئی خبر رسانی بھی ہے اور مخاطب کو راز داں بنانا اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا بھی، اس میں جو کچھ لکھا جاتا ہے یہ سمجھ کر لکھا جاتا ہے کہ اس کی تشہیر نہیں ہوگی اور مکتوب نگار اپنی شخصیت کو آشکار کر رہا ہے تو اس کی حقیقت مکتوب الیہ تک ہی محدود رہے گی۔''(۱)

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اچھی زندگی بسر کرنے کو فن کا درجہ دیا تو خط نگاری کو بھی ایک فن قرار دیا۔ تاہم انہوں نے اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا کہ

''اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے کسی کوشش کی ضرورت نہیں، فنونِ لطیفہ میں کمال حاصل کرنے کے لیے دنیا میں کچھ اصول ہیں، کچھ ضابطے ہیں لیکن محبت کرنے کے لیے نہ علمِ سینہ درکار ہے اور نہ علم سفینہ، اس لیے اگر کہا جائے کہ خط لکھنے کے لیے صرف قلم اور کاغذ کی ضرورت ہے تو خط لکھنے پر حرف آتا ہے اور نہ خط لکھنے والے پر، کاغذ اور قلم ہی تو نہیں، اس میں خونِ جگر بھی شامل ہے اور جہاں دل کی نسبت ہو وہاں بے اصولی بھی ایک اصول بن جاتی ہے۔ لغزشیں حسین ہو جاتی ہیں، لکنت میں رقص پیدا ہو جاتا ہے ستارے، چاند، سورج خود بنتے، سنورتے اور غروب ہو جاتے ہیں''(۲)

اسلوب احمد انصاری کے خیال میں ''اچھے اور مزے کے خطوط لکھنا ایک جبلی عطیہ ہے''(۳) میری رائے میں خط لکھنا انسان کی جبلت میں بھی شامل ہے اور یہ اس کی ایک سماجی ضرورت بھی ہے لیکن اچھا خط لکھنا واقعی قدرت کا عطیہ ہے اور فطرت نے اس عطیے کی تقسیم عام نہیں کی، اکثر خطوط اطلاع رسانی کا فریضہ ہی ادا کرتے ہیں لیکن بعض اوقات دور افتادہ ادیبوں میں سلسلہ مراسلت جاری ہو تو یہ نہ صرف فکری اور بامعنی مطالعے کی صورت اختیار کرتی جاتی ہے بلکہ اجنبی ہونے کے باوجود خلوص اور محبت کا رشتہ بھی استوار ہوتا چلا جاتا ہے اور مکتوب

نگار کے نہاں خانہ خیال تک رسائی حاصل کرنے میں بھی معاونت کرتا ہے۔ ادیبوں کے خطوط اس کے حقیقی باطن میں جھانکنے اور اس کی غیر آرائشی اور غیر مرصع شخصیت کے علاوہ اس کے فن کے بعض نقوش کے مطالعے کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں اور ادیب کے نجی خطوط کو ادب کی اقلیم میں شامل کر لیا جاتا ہے۔

یہ طویل تمہید میں نے اس لیے باندھی ہے کہ پچھلے دنوں مجھے منٹو کے خطوط کا ایک مجموعہ لمبے عرصے کے بعد دوبارہ پڑھنے کا موقعہ ملا تو ان خطوط میں منٹو کی معلوم شخصیت کی متعدد پرتیں میرے سامنے کھلتی چلی گئیں، یہ خطوط احمد ندیم قاسمی کے نام ہیں اور جنوری ۱۹۳۷ء سے لے کر فروری ۱۹۴۸ء تک کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب سعادت حسن منٹو بمبئی کی فلمی دنیا میں عملی زندگی کے جھمیلوں میں الجھے ہوئے تھے اور حوادثِ زمانہ کے تھپیڑوں کی زد میں تھے، احمد ندیم قاسمی لاہور میں اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے اور اس دور کے ایک ممتاز اور معروف افسانہ نگار کو نہ صرف حیرت سے دیکھ رہے تھے، ان کی تعریف وتحسین سے مزید لکھنے کی تحریک حاصل کر رہے تھے بلکہ ان کی تنقید وتنقیص کو مشعل راہ بھی قرار دے رہے تھے۔

منٹو جیسے عظیم افسانہ نگار کا اختر شیرانی کے ماہنامہ ''رومان'' میں ان کا افسانہ ''بے گناہ'' پڑھ کر انہیں دریافت کرنا اور احمد ندیم قاسمی، بی اے سے تعارف کی خواہش پیدا کرنا قاسمی صاحب کا اعزاز تھا جسے انہوں نے عقیدت کے جذبات سے موسوم کیا اور ان سے خطوط کے تبادلے میں قائم بھی رکھا۔ تاہم منٹو کے ذہن کے کسی گوشے میں قاسمی صاحب کے خطوط سے یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ مختلف راہوں کے مسافر ہیں اس کا ذکر ''منٹو کے خطوط''۔ کے پیش لفظ میں اس طرح کیا گیا ہے۔

''دہلی میں منٹو سے میری (احمد ندیم قاسمی کی) ملاقات ہوئی تو مجھے ایک ہی دن میں معلوم ہو گیا کہ منٹو کے ذہن میں اپنے اور میرے دوستانہ رشتے کے یکا یک ختم ہو جانے کا امکان کیوں موجود تھا۔(۴) تاہم انہوں نے لکھا۔

''یہ ملاقات ہمارے رشتے کا کچھ نہ بگاڑ سکی، اس لیے کہ اگر منٹو کی روزمرہ کی بیشتر دلچسپیاں میرے معمولاتِ حیات سے قطعی مختلف تھیں تو کم سے کم وہ سطح تو جب بھی محفوظ تھی جس پر ہم ایک دوسرے سے پیار کرنے والے دوستوں کی حیثیت سے مل سکتے تھے اور یہ سطح باہمی خلوص اور ایثار نے مہیا کر رکھی تھی۔''(۵) قاسمی صاحب کے حالیہ عدم برداشت اور عدم تحمل کی روشنی میں آخری بات کو ''جملہ معترضہ'' کے طور پر بھی قبول کر لیا جائے تو منٹو سے ان کی مرعوبیت کا یہ زاویہ اہم ہے کہ انہوں نے منٹو کے اپنے نام خطوط کو حفاظت سے رکھا اور ۱۹۶۲ء میں اس وقت ایک مجموعے کی صورت میں شائع کر دیا جب منٹو کو فوت ہوئے سات برس ہو چکے تھے۔''(۶)

قاسمی صاحب نے ہندوپاک کے ادیبوں سے، منٹو کے دوستوں اور عزیزوں سے بھی ان کے خطوط حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی، چنانچہ انہوں نے اپنے ذخیرے میں محفوظ خطوط پر ہی انحصار کیا

اور ''منٹو کے خطوط'' کے نام سے ایک کتاب اپنے ادارہ ''کتاب نما'' سے شائع کر دی۔ یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ منٹو نے دوسرے متعدد ادیبوں سے کبھی خط و کتابت ہی نہیں کی۔ جس باقاعدگی سے انہوں نے احمد ندیم قاسمی کو خطوط لکھے اور باہمی باتوں کے سلسلے کو آگے بڑھایا ہے اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ خط نگاری منٹو کی جبلت میں شامل تھی۔ چنانچہ انہوں نے ادبی مسائل اور ذاتی امور پر متعدد ادیبوں کو خطوط لکھے ہوں گے، ان پر مقدمات کے دور میں تو خط نگاری کی ضرورت زیادہ نمایاں قرار دی جاسکتی ہے لیکن اب افسوس سے یہی کہنا پڑتا ہے کہ ادیبوں نے سہل نگاری کا ثبوت دیا اور منٹو کے قیمتی خطوط کا تحفظ نہ کیا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قاسمی صاحب نے منٹو کے خطوط تلاش کرنے میں پوری کوشش نہیں کی جب کہ یہ بکھرے ہوئے خطوط اب بھی جمع کیے جاسکتے ہیں تاہم یہ مجموعہ غنیمت ہے جو منٹو کے مطالعے میں ایک بنیادی حوالے کی کتاب ہے۔ منٹو کے اس وسیلے سے احمد ندیم قاسمی بھی زندہ رہیں گے اور منٹو کے خطوط کا ذکر آئے گا تو ان کا نام بھی لیا جائے گا۔(۷)

منٹو کی پہلی کتاب ''اسیری کی سرگزشت'' ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی، جو وکٹر ہوگو کی کتاب ''لاسٹ ڈیز آف کنڈمڈ'' کا ترجمہ تھا۔ اس سے پہلے ان کے مطالعے کے آثار تو ملتے ہیں لیکن کسی تخلیقی سرگرمی کا نشان نہیں ملتا۔ چنانچہ منٹو کی ادبی زندگی صرف ۲۵ برس پر محیط ہے۔ اس میں سے ۱۱ سال کا عرصہ (جنوری ۱۹۴۸ء) احمد ندیم قاسمی کے نام خطوط میں محفوظ ہے۔(۸) منٹو کے پہلے خط سے ہی ان کی ادب دوستی اور اچھی تخلیق کے مطالعے پر گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ ہو جانے اور پھر تخلیق کے مصنف کو تلاش کرنے اور اس کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھانے کا رجحان ملتا ہے۔ انہوں نے اختر شیرانی کے رسالہ ''رومان'' لاہور میں احمد ندیم قاسمی کا ایک افسانہ پڑھا تو اختر شیرانی کو ایک خط میں لکھا:

''رومان'' صحیح معنوں میں ''جوان افطار'' کا علمبردار ہے۔ اس شمارے میں جتنے افسانے شائع ہوئے ہیں سب کے سب فنی نقطہ نگاہ سے معیاری ہیں۔ خاص کر ''بے گناہ'' مجھے بے حد پسند آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں اس کے قابل مصنف جناب احمد ندیم قاسمی بی۔ اے سے تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ براہِ کرم ان کے پتے سے واپسی ڈاک مطلع فرما کر ممنون کریں۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ چند سطروں کے بعد منٹو تاکید مزید کے طور پر لکھتے ہیں جس سے ان کا اشتیاق ظاہر ہوتا ہے۔

''احمد ندیم قاسمی کے پتے سے ضرور آگاہ فرمائیں۔''

اختر شیرانی کے تعارف کرنے پر قاسمی صاحب نے منٹو کو جو خط لکھا وہ دستیاب نہیں تاہم انہوں نے خود لکھا ہے کہ ''بے گناہ'' افسانہ کم اور داستان زیادہ تھا اور

''مجھے آج تک حیرت ہوئی ہے کہ منٹو اس افسانے سے کیوں متاثر ہوا؟''

احمد ندیم قاسمی کے نام پہلے خط سے ہی منٹو کی عالی ظرفی، کشادہ نظری اور ایک جونیئر ادیب کی جو

افسانے کی دہلیز پر ابھی قدم ہی رکھ رہا تھا اور افسانہ لکھنے کی بجائے داستاں نگاری کر رہا تھا۔۔ حوصلہ افزائی کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے پہلے ہی خط میں تحسین سخن شناس کا در کشادہ کر دیا اور مصنف کی تعریف اس موثر انداز میں کی کہ وہ اپنے فن کے ارتقاء کا اگلا قدم اٹھا سکے۔ منٹو کی بے لاگ توصیف دیکھئے جو مدلل بھی ہے اور بامعنی بھی اور اسے مبالغے سے عاری بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

''آپ کا افسانہ ''بے گناہ'' واقعتاً میں نے بے حد پسند کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے افسانے اردو میں بہت کم شائع ہوئے ہیں آپ کے ہاتھ پلاسٹک (plastic) ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کے موضوع کو آپ نے نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اسے چھو کر بھی دیکھا ہے۔ یہ خصوصیت ہمارے ملک کے افسانہ نگاروں کو نصیب نہیں۔ میں آپ کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ آپ میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔''

منٹو اُن دنوں رسالہ ''مصور'' کی ادارت کرنے کے علاوہ فلمی دنیا کے ساتھ بھی وابستہ تھے اور سلور سکرین کے لیے کہانیاں لکھ رہے تھے جن کے ناظرین جذباتی مناظر، جذباتی مطالعے اور جذباتی گیت زیادہ پسند کرتے تھے، منٹو نے افسانہ ''بے گناہ'' میں بھی عام لوگوں کی پسند کو ہی مدنظر رکھا اور قاسمی صاحب کو لکھا:

''افسانے میں آبجیکٹو (معروض) پچ بہت پیارے اور موزوں و مناسب ہیں، کئی عرصے سے میں فلمی افسانوں کی ماہیت پر غور کر رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے آپ کے افسانے کو غیر ارادی طور پر فلم ہی کی عینک سے دیکھا ورا سے بہت خوب پایا۔ Atmospheric پچ بے حد رہے ہیں۔ مثال کے طور پر:

''اس دن شام کو رحمان آٹا گوندھ رہا تھا۔ چڑیوں کے لاتعداد غول ''شی'' کی آواز سے اس کے مکان پر سے گزر جاتے تھے۔ چمگادڑیں بیری کی سوکھی ہوئی ٹہنیوں سے ٹکرا کر پھڑ پھڑاتی تھیں اور پھر ہوا میں تیرنے لگتی تھیں۔ بیل جگالی کر رہے تھے، ایک بکری اپنے ننھے سے بچے کے ماتھے پر منہ رکھے کھڑی تھی۔ رحمان دھیمے دھیمے سُروں میں یہ گیت گا رہا تھا:

''کوئی نئیں سُندا، دکھ چا جمع کراں، ماہیا''

منٹو نے رائے دی:

''فلمی افسانے میں اس قسم کی تفصیل بہت کارآمد اور مفید ہوتی ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ ''منظر نامہ'' بخوبی لکھ سکتے ہیں۔''

منٹو کے ابتدائی خطوط سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ وہ فن پارے کے عقب سے مصنف کو اس کی تمام سماجی ضرورتوں سمیت دریافت کر لیتے تھے اور پھر اس کی مستقبل سازی کے لیے بھی کوشاں ہو جاتے تھے، دوست کی معاونت کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے قاسمی صاحب کو بھی لکھا:

آپ ''بے گناہ'' جیسا کوئی اور افسانہ لکھیں، میں کوشش کروں گا کہ وہ فلم ہو جائے یہاں کے چند

ڈائریکٹروں سے میرے اچھے مراسم ہیں۔افسانہ لکھتے وقت یہ خیال رکھیے کہ اس میں پبلک کی دلچسپی کا کافی سامان ہو۔ دیہاتی رقص، دیہاتی گانے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں آپ بڑی آسانی سے اپنے افسانے میں رکھ سکتے ہیں۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''جو کچھ میں نے سیکھا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس کو سیکھ لیں، مگر مشکل یہ ہے کہ تحریر کے ذریعے سے یہ نہیں ہو سکتا۔منظر نگاری ایک فن ہے جس کو باقاعدہ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ بہر حال میں آپ کی خواہش کے مطابق آپ کو چند نمونے بھیج رہا ہوں۔شاید آپ ان سے کچھ سمجھ سکیں۔''

اپنے خطوط کے کینوس پر منٹو ہمیں بے حد مخلص، بے لوث اور بے ریا شخص نظر آتے ہیں۔اس دور میں وہ خود مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔مالی حالات اچھے نہیں تھے، مزاج میں انتہا درجے کی انا پسندی تھی لیکن کسی دوسرے کو تکلیف میں مبتلا دیکھ کر منٹو پگھل جاتے تھے۔قاسمی صاحب نے ایک خط کے حاشیے میں لکھا ہے کہ ''وہ ان دنوں گریجوایشن کے بعد بیکاری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔'' منٹو نے ان کی اس مشکل کو ابتدا میں ہی بھانپ لیا تھا وہ ان سے ہمدردی کا اظہار بھی کر رہے تھے اور زندگی کے حقیقی نشیب و فراز سے بھی باخبر کر رہے تھے۔میرا قیاس ہے کہ فلمی دنیا کی چکا چوند سے قاسمی صاحب بھی متاثر تھے اور انہوں نے شاید کسی خط میں فلم کی دنیا میں آنے کا خیال بھی ظاہر کیا ہوگا۔منٹو نے انہیں لکھا:

''فلمی دنیا میں قدم رکھنے کی خواہش کالج کے ہر طالب علم کے دل میں ہوتی ہے۔آج سے کوئی عرصہ پہلے یہی جنون میرے سر پر بھی سوار تھا۔ چنانچہ میں نے اس جنون کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بڑے جتن کیے اور انجام کار تھک ہار بیٹھ گیا۔احمد ندیم صاحب! دنیا وہ نہیں جو ہم اور آپ سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہے ہیں، اگر آپ کو کہیں سٹڈیو کی سیاسیات مطالعہ کرنے کا موقعہ ملے تو آپ چکرا جائیں۔فلم کمپنیوں میں ان کو زیادہ اثر ہے جن کے خیالات بوڑھے اور پیش پا افتادہ ہیں، جو جاہل مطلق ہیں اور وہ لوگ جو اپنے سینوں میں فن صحیحہ کی پرورش کرتے ہیں، انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔''

لیکن اس سب کے باوجود احمد ندیم قاسمی کی مدد کرنے پر ہمہ وقت تیار تھے۔ان کے باطن سے اس فنکار کو برآمد کر رہے تھے جو فلم کی ضرورت کے مطابق ان کا اور ریڈیو کی ضرورت کے مطابق ''اوپیرا'' لکھ سکے، وہ اپنی مالی حالت پر کوئی پردہ نہیں ڈالتے اور اپنے عادات و خصائل کو بھی منکشف کرتے چلے جاتے ہیں:

''میں بمبئی میں پچاس روپے ماہوار کما رہا ہوں اور بے حد فضول خرچ ہوں، آپ یہاں چلے آئیں تو میرا خیال ہے کہ ہم دونوں گزر کر سکیں گے۔میں اپنی فضول خرچیاں بند کر سکتا ہوں۔ یہ بھی آپ کی مجبوریوں کا کامل احساس ہے۔اس لیے کہ میں ان مجبوریوں سے گزر چکا ہوں۔''

منٹو کا یہ انتباہ معنی خیز لیکن ان کی صاف گوئی اور حقیقت بیانی کا مظہر:

''آپ یہاں تشریف لا سکتے ہیں مگر ہر بات یاد رکھیے کہ آپ کو میری زندگی کی دھوپ چھاؤں میں رہنا ہوگا میرے پاس چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں ہم دونوں رہ سکتے ہیں۔کھانے کو ملے نہ ملے مگر پڑھنے کو کتابیں مل جایا کریں گی۔''

''اگر آپ بمبئی آنا چاہیں تو میں ''مصور'' کی ادارت کے لیے بات چیت کر سکتا ہوں۔تنخواہ ۴۰ روپے سے زیادہ نہ مل سکے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جیسے ادیب کے لیے یہ رقم باعث ہتک ہے مگر کیا کیا جائے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان خالصتاً نجی خطوط میں منٹو اپنی ذات کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہیں۔انہوں نے اپنے سر پر فن کی کوئی زریں کلاہ سجا نہیں رکھی، تن پر ریشمیں قبا نہیں پہنی ہوئی، ان کے ظاہر اور باطن کا ایک ہی رنگ ہے اور قاسمی صاحب نے انہیں اہمیت اور اہلیت کا احساس دلانے اور انا کے غبارے میں ہوا بھرنے کی کوشش کی تو منٹو نے ترت جواب دیا:

''آپ نے میری قابلیت اور اہلیت کا اندازہ لگانے میں جلدی سے کام لیا ہے۔شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے خود کو کبھی ادیب کی حیثیت میں پیش نہیں کیا۔میں ایک شکستہ دیوار ہوں جس پر سے پلستر کے ٹکڑے گر گر کر زمین پر مختلف شکلیں بناتے رہتے ہیں۔''

''مجھ میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں اس لیے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں اور اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ ان ہی کمزوریوں کے باعث مجھے کئی صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔میں اسی تلخ حقیقت کے پیش نظر شاید آپ سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ آپ میرے متعلق کوئی رائے مرتب نہ کریں۔''

''میری زندگی ایک دیوار ہے جس کا پلستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔کبھی چاہتا ہوں کہ یہ سب اینٹیں پراگندہ کر دوں۔کبھی یہ جی میں آتا ہے کہ اس ملبے کے ڈھیر پر ایک نئی عمارت کھڑی کر دوں......میں سمجھتا ہوں کہ زندگی اگر پرہیز میں گزاری جائے تب بھی قید ہے اگر بدپرہیزیوں میں گزاری جائے تو بھی قید۔کسی نہ کسی طرح ہمیں اس ادنیٰ جراب کے دھاگے کا ایک سرا پکڑ کر اسے ادھیڑتے چلے جانا ہے اور بس۔میں اپنا کام آدھے سے زیادہ کر چکا ہوں۔باقی آہستہ آہستہ کر دوں گا۔اس لیے کہ میں بہت جلد مرنا نہیں چاہتا۔''

منٹو کے خطوط سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے باری علیگ سے فیض حاصل کیا تھا تو اس فیض کی تقسیم عام دوسروں میں کرنے کی سعی بھی کی۔احمد ندیم قاسمی کے خطوط میں وہ اپنے مخاطب کے ذوق کو باری علیگ کے استوار کئے ہوئے خطوط پر مائل بہ ارتقاء کر رہے ہیں اور انہیں بڑے قیمتی مشورے دے رہے ہیں، مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ناولوں کو فلم کے لیے ''اڈاپٹ'' (Adopt|) کرنے کا خیال اچھا ہے مگر معاف کیجئے جو مصنف آپ نے چنا ہے وہ میری نظر میں کوئی خاص وقعت نہیں رکھتا۔ ایسی داستانیں ان رنگین پردوں کے مترادف ہوتی ہیں جن کے پیچھے کچھ نہ ہو۔ میں اس افسانہ نگار کا قائل ہوں جس کی تخلیق دیکھنے کے بعد ہم کچھ دیر سوچیں۔''

اس مقام پر وہ قاسمی صاحب کو مندرجہ ذیل مصنفین میں سے کسی ایک کی کتاب فلم کے منتخب کرنے کے لیے کہتے ہیں: ''چیخوف، طالسطائی، میکسم گورکی، تورگنیف، دوستوفسکی، اندریف، میری کوریلی، وکٹر ہیوگو، گستاؤ فلابیئر، ایمل زولا، پیرلوئی۔ ڈکنز۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''مارگریو کی کتاب کا ضرور مطالعہ کیجئے اور اگر ہو سکے تو روسی ڈائریکٹر پڈوکن (pudocvkin) کی کتاب بھی پڑھ ڈالیے۔ آپ کو اس میں ٹیمپو (Tempo) کے متعلق بہت مفید باتیں معلوم ہوں گی۔''

اس دور میں احمد ندیم قاسمی ممتاز مزاح نگار محمد خالد اختر کے سحر میں تھے جو آر، ایل، اسٹیونسن کے عاشق تھے، چنانچہ انہوں نے منٹو سے اسٹیونسن کی کتابوں کا ذکر کیا تو منٹو نے بڑے سلیقے سے روسی ناول نگاروں کی عظمت کا ذکر کیا: اقتباس حسب ذیل ہے۔

''اسٹیونسن کی جن تصانیف کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ وہ بہت اچھی ہیں، فنی اور ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی ان کا مرتبہ بلند ہے لیکن جو چیز آپ کو روسی ناول نویسوں کے افکار میں ملے گی اس کا ان کتابوں میں نام ونشان بھی نہیں۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاسمی صاحب کے افسانے ''بے گناہ'' نے منٹو کے ذہن پر جو اثر پیدا کیا تھا وہ لمبے عرصے تک قائم رہا لیکن بعد میں وہ ان پر کڑی تنقید کرنے لگے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ قاسمی صاحب کے نئے افسانے انہیں کچھ زیادہ قبول خاطر نہیں ہوئے۔ مثلاً افسانہ ''مسافر'' کو دیہات کے اس کچے مکان کے مترادف قرار دیا جس کو ایک نوخیز معمار نے تیار کیا ہو۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کی اسٹوری میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ فلمی نہیں، وہ فلمی کس طرح نہیں، اس سوال کے جواب کے لیے کئی صفحات درکار ہوں گے......فلمی افسانہ نگاری سمجھنے کے لیے اسٹوڈیو بہترین استاد ہے۔''

منٹو تعریف وتوصیف سے تنقید کی طرف آئے تو انہوں نے قاسمی صاحب کو لگی لپٹی رکھے بغیر آگاہ کیا کہ:

''آپ بقدرِ کفایت ضبط کو کام میں نہیں لاتے۔ آپ کا دماغ اسراف کا زیادہ قائل ہے ایک چھوٹے سے افسانے میں آپ نے سینکڑوں چیزیں کہہ ڈالی ہیں......آپ کا یہ افسانہ پڑھ کر آپ مجھے اس بچے کی مانند نظر آئے جو سینما ہال میں فلم دیکھتے دیکھتے بیچ میں کئی بار بول اٹھتا ہے۔''

افسانہ ''ماں'' کے بارے میں منٹو نے خیال ظاہر کیا کہ:

''ایک اچھے افسانے کو خراب ایڈیٹنگ نے پھیکا بنا دیا ہے۔ آپ ترتیب کا خیال رکھا کریں۔ اس کے

علاوہ ''ماں'' میں آپ نے گرم اور سرد پانی کو سمونے کی کوشش کی ہے جس میں آپ ناکام رہے ہیں۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ منٹو نے ''گنجے فرشتے'' لکھنے سے بہت پہلے قاسمی صاحب اور ان کے چند مداحوں کا اپنے خطوط میں ہی ''دھڑن تختہ'' کر دیا۔ انہوں نے اختر شیرانی سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا تو منٹو نے لکھا:

''اختر شیرانی سے آپ کو عقیدت ہے۔ کسی سے عقیدت رکھنا بڑی بات نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ غایت درجہ سادہ لوح ہیں اور ہڈیوں کے گودے تک جذباتی......''

''آپ نے ہیرو کے رول کے لیے دو ایکٹروں کا نام تجویز کیا ہے۔ ان ناموں نے آپ کے خط کی ساری شعریت کا ناس مار دیا ہے۔ وہ بالکل جاہل ہیں۔ کاٹھ کی پتلیاں ان سے کہیں اچھا ایکٹ کر سکتی ہیں۔''

ان خطوط میں منٹو کا اپنے معاصرین کے بارے میں اپنی کھردری لیکن سچی رائے دینے کا رجحان بھی نمایاں ہے۔ مثلاً دیویندر ستیارتھی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''دیویندر ستیارتھی کا ٹیلی فون آیا۔ میں نے اس کو گالیاں دیں، میرے دل میں اس کے متعلق جو خیالات بھی تھے ان کا اظہار کر دیا اور اسے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتا......صفیہ نے فون پر میری باتیں سنیں، مجھے برا بھلا کہا لیکن میں نے اس سے کہا کہ میں دل میں نفرت رکھتے ہوئے زبان پر پیار اور محبت کے الفاظ نہیں لا سکتا۔''

''اختر حسین رائے پوری کا افسانہ پڑھ کر افسوس ہوا ''محبت اور نفرت'' کا مصنف ایسی پوچ چیز لکھے!!''

ان خطوط میں منٹو زندگی کے جھمیلوں میں الجھا ہوا، باد حوادث کا سامنا کر رہا ہے، فضول خرچیوں کا دائرہ وسیع اور آمدنی کے وسائل کم ہیں، منٹو ان نامساعد حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں لیکن جب ''بے مہر'' اور ''طوطا چشم'' لوگوں سے پالا پڑتا ہے تو منٹو غمزدہ ہو جاتے ہیں۔ ان کو کرب میں مبتلا کرنے اور ذہنی اذیت دینے والے دو کردار نذیر لدھیانوی اور پنڈت کرپارام ہیں، نذیر لدھیانوی ہفتہ وار رسالہ ''مصور'' کا مالک تھا جسے منٹو نے ۶ سال تک اپنے خون سے پروان چڑھایا تھا، لیکن نذیر لدھیانوی نے دوستی اور گہرے تعلقات کو خاطر میں نہ لا کر منٹو کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ پنڈت کرپارام ''فلم مووِیز'' کے ایڈیٹر اور نذیر لدھیانوی کے دوست تھے۔ منٹو کو خدشہ تھا کہ ''مصور'' سے برخاستگی کے بعد کرپارام بھی ان سے ناراض ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی خودداری اور انا کو قائم رکھا اور ''فلم انڈیا'' کے ایڈیٹر بابوراؤ پٹیل کے پاس لے گئے جس نے رسالہ ''کارواں'' کی ادارت منٹو کے سپرد کر دی۔ مصور سے انہیں ایک سو بیس روپے ماہوار کی آمدن تھی، پٹیل سے ساٹھ روپے ماہوار پر ملازمت طے ہوئی لیکن قابل تحسین بات یہ ہے کہ دوستی کو گزوں سے ناپنے والوں کے سامنے منٹو نے گردن نہیں جھکائی۔ منٹو نے کرپارام کا مکروہ کردار ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''پنڈت جو فوج میں رہ چکے تھے اس لیے وہ ہر شے کو فوجی نظر سے دیکھتے ہیں، جب وہ کسی سے دوستی کرتے

ہیں تو فوجی خطوط پر اور جب کسی سے دشمنی اختیار کرتے ہیں تو ان کے دماغ میں مورچہ بندی کا خیال آ جاتا ہے۔''

پٹیل کے پاس ملازمت نصف مشاہرے پر ملنے کے بعد منٹو کی ملاقات کرپارام سے ہوئی تو اس کے یہ الفاظ منٹو کے دل کو لہولہان کر گئے میرا خیال تھا کہ نوٹس ملتے ہی تم اور صفیہ میرے پاس آؤ گے۔ ہم کوئی مصالحت کی صورت پیدا کر لیں گے مگر تم نہ آئے اور بابوراؤ پٹیل کے پاس چلے گئے۔''

منٹو نے لکھا ہے:

کرپارام کے یہ الفاظ بستر مرگ پر بھی مجھے یاد رہیں گے...... ان کو شاید معلوم نہیں تھا کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک سو بیس روپے کھو دینے پر بھی بھیک نہیں مانگتے...... جب میرے جذبات کی قدر ہی نہیں کی گئی تو میں کیوں انہیں پامال کراتا۔''

منٹو کے خطوط میں یہ سب سے طویل اور سب سے دردناک خط ہے جس میں منٹو ٹوٹا ہوا اور شکستہ دل نظر آتا ہے لیکن اب بھی آتش انتقام ان کے دل میں بھڑک رہی ہے اور وہ کہہ رہے ہیں۔

''خدا کی قسم میں ان کو رلا سکتا ہوں...... میں انہیں ایک روز ضرور اپنے سامنے بٹھاؤں گا اور اتنا بولوں گا، اتنا بولوں گا کہ ان کے کان بہرے ہو جائیں گے۔ انہوں نے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔''

اس خط میں منٹو نے اپنی دوستی کی ڈاکٹرائن بھی پیش کر دی ہے اور واضح کیا ہے کہ

''جب میں کسی سے دوستی کرتا ہوں تو مجھے اس بات کی توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنا آپ میرے حوالے کر دے گا۔ دوستی کرنے کے معاملے میں میرے اندر یہ ایک زبردست کمزوری ہے جس کا علاج مجھ سے نہیں ہو سکتا۔''

اس مرحلے پر وہ قاسمی صاحب کو بھی یاد دلاتے ہیں کہ

''جب آپ نے اپنی دوستی کا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں نے آپ سے کئی بار کہا تھا کہ آپ مجھے دوست نہ بنائیں، صرف اسی کمزوری کے باعث میں نے آپ سے درخواست کی تھی۔ اب بھی آپ سے میری یہی درخواست ہے...... میں اب ہر وقت سہما سہا رہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ یہی سلوک نہ کریں؟''

خوفزدہ منٹو کی آخری بات کے سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کے پیش لفظ سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کرنا ہی کافی ہے:

''جب میں ۱۹۴۸ء میں پشاور چھوڑ کر لاہور آ گیا تو منٹو بمبئی چھوڑ کر وہاں آ چکا تھا اور یہاں ہمارے درمیان سب سے پہلے نظریات کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں بھی ہم دونوں کا خلوص محفوظ رہا مگر پھر میں نے دو تین بار منٹو کی ذات پر تنقید کر دی۔ ساتھ ہی اس کے چند دوستوں کو بھی برا بھلا کہہ دیا جو مارے خلوص کے اس کی بربادی کی رفتار تیز تر کرتے رہتے تھے۔ اس پر منٹو مجھ سے بگڑ گیا اور مجھے اس کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھولے گا ''میں نے تمہیں اپنے ضمیر کا امام مقرر نہیں کیا ہے۔ صرف دوست بنایا ہے'' نتیجہ یہ ہے کہ میں نے منٹو سے کترا کر نکل جانے

ہی میں اپنی اور اپنے جذبے کی عافیت سمجھی۔''

تاریخ میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے جن ادباء پر اپنے رسائل کے دروازے بند کر دیے تھے، ادب پر پہلا مارشل لاء جاری کیا تھا اور غیر ترقی پسندوں کی اشاعت ممنوع قرار دی تھی، ان میں سعادت حسن منٹو کا نام بھی شامل تھا۔ بقول احمد بشیر مرحوم، پابندی کی یہ قرارداد احمد ندیم قاسمی صاحب کے ڈرائنگ روم میں منعقد کیے جانے والے اجلاس میں منظور کی گئی تھی۔

یہ خطوط لکھے جانے کے بعد سعادت حسن منٹو پاکستان میں سات برس تک زندہ رہے، اس عرصے میں انہوں نے مالی تنگ دستی کے کرب ناک ایام گزارے، تخلیق کاری کی رفتار تیز کر دی اور اپنے افسانے اونے پونے فروخت کر کے اپنی عائلی زندگی اور شراب نوشی کی ضرورتیں پوری کرنے کی سعی کی اور اس خطرے کا انجام بھی سامنے آیا جو وہ بمبئی سے خطوط لکھتے وقت محسوس کر رہے تھے کہ جب احمد ندیم قاسمی کو انہیں نزدیک سے دیکھنے کا موقعہ ملے گا تو ان کا طلسم ٹوٹ جائے گا اور دوستی میں دراڑ پڑ جائے گی۔ منٹو کے یہ خطوط ذاتی نوعیت کے ہیں لیکن ان میں وہ حقیقی منٹو موجود ہے جس نے ''نیا قانون''۔ ''خوشیا''۔ ''کالی شلوار''۔ ''دھواں'' اور ''ہتک'' جیسے افسانے لکھے تھے اور جو باری علیگ کی روایت کی پاسداری میں فکشن کا شوق اور مطالعے کا ذوق اپنے ایک معاصر کے دل میں جگا رہا تھا اور اس کی معاونت کے لیے بار بار بمبئی بلانے کی پیشکش کر رہا تھا۔ منٹو کے خطوط سے احمد ندیم قاسمی کی خودنمائی کا کوئی پہلو سامنے نہیں آتا اور ان خطوط کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کے بعض خدوخال کا مشاہدہ کرنے کا موقعہ بھی ملتا ہے اور یہ بین السطور مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ منٹو نے ان کی ناکام تحریروں کی طرف جا بجا اشارے کئے ہیں تو ان کی تحسین اور تعریف بھی فراوانی سے کی ہے۔ انہیں جذبات زدہ قرار دیا ہے تو ان کی راہنمائی کا فریضہ بھی ادا کیا ہے اور اب یہ کہنا مناسب ہے کہ قاسمی صاحب نے منٹو کے خطوط کا یہ مجموعہ شائع کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ وہ منٹو جو اپنے افسانوں، خاکوں اور طنزیہ مضامین کے علاوہ اپنی فلموں میں بھی موجود ہے اس کا ایک سچا اور خالص روپ ان خطوط میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

قاسمی صاحب! اس پیشکش پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

حوالہ جات

۱۔ ''وزیر آغا کے خطوط۔ انور سدید کے نام''۔ صفحہ ۷۔ (مکتبہ فکر و خیال ۲۔۱۷ ستلج بلاک۔ لاہور۔ مارچ ۱۹۸۵ء)

۲۔ ''اردو نثر کا فن ارتقاء''۔ صفحہ ۳۹۵۔ مولفہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مقالہ ''خاکہ نگاری از ڈاکٹر خورشید الاسلام''
(الوقار پبلی کیشنز۔ لاہور۔ ۲۰۰۳ء

۳۔ اسلوب احمد انصاری۔ بحوالہ ''وزیر آغا کے خطوط'' حولہ ایضاً ص۔۸

۴۔ ''منٹو کے خطوط''۔صفحہ ۶۔حوالہ ایضاً

۵ ۔ ایضاً

۶۔ منٹو۔پیدائش ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء۔وفات ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء

۷۔علی عباس جلدی پوری کی کتاب ''روحِ عصر'' کے دیباچے میں قاسمی صاحب نے لکھا تھا کہ ''یہ کتاب زندہ رہے گی اور اس کے ساتھ اس کا دیباچہ نگار بھی زندہ رہے گا۔''

۸۔منٹو کے خطوط۔مرتبہ احمد ندیم قاسمی۔کتاب نما۔لاہور۔۱۹۶۲ء اس مقالے کے تمام اقتباسات متذکرہ کتاب سے لیے گئے ہیں۔

''دراصل تقسیم کے بعد ہمارے ہاں اچھے اور نامور فنکاروں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔جو چند ایک ہیں،ان میں آپ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔اس بنا پر حسن عسکری کو اچانک آپ کی فنی عظمت کا شعور والہام ہوا اور انہیں پتہ چلا کہ منٹو تو بہت اچھا افسانہ نگار ہے!۔۔۔اور آپ نے یہ کیسے مان لیا کہ حسن عسکری تو پاکستان کا بہت بڑا نقاد ہے!۔۔۔لطف یہ ہے کہ اس تعریف و توصیف کے عین وسط میں رسالہ ''اردو ادب'' خیمہ زن ہے جس کو آپ دونوں مرتب کر رہے ہیں۔منٹو اور عسکری۔۔زندگی اور خوابیدگی!۔۔۔آگ اور پانی!''

(احمد ندیم قاسمی بنام منٹو

مطبوعہ ''سنگِ میل'' پشاور ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۸ء، بحوالہ سہ ماہی تشکیل کراچی شمارہ: دسمبر ۲۰۰۵ء)

منٹو نہ صرف کھوکھلی اقدار کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیتے ہیں بلکہ عام انسانوں کے کو بھی اُلٹ دینے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔۔۔۔اقدار کے سلسلے میں منٹو کا دوسرا زاویۂ نگاہ ان بیرونی سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کا جائزہ ہے جو ان کے گرد و پیش کے سماجی حالات،ثقافت اور اقتدار پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔۔۔پاکستان کے لئے امریکی فوجی اور معاشی امداد کا پیش منظر وہ یوں بیان کرتے ہیں: ''امریکی اوزاروں سے کتری ہوئی بسیں ہوں گی،امریکی مشینوں سے سلے ہوئے شرعی پاجامے ہوں گے۔امریکی مٹی کے اَن ٹچڈ بائی ہینڈ (Untouched by Hand) قسم کے ڈھیلے ہوں گے۔امریکی رحلیں ہوں گی اور امریکی جائے نمازیں ہوں گی۔بس آپ دیکھئے گا چاروں طرف آپ ہی کے نام کے تسبیح خواں ہوں گے''

ترنم ریاض کے مضمون **منٹو: نظریے اور سماج** سے اقتباس۔

بحوالہ کتاب **چشمِ نقشِ قدم** صفحہ نمبر ۹۰۔۹۱)

ماہیے: خاور اعجاز (ملتان)

اک حد پر رہنا ہے
لیکن دریا میں
مِل کر ہی بہنا ہے

چائے ہے پیالی میں
قیدی ہو گئے ہم
آزاد خیالی میں

کچھ دُور ہی چلنا تھا
اُس بے مہر نے پھر
رستہ تو بدلنا تھا

اندر ہی سسکنا ہے
لیکن کاغذ پر
کچھ بھی نہیں لِکھنا ہے

پیڑا ہے آٹے کا
ظالم سے یاری
سودا ہے گھاٹے کا

وعدے نہ دلاسے پر
ہم مَر مِٹتے ہیں
سجنی ترے ہاسے پر

شِیرا ہے جلیبی کا
کوئی بھروسہ نئیں
اُس جیسے فریبی کا

گاؤں میں اٹکے ہیں
لیکن کچھ شہری
ہم سے بھی جٹکے ہیں

ہر سمت دھماکے ہیں
کچھ دنیا اُتھری
کچھ لوگ لڑاکے ہیں

دل ڈوبا جاتا ہے
ڈھولا تیرے بِن
پہلا جگرا تا ہے

ترے گال پہ تِل ماہیا
رکھّے پھرتے ہیں
ہم ہاتھ پہ دل ماہیا

ہم خواب اگر ہوتے
تیری پلکوں کے
سائے میں پڑے سوتے

مہتاب نکل آیا
رات کے ملبے سے
مِرا خواب نکل آیا

تعبیر کے رستے پر
پتھّر آن گرا
خوابوں کے بستے پر

پھر چاہے سو جائیں
تیری آنکھوں میں
کچھ خواب پرو جائیں

بے تاب نہیں ہوتے
بچپن سے آگے
پھر خواب نہیں ہوتے

چلنے میں گھاٹا ہے
خوابوں سے آگے
بالکل سنّاٹا ہے

وہ حد بھی آنی ہے
جس پر اک لغزش
بے حد امکانی ہے

خاور اعجاز

کشتی کے چاؤ میں
بہہ نکلے ہم بھی
دریا کے بہاؤ میں

غم کا انبار لگا
خُوشیوں کا میلہ
بس دن دو چار لگا

شاہوں نہ غریبوں سے
سُکھ والا لمحہ
مِلتا ہے نصیبوں سے

سونا چاندی گھر میں
جذبے رکھّے ہیں
سجنی نے لاکر میں

دل کے دروازے سے
اُس نے جھانکا ہے
کتنے اندازے سے

وعدے پیمانوں کی
کھُل گئی رستے میں
گٹھڑی امکانوں کی

بجھ جائے گی پیاس آؤ
صحرا کہتا ہے
اک دن مرے پاس آؤ

منظر ڈھہ جاتا ہے
لیکن ایک دیا
جلتا رہ جاتا ہے

رستے ہیں خلاؤں میں
مٹی ہے سر پر
اور کرنیں پاؤں میں

دریا کے نیچے سے
صحرا نکلا ہے
پانی کے دریچے سے

اک شکل دکھاتا ہے
پھر آئینے میں
بس دُکھ رہ جاتا ہے

اب طعنے دیتے ہو
جب ہاتھ آتے ہیں
کیوں جانے دیتے ہو

دونوں برباد ہُوئے
ظالم دنیا سے
لیکن آزاد ہُوئے

پکّی تھی ارادوں کی
ٹوٹ گئی لیکن
چوڑی ترے وعدوں کی

کافی یہ اشارہ ہے
اُس کے ہونٹوں پر
اک سرخ ستارہ ہے

منزل ہے نہ رستہ ہے
وہ اک گھاٹی پر
رکھا گلدستہ ہے

پتّہ بھی نہیں ہِلتا
مولا دنیا میں
انصاف نہیں مِلتا

صنفوں کا ادب کرنا
ماہیا کہتے ہُوئے
کم ایک سبب کرنا

ماہیے
سعادت سعید (لاہور)

گوری کے لگی مہندی
دل خاموش رہا
اور مہک اٹھی ڈولی

بیساکھی کے میلے ہیں
آیا نہیں ماہی
ہم گھر میں اکیلے ہیں

گھنگور گھٹاؤں میں
کب درویش ملیں
ریشم کی عباؤں میں

نرگس کے پھول کھلے
آنکھ ہوئی پاگل
شاید کوئی آن ملے

کوکی ہے کہیں کویل
دھڑک اٹھا رستہ
آنگن میں بجی پایل

کھیتوں میں اگی سرسوں
خواب ادھورا سا
یاد آئے گا وہ برسوں

ماہیے
ترنم ریاض (دہلی)

کِس کِس سے کہے گی تُو
کوئی نہ دیکھے کہیں
پلکوں میں چھپے آنسو

دل میں ہی سمایا رہے
راز مرے دل کا
افشا ہی نہ ہو جائے

ہاں غم کو چھپا نہ سکوں
آہ نکل جائے
کتنے بھی جتن کرلوں

کچھ بھی نہ بتاؤں گی
چھیڑو نہ سکھیو مجھے
رونے لگ جاؤں گی

سب خوشیوں سے ڈرتا ہے
اب تو مرا ہر پل
دل رونے کو کرتا ہے

بس مرگ جوانی ہو
آہوں بھری دنیا!
اب ختم کہانی ہو

ماہیے
خاور چودھری (اٹک)

جا تجھ سے نہیں ملنا
پھول محبت کا
آسان نہیں کھلنا

مجبور جوانی پر
شہر اُمڈ آیا
اک رات کی رانی پر

دریا بھی اتر جائے
عین دسمبر میں
محبوب مکر جائے

ہم آہ نہیں بھرتے
دردِ محبت کی
تشہیر نہیں کرتے

کیا بوئیے تن من میں
پھول نہیں کھلتے
کب سے مِرے آنگن میں

اس سا کوئی سادہ بھی
ہم نے نہیں دیکھا
خاورؔ سے زیادہ بھی

ماہیے:
ناصر نظامی۔ہالینڈ

زخموں کا دھنی کردے
درد کی دولت سے
اس دل کو غنی کردے

دامن کا کنارا دے
دل کی ڈوبی ہوئی
کشتی کو سہارا دے

اس دل تک آئے کوئی
دل کے کھلونے کی
قیمت تو لگائے کوئی

محرومِ کرم نہ کر
کر تو غور ذرا
مِرے دل کی گزارش پر

دل والے بڑے ہوں گے
لیکن اپنی طرح
غم سے نہ لڑے ہوں گے

صحرا مرا دامن ہے
سورج سے بھی بڑا
مِرے دل کا آنگن ہے

کربلائی ماہیے:
رضیہ اسماعیل
(برمنگھم، انگلینڈ)

اشکوں سے وضو کرکے
ماہیے لکھتی ہوں
میں دل کو لہو کرکے

گھوڑوں کا دانہ تھا
شمر کے تیروں کا
بس تُو ہی نشانہ تھا

تو فاطمہؑ جایا ہے
کوفے والوں کو
ذرا رحم نہ آیا ہے

سادات گھرانہ ہے
ظلم یوں ڈھاتے ہو
کیا قرض پرانا ہے

کیسی بربادیاں تھیں
ننگے سرجن کے
وہ سیّدزادیاں تھیں

کچھ فرض ہمارا تھا
دادرسی کرتے
زینبؑ نے پکارا تھا

پانی کا سوالی ہے
نانا نبیؐ جس کا
کوثر کا والی ہے

جب غم کی گھٹا چھائی
پیٹتی سر اپنا
کربل میں قضا آئی

یہ کیسی شقاوت ہے
فوج یزیدی پہ
لعنت ہے، ملامت ہے

کربل میں چلی آندھی
چادریں سر سے اُڑیں
بربادی ہے بربادی

عمروں کا رونا ہے
اپنے اشکوں سے
ہمیں داغ یہ دھونا ہے

قرآں کے سیپارے ہیں
اپنے گناہوں کے
دینے کفارے ہیں

کتاب گھر

کتاب میلہ

تعارف: حیدر قریشی

ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن　　**مصنف**: **رفیق سندیلوی**

صفحات: 132　**قیمت**: 130 **روپے**　**ناشر**: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

اکادمی ادبیات پاکستان نے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے نام سے اہم ادباء پر کتابوں کا ایک سلسلہ لگ بھگ سولہ برس سے شروع کر رکھا ہے۔ اسی سلسلے کی کڑی کے طور پر رفیق سندیلوی کی یہ کتاب منظرِ عام پر آئی ہے۔ اتنی محدود ضخامت میں ڈاکٹر وزیر آغا جیسی قد آور ادبی شخصیت کا احاطہ کرنا بہت مشکل کام تھا لیکن رفیق سندیلوی اس میں کامیاب ہی نہیں سرخرو رہے ہیں۔ انہوں نے ان کی شخصیت اور ادبی جہات کو جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ اتنے بڑے سرکاری ادارے کی جانب سے چھپنے والی کتاب میں کمپوزنگ کی اغلاط کثرت سے ہیں۔ ایسے ادارے کی طرف سے ایسی اغلاط ادارے کی کارکردگی کے بارے میں اچھا تاثر پیدا نہیں کرتیں۔ اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا جس اعلیٰ معیار کے شاعر، ادیب، نقاد اور دانشور ہیں، کیا ان کے بارے میں ایسی کتاب منصوبہ کے سولہ سال کے بعد آنی چاہئے تھی؟ یہ تاخیر اکادمی کے علمی و ادبی معیار پر سوالیہ نشان ہے۔

بستیاں (افسانے)　　**افسانہ نگار**: **جوگندر پال**

صفحات: 213　**قیمت**: 50 **روپے**　**ناشر**: اردو اکادمی دہلی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی

عصرِ حاضر کے اردو کے ایک بڑے افسانہ و ناول نگار کی حیثیت سے جوگندر پال کی شناخت روبروز گہری ہوتی جا رہی ہے۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''بستیاں'' ان کے ۱۸ افسانوں اور پرندے کے زیرِ عنوان چند افسانچوں پر مشتمل ہے۔ گھات، عقب، ڈیرا بابا نانک، مارکیٹ اکانومی، اٹھارہ ادھیائے، مقامات، جناب عالی، طلسم ہوشربا، نامراد، سانس سمندر، کٹھ پتلیاں، ہیر رانجھا، محشر، سوگ، ڈبہ بند لوگ، نازائیدہ، انکار، بجھتے سورج کا سمے، یہ اٹھارہ افسانے اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ہر افسانہ بلاشبہ افسانوی شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔

ہمیش نظمیں (نثری نظمیں)　　**مصنف**: **احمد ہمیش**

صفحات: 128　**قیمت**: 100 **روپے**　**ناشر**: تشکیل پبلشرز، 8/6 2-J ناظم آباد، کراچی

احمد ہمیش کسی زمانہ میں اپنے افسانوں ''مکھی'' اور کہانی مجھے لکھتی ہے'' کی وجہ سے افسانے کے نقادوں کی توجہ کا مرکز رہے۔ پھر وہ ایک طرف نثری نظم کے دیار میں داخل ہوئے تو دوسری طرف ''حق گوئی'' کے علمبردار بن گئے۔ نثری نظم کا شاعری ہونا بے شک قبول نہ کیا گیا لیکن اس کے شعری مواد کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ ادھر احمد ہمیش حق گوئی میں اس حد تک آگے جانے لگے کہ کئی غلط لوگوں کے ساتھ کئی اچھے لوگ بھی ان کی زد میں آنے لگے۔ اس سب کا نقصان یہ ہوا کہ احمد ہمیش کی تخلیقی سرگرمیاں پس پشت چلی گئیں۔ بہر حال ایک عرصہ کی مار دھاڑ کے بعد اب احمد ہمیش پھر تخلیقی طور پر فعال ہوئے ہیں۔ حالیہ دنوں میں ان کے نئے افسانے بھی چھپے ہیں، غزل کے میدان میں بھی ان کے جوہر سامنے آئے اور اب ان کی نثری نظموں کا مجموعہ ''ہمیش نظمیں'' شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کا شعری مواد احمد ہمیش کے اندر کے تخلیقی امکانات کی نشاندہی کرتا ہے۔ کتاب کے شروع میں سلیم شہزاد کا مضمون اور سمیع آہوجہ کا تفصیلی خط، دونوں ان نثری نظموں کے مطالعہ میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے تحریر کردہ ابتدائیہ میں احمد ہمیش نے ''نثری شاعری'' کے سرے چاروں ویدوں سے جوڑے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ویدوں میں مذہبی معاملات سے قطع نظر Poetic Potentional بہت زیادہ ہے۔ ہمیش نظمیں کو نثری نظم کے حلقے میں تو پذیرائی ملے گی ہی، امید ہے عمومی ادبی حلقے بھی اس کے شعری مواد میں دلچسپی لیں گے۔

میری آنکھوں سے دیکھو (شاعری)　　**شاعر**: **فیصل عظیم**

صفحات: 160　**قیمت**: 150 **روپے**　**ناشر**: مطبوعاتِ اقدار، ۲۰۷۔ گھڑیالی بلڈنگ، صدر، کراچی۔۳

فیصل عظیم نئی نسل کے اہم شاعر ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''میری آنکھوں سے دیکھو'' حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ان کی تربیت میں ترقی پسند رویے رچے ہوئے ہیں جبکہ ان کا مزاج جدید ہے۔ اس طرح ان کے ہاں جدید اور ترقی پسند رویوں کا ایک امتزاج سا ابھرتا ہے۔ ان کی نظمیں بطور خاص اس امتزاج کو نمایاں کرتی ہیں، تاہم جہاں ان کی غزلوں میں اس قسم کے اشعار آتے ہیں وہاں ان کی نظم بھی جیسے کچھ پیچھے رہ جاتی ہے۔

یہ اپنے سر بہت بھاری ہمیں لگتے ہیں شانوں پر　　مگر رکھے نہیں جاتے کسی کے آستانوں پر

ہر قدم پر ابتدا کو انتہا کرتے ہوئے　　چل رہا ہوں منزلوں کو راستہ کرتے ہوئے

بجھ گیا وہ ظلمتوں کی انتہا کرتے ہوئے　　ہو گیا تنہا مجھے بے آسرا کرتے ہوئے

تمہاری ہی طرح تم سے وفاداری نباہیں گے　　ذرا تم دیکھتے جاؤ ہماری بے وفائی کو

اس انداز کے اشعار آگے چل کر فیصل عظیم کی شعری شناخت بن سکتے ہیں۔

ارمغانِ اختر سعید خاں(سہ ماہی فکر و آگہی دہلی)　**مدیرہ**: **ڈاکٹر رضیہ حامد**

صفحات:326 **قیمت**:250 انڈین روپے　**رابطہ** : کنارہ اپارٹمنٹ، وی آئی پی لیک ویو روڈ، بھوپال

ڈاکٹر رضیہ حامد علمی اور ادبی لحاظ سے بڑی فعال شخصیت ہیں۔متعدد علمی و ادبی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر کامیابیاں حاصل کر چکی ہیں۔جس طرح ایک کامیاب مرد کے پیچھے کسی عورت کا ہونا سمجھا جاتا ہے اسی طرح ڈاکٹر رضیہ حامد کی کامیابیوں کے عقب میں ان کے شوہر سید حامد صاحب کا ہاتھ سمجھا جانا چاہئے۔سہ ماہی ''فکر و آگہی'' کے کئی عمدہ نمبرز شائع کرنے کے بعد ڈاکٹر رضیہ حامد نے اب معروف و ممتاز شاعر اختر سعید خاں کا خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔اس خاص نمبر کے چند اہم لکھنے والوں میں ڈاکٹر حامد حسین، محمد احمد سبزواری، سردار جعفری، سلیم حامد رضوی، رفعت سروش، قمر رئیس، راج بہادر گوڑ، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، مظفر حنفی، عشرت قادری، کوثر صدیقی، شمع زیدی، آفاق احمد، ظفر احمد پیامی، اظہر سعید خاں، خورشید سکندر بخت، تخلص بھوپالی، شفیقہ فرحت، عزیز قریشی شامل ہیں۔نمبر کو ترتیب دیتے وقت ڈاکٹر رضیہ حامد نے تحقیق کے تقاضے پورے کرنے کے ساتھ اس تہذیب، شائستگی اور شرافت کو ملحوظ رکھا ہے جو انہیں ورثے میں ملی تھی اور جو ان کی شخصیت کے ساتھ ان کے علمی و ادبی کاموں میں بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔اختر سعید خان کے علمی، ادبی اور شخصی حوالوں سے یہ نمبر دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔

پرانی کتابوں کی خوشبو(شاعری)　**شاعرہ**: **ترنم ریاض**

صفحات:192 **قیمت**:125 **روپے** **ناشر**: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔٦

ترنم ریاض اردو افسانے اور اردو ناول میں اپنی شناخت بنانے کے بعد اسے مسلسل مستحکم کر رہی ہیں۔اب ان کا شعری مجموعہ ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' سامنے آیا ہے تو بطور شاعرہ بھی ان کی باقاعدہ شناخت ہو سکے گی۔اس مجموعہ میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔غزلیں بری نہیں ہیں لیکن ترنم ریاض کی نظم میں نسبتاً زیادہ امکانات محسوس کئے جا سکتے ہیں۔جن نظموں میں ترنم ریاض نے غیر ضروری طور پر نسوانی حقوق کی باتیں چھیڑی ہیں وہاں نظموں میں بلند آہنگ قسم کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔لیکن اپنی نظموں میں ترنم ریاض جہاں سادگی کے ساتھ آئی ہیں وہاں نظم کے اختتام تک ایک ہلکا سا تحیر جنم لیتا ہے یا ایسی مسکراہٹ ظاہر ہوتی ہے جو نظم میں کچھ منکشف ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ترنم کی ایسی سادہ نظمیں اپنے اندر زیادہ جاذبیت لئے ہوئے ہیں۔مجموعہ میں شامل ۲۵ غزلوں میں سے صرف ایک شعر نمونہ کے طور پر پیش ہے۔

اسے دیمک کی طرح رنج کوئی کھاتا ہے　　بانٹنا ذہن سے غم دل کو نہیں آتا ہے

بہر حال ترنم ریاض کے افسانے اور ناول کی طرح ان کی شاعری کو بھی ادبی دنیا میں سراہا جائے گا۔

تاریخِ اردو ادب کویت　**مرتب**: **سعید روشن**

صفحات:304　**قیمت**:250 **روپے**　**ناشر**: الاشراق پبلی کیشنز۔۲۱۷۔سرکلر روڈ۔لاہور

سعید روشن کویت میں مقیم اردو کے شاعر ہیں۔''تاریخِ اُردو ادب کویت'' اپنے نام کے مطابق کویت میں جا بسنے والے اردو شعراء کا تذکرہ ہے۔سعید روشن نے اس تذکرہ کو سلیقے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔زمانی لحاظ سے الگ الگ سیکشن بنا کر پہلے شعراء کا تعارف دیا گیا ہے اور پھر ان کا نمونۂ کلام۔شاعرات کا ذکر زمانی ترتیب کے بغیر ایک ہی جگہ کر دیا گیا ہے۔نثر نگاروں کا الگ سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ادبی تنظیموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔غرض اس کتاب کے ذریعے کویت کے وہ ادبی گوشے بھی سامنے آ جاتے ہیں جو کویت سے باہر والوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔اس تذکرہ کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ ان میں سے کون سے شاعر اور ادیب ادب کے مرکزی دھارے میں کہیں شمار ہوتے ہیں اور کون سے صرف کویت کی مقامی فضا تک جانے جاتے ہیں۔

چنار کے پنجے(افسانے)　**افسانہ نگار**: **دیپک بدکی**

صفحات: 166 **قیمت**:200 **روپے** **ناشر**: انٹرنیشنل اردو پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی

تقسیم برصغیر کے بعد ہندوستان میں زیادہ تر وہی ہندو شاعر اور ادیب اردو زبان سے وابستہ رہے جو تقسیم سے پہلے اردو زبان سے جُڑ چکے تھے۔تقسیم کے بعد ہندوستان میں ہندوؤں میں اردو کے معدودے چند شاعر اور ادیب پیدا ہوئے۔دیپک بدکی انہیں میں ایک اہم نام ہیں۔انہوں نے ایم ایس سی کرنے کے بعد اردو زبان سیکھنا شروع کی اور پھر اردو کے افسانہ نگار کو طور پر سامنے آئے۔ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''ادھورے چہرے'' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔اب ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''چنار کے پنجے'' شائع ہوا ہے۔اس میں ۱۹ افسانے شامل ہیں۔سارے افسانے قابلِ مطالعہ ہیں اور ان کا لکھا ہوا ''حرفِ آغاز'' کئی حوالوں سے فکر انگیز ہے!

ٹھنڈا سورج(سفرنامہ)　**ھائیکو، ماھیا نگار**: **خاور چودھری**

صفحات:80　**قیمت**:60 روپے　**ناشر**: سحر تاب پبلی کیشنز، حضرو (اٹک)

خاور چودھری نئے لکھنے والے ہیں، حضرو (اٹک) کی مقامی صحافت میں سرگرم ہیں اور ساتھ شعر و ادب سے بھی منسلک ہیں۔ادبی حوالے سے ''ٹھنڈا سورج'' ان کی پہلی کتاب ہے۔اس میں ان کے ہائیکو اور ماہیے شامل ہیں۔کتاب کے پہلے ١٦ صفحات انتساب، ضابطۂ اشاعت، اور اس مجموعہ سے متعلق مضامین سے مزین ہیں جبکہ اگلے ۴۰ صفحات پر ہائیکو درج کئے گئے ہیں اور آخری ۱۴ صفحات ماہیے کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔امید ہے اس مجموعہ کی اشاعت پر ہائیکو اور ماہیے کے حوالے سے مخصوص ادبی دائروں میں ان کی پذیرائی ہوگی۔

ناصر عباس نیر (لاہور)

تنکے کا باطن

پروین طاہر کی نظم (بہ حوالہ تنکے کا باطن) معاصر اردو نظم سے منسلک بھی ہے اور جدا بھی! یہ نظم اپنی ساختی تشکیل کے لیے تو معاصر نظم کی طرف رجوع کرتی ہے مگر اپنے مافیہ کے لیے ایک ایسے سرچشمے سے ناتا جوڑتی ہے ،جو کہیں باہر نہیں بلکہ تخلیق کار کی سائیکی میں مخفی ہوتا ہے۔معاصر اردو نظم میں تمثال سازی، کفایت لفظی ،مصرعوں میں Gap دینے ،نئی لفظیات کی تلاش ،تازہ کاری ،خیال کی جسمیت کو گرفت میں لینے کی جو صورتیں ملتی ہیں ،وہ پروین کی نظم میں جا بجا موجود ہیں۔علاوہ ازیں سائنسی شعور ،زمان و مکاں کے جدید تصوّرات ، شے کی ضدّ کو خود شے میں تلاش کرنے کا رویّہ ،واقعے کو بیان کرے کی بجائے واقعے کو پگھلا کر اسے امیج میں تبدیل کرنے کی روش بھی معاصر نظم میں ابھری ہے۔یہ ساری صورتیں پروین کے یہاں موجود ہیں۔(یہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ معاصر اردو نظم کا اہم ترین حصّہ پنڈی اسلام آباد میں تخلیق ہو رہا ہے)۔۔۔۔مگر اس سے آگے جہاں تک ان کی نظم کے موضوعات اور مسایل کا تعلق ہے ،وہ معاصر نظم کی بازگشت نہیں ہیں ، بلکہ انھیں پروین نے اپنے باطن کی گہری سطحوں سے برآمد کیا ہے۔

مذکورہ معاصر نظم سے انسلاک نے پروین کی نظم کو نظم کے اس برانڈ سے یکسر الگ رکھا ہے ، جسے اردو شاعرات نے اپنے لیے وجہ افتخار سمجھ کر جاری رکھا ہوا ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں لیا جانا چاہیے کہ پروین کی نظم میں تانیثی شعور نہیں ہے یا ان کی نظم مردانہ تصوّرات کو لیے ہوئے ہے۔اور نہ یہ سمجھا جانا چاہیے کہ ادب میں تانیثی اور ذکوری شعور کا وجود نہیں ہے اور یہ محض ڈھکوسلہ ہے۔یہاں اس نکتے پر تفصیلی بحث کی گنجایش تو نہیں ہے کہ ادب کو مردانہ اور زنانہ ڈبوں میں تقسیم کرنے کا کیا جواز ہے ،ادب ادب ہوتا ہے ،اسے مرد تخلیق کرے یا عورت ،اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تخلیق کار اپنے متعلق تمام تصورات اپنے ثقافتی ،نشانیاتی نظام سے اخذ کرتا ہے۔اس نظام میں مرد اور عورت کی تقسیم اتنی گہری اور ثقافت کے جملہ لسانی اور اقداری مظاہر تک اتری ہوئی ہے کسی تخلیق کار کو اس سے مفر نہیں ہو سکتا۔مرد اور عورت تخلیق کار ''خود'' کو لکھتے ہوے دراصل اس

''تصورِ ذات'' کو لکھتے ہیں جو انھیں اپنے ثقافتی نظام سے ودیعت ہوتا ہے۔لہٰذا کسی عورت کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی ذات کو رقم کرتے ہوئے وہی کچھ کہے جو مرد تخلیق کار کہہ رہا ہے۔اور نہ یہ مرد تخلیق کار کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنی ذات کا تصوّر اسی طرح کرے جس طرح عورت کرتی ہے۔اس طرح گویا مرد اور عورت کی سائیکی کی الگ الگ WILD ZONE ہیں۔تاہم یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ واقعات کے سلسلے میں دونوں کا ردّ عمل کتنا یکساں اور کتنا مختلف ہوتا ہے؟ یعنی وائلڈ زون کا اظہار کہاں کہاں ،کب اور کن صورتوں میں ہوتا ہے؟

پروین کی نظم کا بنیادی مسئلہ آگہی ہے۔آگہی کی دو صورتیں ان کی نظم میں ظاہر ہوئی ہیں۔ایک عمومی اور دوسری خصوصی ہے۔عمومی آگہی سے مراد وہ آگہی ہے جس کا تعلق ان کے نسائی سیلف کے بجائے عمومی انسانی تجربے سے ہے۔خصوصی آگہی کا تعلق ان کی نسائی سائکی اور ان کی تانیثی وائلڈ زون سے بنتا ہے۔اس طرح انھوں نے اپنی نظم کو محض صنفی مسایل تک محدود نہیں کیا اور نہ اس نسائی تحریک کا حصہ بنی ہیں جو دراصل کلچرل پالیٹکس ہے۔

آگہی کے سلسلے میں پروین کی نظم میں ایک انوکھے فی نومی نن نے جنم لیا ہے۔عمومی آگہی کے ضمن میں ان کی نظم میں تثلیث اور نسائی عرفان کے تعلق سے ثنویت ظاہر ہوئی ہے۔

عمومی آگہی پروین کے یہاں تتلی کے کشف ،بھوبل کی سب سے نچلی تہ کے اندر دو پل کے جیون ، تنکے کے باطن ،نگاہوں کے آگے خلاؤں کی ویرانی اور وہ فضا جہاں سے کسی حدّ امکاں کا آغاز ہوتا ہے ،سیہ روشنی کی چکا چوند دھارا کا دو جا کنارا اور ناممکن کی حدّت سے اپنا سورج ڈھالنے سے عبارت ہے۔ ہر آگہی نجّی اور شخصی ہوتی ہے۔یہ ایسی آگ ہے جس میں آدمی کو اکیلے جلنا پڑتا ہے ،کبھی جلنے کا ثمر اسی آگ کے گل زار بننے کی صورت میں ملتا ہے اور کبھی نہیں! آگ کی حدّت کا بس عرفان مل پاتا ہے ،آدمی آگ کی قلبِ ماہیت نہیں کر پاتا ،اسے فقط اپنی روح میں اتار کر ،آگ کے قہر اور غم کے زہر سے آشنا ہوتا ہے۔پروین کی نظم میں ناممکن کی حدّت سے اپنا سورج ڈھالنے کا جو ذکر ہوا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ آگہی محال کے امکان کو مجسم کرنے کا تجربہ ہے۔اور محال کے امکان کو مجسم کرنے کا تجربہ دراصل بھوبل کی سب سے نچلی تہ کے اندر موجود دو پل کے اس جیون کو گرفت میں لینے کا عمل ہے ،جس نے تیز ہوا کی زد پر آ کر اگلے پل مٹ جانا ہے۔آگہی فنا کے نشانے پر ہر لمحہ موجود زندگی کا اثبات ہے۔ پروین کے یہاں آگہی فنا ،غم اور شکست سے عبارت ہے۔ظاہر ہے یہ تینوں وہاں ہو سکتے ہیں جہاں حیات ،خوشی اور تعمیر موجود ہو۔پروین کی نظم میں وقت اور تاریخ کا عمودی شعور موجود ہے۔عمودی شعور تاریخ کے روز بدلتے منظر نامے کے بجائے تاریخ کی تہ میں مضمر اس ساخت کی آگہی رکھتا ہے ،جو تمام تاریخی تغیّر کی ذمہ دار ہے۔ان کی نظم مخصوص تاریخی شعور کی مدد سے یہ حقیقت باور کراتی ہے کہ حیات ،خوشی اور تعمیر کس طرح فنا ،غم اور شکست میں بدل گئے۔پروین نے اس لمحے کو اپنی نظم میں گرفت میں لینے کا دعوا کیا ہے۔

ایک ہی وہ دن یاد ہے مجھ کو
جس دن سر سے تال چھنا تھا
اور توازن قدموں سے
اک لکنت سی در آئی تھی
باتوں میں   (لکنت)

کتنا زہری موسم تھا وہ
پھولوں والی شاخوں سے
ٹوٹے سانپ اور بچھو   (ایسا لازم تھا)

اپنی اصل میں یہ سائنسی تصوّر کا ینات ہے، جس کے مطابق کا ینات کی تخلیق اکائی کے دوئی میں بدلنے سے ہوئی تھی۔ مگر پروین نے اسے تخلیقی سطح پر قبول کیا ہے۔ سر سے تال کے چھننے، قدموں سے توازن کے رخصت ہونے، باتوں میں لکنت آنے اور پھولوں والی شاخوں سے سانپوں اور بچھوؤں کے ٹوٹنے کو ایک ایسی سچائی قرار دیا ہے، جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ایسا ہونا لازم تھا۔ مگر کسی چیز کے لزوم کو منطقی سطح پر قبول کرنا اور بات ہے اور اس کو دل سے تسلیم کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ پروین کے یہاں اس سچائی کو دل سے تسلیم کیا گیا ہے۔ یعنی فنا غم اور شکست کو کشف کی تکمیل کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس آ گہی کی تمثالی نمایندگی کے لیے ان کے یہاں اسما، صفات اور کیفیات کی تثلیث جگہ جگہ ظاہر ہوئی ہے۔ مثلاً برکھا سا کوئی موسم تھا/خوابیدہ سی کوئی حالت تھی/روم روم میں زہر رچا تھا۔۔۔ تب زندگی/نیلگوں، نرمل، سبک رو/بھاگتی، رقصاں، بلا آواز/قدموں پر اچھلتی زندگی/اک مقدس راگنی تھی/جل ترنگ سی بج رہی تھی۔۔۔۔ اس کے کیسے درشن ہو گا/آگ، الاؤ اور دھوئیں کا۔۔۔۔ کبھی کھینچیں گے ہم باگیں/جنونی، سرپھری، اندھی ہواؤں کی۔۔۔۔ تثلیث سے شاعرہ کو اس درجہ باطنی ربط ہے کہ وہ خود کو تیسری بھاونا کے طور پر مشخص کرتی ہیں۔

تنکے کا باطن کے ایک فلیپ نگار کا کہنا ہے کہ پروین طاہر۔۔ نے اردو شاعری کو حسن وعشق کے روایتی مفاہیم اور تذکیر و تانیث کے صیغوں سے باہر نکالا۔ ان کی یہ بات تو درست ہے کہ پروین نے حسن وعشق کے روایتی مفاہیم سے کوئی سروکار نہیں رکھا، مگر یہ درست نہیں کہ ان کے یہاں تانیثی شعور سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ تانیثی شعور سے انکار کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے سیلف میں اترنے کا تجربہ ہی نہیں کیا۔ اصل یہ ہے کہ ان کے یہاں وہ تانیثی شعور بہ ہر حال موجود نہیں ہے، جسے ان کی معاصر شاعرات ان دنوں اپنی شاعری اور اپنی این جی اوز کے ذریعے عام کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ پروین کی تانیثیت اور ان کی معاصر شاعرات کی

تانیثیت میں بڑا فرق یہ ہے کہ آخرالذّ کر مردانہ سماج کے خلاف بغاوت، احتجاج کو پیش کر رہی ہیں۔ وہ مرد کو ظالم ، استحصال پسند تصور کرتی ہیں۔ ان کا مرد کا تصوّر بڑی حد تک وہی ہے جو سابق نو آبادیاتی ممالک کا مغربی سامراج کا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی مطالعات بتاتے ہیں کہ مغربی سامراج نے اپنی نو آبادیوں کو معاشی اور سیاسی استحصال کے علاوہ علمی، ثقافتی، لسانی سطح پر بھی استحصال کا نشانہ بنایا۔ اور ایسی حکمت عملیاں اختیار کیں، جو مخفی، بالواسطہ اور در پردہ تھیں۔ فرانز فینن اور ایڈورڈ سعید کے مطالعات نے بالخصوص ان در پردہ حکمت عملیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ معاصر نسوانی تحریک کی علم برداروں نے مرد کو بھی ایک ایسا ''سامراج'' ثابت کیا ہے جو عورت کے استحصال کے براہِ راست اور بالواسطہ، معاشی، سیاسی اور علمی، ثقافتی اور لسانی حربے اختیار کرتا ہے۔ چوں کہ مرد نے یہ سب کیا ہے اس لیے عورت ان کے خلاف مزاحمت کرتی ہے، مرد کو شدید تنقید کا نشانہ بناتی ہے، اپنی ذات کا ایسا تصور پیش کرتی ہے، جو استحصال زدہ قوم کی طرح پس ماندہ، اپنی شناخت کے بحران میں مبتلا، داخلی انتشار کا شکار اور خود سے بیگانگی میں مبتلا ہے۔۔۔۔ مگر پروین نے نسائیت کا ایک دوسرا متن پیش کیا ہے۔ ایک آدھ جگہ پر پروین کی نظم میں مذکورہ تانیثی شعور ضرور ظاہر ہوا ہے۔ مثلاً نظم سٹپنی میں ۔۔۔ سروں سے پیار کی چھایا/کوئی جب چھین لیتا ہے/زمیں پیروں تلے سے/کھینچ لیتا ہے...کوئی دوسرا ہوتا نہیں/تو ہم ابھرتے ہیں/فقط اس ایک لمحے/کے سیہ دامن پہ/تاروں کی چمک بن کر۔ نظم ان لائینوں میں شکایت، نرم احتجاج، چھپا طنز موجود ہے، جو مذکورہ تانیثی شعور سے مخصوص ہے۔ تاہم پروین کا یہ غالب لہجہ نہیں ہے۔ ان کی نظم کا نسائی پہلو علامتی ہے۔

ویسے یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ پروین نے اپنے عصر کے غالب نسائی تصورات سے ہٹ کر نسائی زاویہ اختیار کیا ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ کیا انھوں نے ان تصورات کو غلط سمجھا ہے یا انھیں دبایا ہے اور گویا اس Repression کا مظاہرہ کیا ہے، جس کی شکایت ایک پدرسری سماج میں خواتین کو مردوں سے ہوتی ہے؟ اس سوال کا جواب ان کی نظم میں ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی نظم دراصل ایک مختلف شعورِ ذات کو پیش کرتی ہے۔ یہ شعورِ ذات نوعیّت کے اعتبار سے تانیثی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ شعورِ ذات کو تانیثی اور ذکوری خانوں میں بانٹنے کے حق میں نہ ہوں۔ اور ممکن ہے بعض جگہوں پر یہ فرق معدوم بھی ہوتا ہو۔ مگر پروین کے یہاں یہ فرق موجود ہے۔ مثلاً سب سے پہلے تو ان کی شعری زبان ہی مختلف ہے۔ نرم، کومل ہندی لفظوں کا زیادہ استعمال جو بالعموم گیت میں برتے جاتے ہیں اور گیت میں اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ دوسرا ان کے یہاں شعورِ ذات ثنویت کو لیے ہوئے ہے۔ وہ ثنویت جو نسائی شعور سے مخصوص ہے۔ نسائیت اپنا تصوّر ''دوسرے'' کی مدد سے کرتی ہے۔ کبھی ''دوسرے'' کو اپنا مدّ مقابل اور کبھی اسے اپنی تکمیل کا ذریعہ خیال کرتی ہے۔ معاصر نسوانی تحریکوں نے ''دوسرے'' کو مدّ مقابل سمجھا ہے، اس کے برابر آنے اور اس سے حریفانہ کش مکش میں مبتلا ہوئی ہیں۔ مگر پروین نے ایک دوسرا زاویہ نظر اختیار کیا ہے۔ انھوں نے ''دوسرے'' کے روبرو آنے کا تجربہ پیش کیا ہے۔ اور ''دوسرے'' کا تصوّر بھی

ان کامختلف ہے۔

پروین کی نظم میں ''دوسرا'' کہیں روشنی کے روپ میں اور کہیں سمندر کی صورت ظاہر ہوا ہے۔اور اس کے روبرو انھوں نے جس نسائی سیلف کو پیش کیا ہے وہ کہیں دھرتی اور کہیں ندّی ہے۔اس طور ان کا نسائی متن علامتی ہے۔اس ضمن میں ان کی تین نظمیں تیرا کمالِ کشف ہے، سفر ندیا کے پانی کو ودیعت ہے اور روشنی اور آواز سے مراجعت توجہ طلب ہیں۔پہلی نظم میں روشنی، جو ''دوسرے'' کا استعاراتی روپ ہے، نظم کی متکلم کی ذات کی تطہیر کرتی ہے....مگر اے روشنی/اے کائناتی روشنی/....مجھے پاتال سے کھینچا/مرا میلا بدن دھویا/الوہی گھیر میں لے کر/مری آنکھوں/مری ان خشک جھیلوں کو/مقدس آنسوؤں سے/پھر شناسا کر دیا۔۔۔گویا اس نظم میں دوسرا ''غیر'' نہیں بلکہ ذات کی تقدیس اور تطہیر کا وسیلہ ہے۔ذات جب تطہیر کے عمل سے گذرتی ہے تو وہ مایل بہ ارتقا ہو جاتی ہے۔اسے پر لگ جاتے ہیں، وہ نئی منزلوں اور نئے جہانوں کو سر کرنے کی تمنا کرنے لگتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ پروین کی نظم میں آگے چل کر نسائی سیلف کے لیے پانی کا استعارہ آتا ہے۔دھرتی پانی میں ''بدل'' جاتی ہے۔ان کی اگلی دونوں نظموں میں ندی نسائی سیلف کی علامت کے طور پر آتی ہے۔ایسی ندی جو محض بہنا ہی نہیں جانتی، نامعلوم راستوں، گزشتہ اور ممکنہ راستوں کی تلاش کا عزم بھی رکھتی ہے۔اس میں تمکنت، غیر معمولی اعتماد اور تسخیر کرنے کی لگن ہے۔چوں کہ سامنے سمندر ہے لہذا پہلے ندی اسی کو ''تسخیر'' کرتی ہے۔

سمندر سر جھکائے، بانہیں پھیلائے ہوئے
چپ چاپ بیٹھا ہے
تھکا ماندہ، کسی ہارے کھلاڑی کی طرح
لیکن اچانک ہی کسی مانوس خوشبو نے
اسے چونکا دیا ہے!
سامنے معصوم ندیا
سانس روکے، دم بہ خود، حیراں
سمندر کی اداسی دیکھتی ہے!

سمندر اور ندیا کے علامتی مفاہیم اس قدر واضح ہیں کہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔دیکھنے والی بات یہ ہے کہ سمندر اداس ہے، اس سے اس کی عظمت رفتہ چھن چکی ہے۔نظم میں ایک ایسے زمانے کا ذکر بھی موجود ہے، جب سمندر مغرور تھا، ندی کے الھڑ بہاؤ کو اپنی رعونت سے روک دیتا تھا، مگر ندی کو چوں کہ سفر ودیعت تھا اس لیے اس نے سفر جاری رکھا اور پھر یہ دن آن پہنچا کہ ندی تمکنت سے کہنے لگی...''مہا ساگر/مجھے اب لوٹ جانا ہے/حسیں سورج کی کرنوں سے/ملن کر کے، ابھی بادل بنانا ہے/مجھے چٹیل زمینوں، گرم میدانوں کو/بھوری گھاٹیوں کو/سات

رنگی پینگ کا/احسان لوٹانا ہے/بن جل کے جو دھرتی ہے/وہاں سبزہ بچھانا ہے!''

یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ یہاں ندی پر تمکنت اور حقیقی نسائی سیلف کی علامت ہے۔حقیقی نسائی سیلف وہ ہے جو oppressed شناخت نہیں رکھتا، بلکہ جو وجودی فرد کی طرح اپنے وجود کی ذمہ داری قبول کرتا، اپنے فیصلوں کا اختیار رکھتا

اور اپنے فیصلوں کے نتائج کا سامنا کرنے کا ظرف بھی رکھتا ہے۔اور متذکرہ صدر نظم کی ندی یہ ساری خصوصیات رکھتی ہے۔نظم روشنی اور آواز سے مراجعت میں نسائی سیلف کی اس وائلڈ زون کو پیش کیا گیا ہے، جو منفرد، تنہا اور خاموش ہے۔یہ وائلڈ زون لازمانیت سے عبارت ہے، یہاں خارجی دنیا اور تاریخ کے تمام روزن بند ہو جاتے ہیں۔یہ ایک ایسا لازماں لمحہ ہے، جب ''کسی اظہار سے پہلے/نظر کی روشنائی سے/کوئی پہلی کتھا لکھی گئی تھی/'' سیلف ایک ایسی بے کرانی میں جذب ہونا چاہتا ہے، جو آواز، روشنی سب سے ماورا ہو۔یہ معدومیت کی وہ کیفیت ہے، جو دراصل تخلیق کی اوّلین ساعت تھی!!

اے ماتا! رام نے اپنے سارے گُن میری آتما کو دان کر دیئے ہیں
اور میں نے ان
گُنوں کو گا گا کر عام کیا ہے۔
اس کے پریم کے بان نے میرے تن کو چھید دیا ہے ماتا!
جب یہ تیر مجھے آ کر لگا تو مجھے خبر بھی نہ ہوئی، پر اب مجھ سے یہ سہارا بھی نہیں
جاتا، اے ماتا!
میں نے جادو ٹونے، دوا دارو، سب کچھ کیا، پر یہ پیڑ تو جاتی ہی نہیں
کوئی ہے جو میرا علاج کرے؟ ماتا میرا دُکھ بڑا گہرا ہے۔
اے رآم! تو مجھ سے اتنا قریب ہے تو جلدی سے آ کیوں نہیں جاتا؟
مِیرآ کہتی ہے کہ رآم نے جو کیلاش کو فتح کرنے والا ہے، میرے تن کی ساری آگ
کو ٹھنڈا کر دیا ہے ماتا!
کنول ایسے نینوں والے نے
میری آتما کو اپنے گُنوں میں جکڑ ہی تو لیا ہے!

(مِیرا بائی)

پروفیسر نذر خلیق (خان پور)

جدید اور مابعد جدید تنقید پر ایک نظر

ناصر عباس نیّر عصرِ حاضر میں جتنی تیز رفتاری سے اردو تنقید میں اپنا مقام بنا رہے ہیں، اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ آنے والے سالوں میں تنقیدی شعور رکھنے والوں میں بحیثیت نقاد منفرد مقام بنا لیں گے۔ ناصر عباس نیّر اردو کے سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں بخوبی جانے جاتے ہیں، چاہے وہ حلقے پاکستان کے ہوں، انڈیا کے ہوں یا برصغیر سے باہر۔ ان کی عالمانہ خوبی یہ ہے کہ وہ لوگ بھی ان کا احترام کرتے ہیں جو ان سے گہرا اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ احترام کرنے والوں کی شخصی خوبی کے ساتھ ناصر عباس نیر کی علمی بصیرت کا بھی کمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں وہ لوگ بھی اہتمام کے ساتھ شائع کرتے ہیں جو ان کے تنقیدی خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے۔ درحقیقت تنقید میں ہر نقاد کی اپنی رائے ہوتی ہے اور اپنا وِژن۔ ناصر عباس نیَّر کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ مغربی تنقید پر دسترس رکھتے ہیں۔ مغرب کے تنقیدی رویوں کو اردو تنقید پر لاگو کرتے ہیں اور تجربے کرتے رہتے ہیں۔ مغربی تنقید کی روشنی میں مشرق کی تخلیقات کا تجزیہ اور تفہیم کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ ناصر عباس نیّر اس سے پہلے جھنگ کے ایک بڑے کالج میں استاد تھے اور آج کل اورنٹیئل کالج پنجاب یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسے ادارے میں استاد مقرر ہو گئے ہیں کہ جہاں کئی بڑے علمی و ادبی لوگوں نے تعلیم حاصل کی اور بہت بڑے لوگوں نے درس و تدریس کا فریضہ سرانجام دیا۔ ناصر عباس نیّر اسی لائق تھے۔ قدرت نے انہیں ان کی اصل درسگاہ تک پہنچایا ہے۔ اگر لوگوں کی ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں سے بچ نکلے تو ایک دن ناصر عباس نیّر تنقید میں ایک اتھارٹی کا مقام حاصل کر لیں گے اور مجھے یقین ہے کہ وہ مکر و فریب کے مراکز سے بچ نکلیں گے۔

ان کی کتاب ''جدید اور مابعد جدید تنقید'' ان کا ایم فل کا مقالہ ہے۔ انہوں نے اپنے اس مقالے میں مغربی تنقید پر غور و فکر کرتے ہوئے نئے علمی و فکری گوشے وا کیے ہیں۔ اردو تنقید کے لیے راہیں ہموار کی ہیں۔ تنقید جامد نہیں ہے، تنقید میں نت نئے تجربے اور نت نئے نظریات پیش ہونے چاہئیں ورنہ تنقیدی سوچ منجمد ہو سکتی ہے۔ تنقید تخلیق کو توانائی عطا کرتی ہے اور اگر تنقید فرسودگی کا شکار ہو تو تخلیق میں بھی تازگی نہیں آ سکتی۔ اس کتاب میں ناصر عباس نیّر نے حصہ اوّل میں ان عنوانات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

۱۔ جدیدیت ۲۔ نئی تنقید ۳۔ روسی ہئیت پسندی ۴۔ ساختیات اور ساختیاتی تنقید
۵۔ ساختیاتی نفسیاتی تنقید ۶۔ مارکسیت اور ساختیاتی مارکسیت ۷۔ قاری اساس تنقید

۸۔ مابعد جدیدیت ۹۔ ساخت شکنی کیا ہے؟ ۱۰۔ مثیل فوکو کے نظریات
۱۱۔ نو تاریخیت ۱۲۔ نسوانی تنقید ۱۳۔ بین المتونیت

حصہ دوّم میں ان عنوانات کو مدِ نظر رکھا ہے۔ ۱۔ اردو تنقید (ابتدا سے انیسوی صدی کے آخر تک)
۲۔ اردو تنقید میں جدیدیت کے مباحث ۳۔ اردو تنقید میں ساختیات کے مباحث
۴۔ اردو تنقید میں مابعد جدیدت کے مباحث ۵۔ جمالیاتی مسرت اور تفریحی حظ کا مابہ الامتیاز

ان عنوانات کو مدِ نظر رکھیں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ ناصر عباس نیّر نے نہایت ہی اہم اور نازک جدید تر تنقیدی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان نظریات کی تفہیم اور تشریح ایک مشکل ترین کام تھا لیکن ناصر عباس نیّر نے نہایت چابک دستی سے اور سادہ و بے ساختہ انداز میں یہ مشکل کام کر دکھایا ہے۔ ناصر عباس نیّر نے اپنی کتاب کے دیباچے میں تنقید اور تخلیق کے حوالے سے نہایت اہم باتیں کی ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ وہ تنقید اور تخلیق کے باہمی تعلق پر کیا اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''تنقید کو اکثر تخلیق کے مقابل رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کوشش کا نتیجہ تنقید کے حق میں عام طور پر اچھا نہیں نکلا، کیوں کہ تنقید کو تخلیق کے حوالے سے معرض فہم میں لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ تخلیق تو ایک طے شدہ امر ہے اور تنقید کو اس امر کی روشنی میں طے کرنا ہے۔ یوں تنقید کی ماہیئت اور منصب سے متعلق جو آرا قائم ہوتی ہیں، ان پر تخلیق سے متعلق وضع کیے گئے کلیات کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ تخلیق تنقید کے لیے قدر، اصل الاصول اور norm کا درجہ رکھتی ہے۔ تنقید مکمل طور پر تخلیق پر منحصر (Totally Dependent) سمجھی جانے لگتی ہے۔

تنقید کو تخلیق کے زاویے سے سمجھنے کے نتیجے میں، تنقید کے بارے میں تین قسم کی آرا قائم کی گئی ہیں: تنقید تخلیق سے کم تر ہے؛ تنقید تخلیق کی معاون ہے؛ تنقید تخلیق کی ہم پلّہ ہے۔ یہ آرا دراصل تنقید کے اس کردار کو متعین کرتی ہیں جو تخلیق نے اسے تفویض کیا اور جو اسے تخلیق کے لیے ادا کرنا ہے۔'' (۱)

تخلیق اور تنقید کے باہمی تعلق پر اکثر ناقدین نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے تنقید کو اہمیت دی ہے اور کچھ نے تخلیق کو۔ حالانکہ تخلیق اور تنقید دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ ایک تخلیق کار جب تک تنقیدی نظر نہ رکھتا ہو یا مشاہدے میں تنقیدی قوت نہ رکھتا ہو اس وقت تک تخلیق میں ترفع پیدا نہیں ہو سکتا گویا ہر تخلیق کار بیک وقت تخلیق کار اور نقاد ہوتا ہے۔ جب کہ تخلیق، تنقید کا سبب بنتی ہے۔ جب تک تخلیق نہ ہو تنقید کا جواز پیدا نہیں ہو سکتا۔ تنقید کے لیے تخلیق کا وجود نہایت ضروری ہے۔ شاید بعض نقاد بلا وجہ الجھاوے والے تنقیدی مباحث پیدا کرتے رہتے ہیں تا کہ ناقدین کی فہرست میں اپنا نام لکھوا سکیں۔ ناصر عباس نیّر نے تنقید کے ان مشکل ترین مباحث کو جس طرح قابلِ تفہیم بنایا ہے یہ انہیں کا کام تھا۔ ناصر عباس نیّر نے جدید اور مابعد جدید، ساختیات اور مابعد ساختیات جیسے ادق موضوعات کو قابل تفہیم بنایا ہے۔ نو جوان نقاد اور تنقید سے دلچسپی رکھنے

والے ناصر عباس نیّر کی کتاب ''جدید اور مابعد جدید تنقید'' سے استفادہ کر کے اپنے تنقیدی شعور میں اضافہ کر سکتے ہیں۔اس سلسلے میں پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی کی رائے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

''اردو تنقید کے مختلف اسالیب وتصورات پر مباحث اور انتقاد کا ایک قابل لحاظ سرمایہ موجود ہے مگر اس میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مباحث بڑے تشنہ ہیں۔اس کا ایک سبب تو یہ رہا ہے کہ یہ روّیے ابھی اردو کے تخلیقی ادب میں پورے طور پر جذب نہیں ہو پائے اور دوسرا یہ کہ ان مباحث خصوصاً مابعد جدیدیت ڈسکورس کی گہری تفہیم کے لیے وسیع مطالعے اور مغرب میں نمود پانے والے دیگر بہت سے فکری روّیوں سے آگہی ضروری ہے جو ہمارے یہاں قریباً نایاب کے حدود میں داخل ہے۔پیشِ نظر اوراق دراصل ایم فل اردو کے تحقیقی مقالے کا کتابی روپ ہیں۔ناصر عباس نیّر اردو کے نوجوان نقادوں میں سربرآوردہ ہیں۔انہوں نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر بہت عمدہ مقالہ تحریر کیا ہے۔تنقید کے عہد بہ عہد تصورات اور تغیرات پر فاضل نقاد کی نظر ان کی ہوش مندی اور وسعتِ مطالعہ کی آئینہ دار ہے۔جدیدیت کے مباحث اور مابعد جدیدیت کے پیچ در پیچ فکری روّیے مغربی فلسفے کے گہرے مطالعے کے بغیر گرفت میں نہیں آسکتے۔ناصر عباس نیّر کا نہ صرف مغربی فلسفے کا مطالعہ اچھا ہے بلکہ انگریزی زبان اور اس میں موجود تنقیدی اصطلاحات پر بھی ان کی گیرائی قابل داد ہے۔زیر نظر کتاب میں نیر صاحب نے مذکورہ مباحث کے اہم پیش کنندگان کے افکار کا خلاصہ ہی نہیں کیا،انہیں تجزیے،تحلیل اور تنقید کی کسوٹی پر بھی کسا ہے۔ان کے یہاں کہیں مرعوبیت دکھائی نہیں دیتی۔امید ہے کہ گہرے مطالعے اور تمکین آمیز اعتماد سے ترتیب پانے والی یہ کتاب نئے سوالات اور نئے مباحث کو تحریک دے گی۔''(۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مباحث قابلِ توجہ ہیں۔ان پر مزید غور وفکر کی ضرورت ہے۔ناصر عباس نیّر کی اس کتاب کی اشاعت کے بعد اب نوجوان نقاد اس پر توجہ دیں گے تو یہ مباحث مزید وضاحت کے ساتھ سامنے آسکیں گے۔میں سمجھتا ہوں کہ ناصر عباس نیّر کی یہ کتاب اردو تنقید میں علم وفکر کے نئے گوشے وا کرے گی۔خدا کرے ناصر عباس نیّر اسی جوش وجذبے کے ساتھ اور کامل یکسوئی کے ساتھ تنقید کی نئی نئی دنیائیں تلاش کرتے رہیں۔لاہور کی آب وہوا اور لاہور کا ادبی ماحول ناصر عباس نیّر کی تنقیدی صلاحیتوں کو جلا بخشے گی۔اردو تنقید اور تخلیق کاروں کو ان سے بہت امیدیں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ جدید اور مابعد جدید تنقید از ناصر عباس نیّر ،انجمن ترقی اردو، ڈی۔۱۵۹ بلاک۔۷ گلشن اقبال، کراچی۔۷۵۳۰۰،دسمبر۲۰۰۴ء،ص۔۱۱

۲۔ جدید اور مابعد جدید تنقید از ناصر عباس نیّر ،انجمن ترقی اردو، ڈی۔۱۵۹ بلاک۔۷ گلشن اقبال، کراچی۔۷۵۳۰۰،دسمبر۲۰۰۴ء،ص۔۴

آپ کے خطوط،ای میلز،تاثرات

☆☆☆ ''جدید ادب'' کا سجاد ظہیر نمبر ملا۔آپ نے بڑی محنت سے یہ نمبر ترتیب دیا ہے۔سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔انجمن ترقی پسند مصنفین کو ایک فعال ادارہ بنانے میں ان کی کاوشیں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی فکری وتخلیقی کاوشیں بھی اپنی جگہ اہم ہیں۔جدید ادب کے اس نمبر میں جس خوبی سے ان تمام کا احاطہ کیا گیا ہے اس نے اسے ایک حوالہ جاتی نمبر بنا دیا ہے۔سجاد ظہیر کی برسی کے حوالے سے حال ہی میں کئی کام منظر عام پر آئے ہیں،ان میں ''جدید ادب'' کا یہ نمبر اپنے مندرجات کی بنا پر ایک نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ایسا اچھا اور معیاری شمارہ نکالنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔ **ڈاکٹر رشید امجد**۔اسلام آباد

☆☆☆ آج تمہاری ویب سائٹ پر جدید ادب دیکھا،بہت اچھا لگا۔تم واقعی محنت کر رہے ہو۔گزشتہ چھ برس سے امریکہ میں ہوں۔لکھا تو بہت مگر شائع بہت کم ہوا۔غزلیں بھیج رہا ہوں۔ضرورت کے مطابق استعمال کر لو۔

حسن عباس رضا (نیویارک،امریکہ)

☆☆☆ جدید ادب:۶(سجاد ظہیر نمبر) موصول ہوا،شکر گزار ہوں۔لاریب آپ نے اس نمبر پر بہت محنت کی ہے۔ایسے نمبر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔یہ ایک ایک ایسی ریفرنس بک ہوتے ہیں جن کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے اور ادب کے طالب علم ہر دور میں مستفیض ہوتے ہیں۔بھائی حیدر قریشی! آپ کی محنت اور لگن پر رشک آتا ہے۔اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ **حامد سراج**۔چشمہ بیراج،میانوالی

☆☆☆ حیدر قریشی اور پروفیسر نذر خلیق کی ادارت میں جدید ادب جرمنی کا تازہ شمارہ سجاد ظہیر نمبر شائع ہو گیا ہے۔۱۹۰۵ء میں جنمے ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر کی ۲۰۰۵ء میں صد سالہ تقریبات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔انڈیا اور پاکستان کے ساتھ بیرون ملک بھی اس حوالے سے تقریبات ہوئیں۔جدید ادب کا سجاد ظہیر نمبر شاید صد سالہ تقریب کے حوالے سے کسی ادبی جریدہ کا پہلا خاص نمبر ہے۔اس شمارہ میں جہاں چند اہم مطبوعہ مضامین کو شامل کیا گیا ہے وہاں حمایت علی شاعر،محمد علی صدیقی،سلطان جمیل نسیم،ڈاکٹر علی احمد فاطمی،پروفیسر نذر خلیق،اور دیگر لکھنے والوں کے نئے مضامین بھی شامل ہیں۔سجاد ظہیر کے مضامین،افسانوں اور نظموں کا ایک مختصر سا انتخاب بھی

اس نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔سجاد ظہیر کے بارے میں پرانے مطبوعہ مضامین میں سے مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر قمر رئیس اور صدیق الرحمٰن قدوائی جیسے لوگوں کے مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔حیدر قریشی کا اداریہ ''گفتگو''اس بار مضمون جیسی صورت اختیار کر گیا ہے جس میں انہوں نے ان وجوہات کو بیان کیا ہے جن کے باعث جدید ادب کے ترجمان ایک ادبی جریدہ کو ترقی پسند تحریک کے بانی کا نمبر چھاپنے کی ضرورت پیش آئی۔اداریہ کے کئی نکات توجہ طلب ہیں۔

جدید ادب کے اس خاص نمبر میں خصوصی مطالعہ کا سیکشن پرانے معمول کے مطابق ہے۔اس میں جوگندر پال سے لیا گیا ڈاکٹر غضنفر اقبال کا ایک انٹرویو اور مشفق خواجہ کی یاد میں ڈاکٹر انور سدید کا مضمون دونوں اہمیت کے حامل ہیں۔ماہیے کا سیکشن بھی حسبِ معمول شامل ہے۔اسی طرح کتاب گھر اور قارئین کے خطوط کے سیکشن بھی پہلے کی طرح موجود ہیں۔۲۰۰ صفحات کا یہ شمارہ جدید ادب کے اپنے معیار کے مطابق ایک عمدہ شمارہ ہے۔**سعید شباب**(خانپور)

(urdu_writers@yahoogroups.com سے مورخہ ۶رفروری ۲۰۰۵ءکو یہ خبر ریلیز ہوئی)

☆☆☆ Dear Hyder saheb, Thank you very much for sending me the book and other reading material. I like the way you have produced your "Qulyaat: Lahaasal ka haasal." I was reading that till late night yesterday. Keep in touch. Thanks again. **Farooq khalid.**

I have already sent you a message yesterday. It was nice of you to inform me about your aticle on the thesis of Rasheed amjad. Not only I read that but, many more pieces in all the 4 issues of Jadeedadab. It was a "nayki der nayki" because I came across many more Urdu websites through your magazine. Please, let me know that is a monthly or a quarterly? You had written me to send me a few issues of it, I will be very much thankful to you for that. Yes, it indeed appears good, my congratulations to edit such a fine magazine, you are really a multidimentional person. It is my brotherly advise, not to waste your time on the bad, rather nonsense behaviour of your opponents, they are not worth of it.

فاروق خالد(ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ)

شکریہ فاروق خالد صاحب! میں نے آپ کے مشورے کے مطابق اپنے نان سینس مخالفین (جو حقیقتاً جعلی یا چور قسم کے لکھاری ہیں) کے ساتھ ان کے نان سینس دوستوں پر بھی مزید وقت ضائع کرنا ترک کر دیا ہے۔**ح۔ق**

☆☆☆ جدید ادب، سجاد ظہیر نمبر مل گیا، شکریہ۔دھیرے دھیرے پڑھ رہا ہوں۔سجاد ظہیر سے میری پہلے اس قدر

واقفیت نہیں تھی۔وہ تو اب میرے ہیرو بنتے جا رہے ہیں۔غضب کا آدمی تھا۔۔۔۔۔۔

ٹائٹل پر سجاد ظہیر کا شعر:

تجھے کیا بتاؤں ہمدم، اسے پوچھ مت دوبارہ　　　کسی اور کا نہیں تھا، وہ قصور تھا ہمارا

پل بھر میں تو مجھے ایسا لگا جیسے یہ شعر محض پاکستان کی سیاسی خستگی اور مفلوک الحال سماجی صورت حال کا احوال بیان کر رہا ہے مگر دوسرے ہی لمحے مجھے لگا نہیں ایسا نہیں، بلکہ یہ شعر تو تیسری دُنیا میں بسے ہوئے ہر اُس انسان کے کرب کا ائینہ ہے جہاں سیاست ایک کاروبار اور سماج کی تعمیر محض ایک مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔۔اور پھر میں جوں جوں جدید ادب کے صفحات پلٹتا گیا، سرورق پر چھپی ہوئی سجاد ظہیر کی تصویر اپنے علمی و ادبی قد و قامت کو نمایاں کرتی چلی گئی۔۔۔سجاد ظہیر کی تخلیقی زندگی سماجی انصاف و آزادی کے حق میں اور مذہبی ریاکاری اور واہمہ پرستی کے خلاف ایک ایسی نظریاتی جدوجہد ہے جس کی ضرورت بالخصوص پاکستان اور بالعموم تیسری دنیا کے پسماندہ انسانوں کے ذہن و مزاج کی تربیت کے لیے بہت ضروری ہے۔ بھائی حیدر قریشی آپ کے اس قیمتی کام نے میرے لیے جس ذہنی تربیت کا بندبست کیا اُس کے لیے بہت سارا خلوص اور دعائیں۔　　**ڈاکٹر بلند اقبال**۔کینیڈا

☆☆☆ جدید ادب کے بارے میں کچھ کہنا ایسا ہوگا جیسے چھوٹا منہ بڑی بات۔پھر بھی کہوں گی کہ اس پرچہ نے اردو دنیا میں ایک نئی امید پیدا کی ہے۔سجاد ظہیر نمبر پا کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔میرے موضوع سے متعلق بہت ساری معلومات اس رسالے میں موجود ہے، کئی نئی چیزیں معلومات میں اضافہ کا موجب بنیں۔اس کے لئے آپ کا بطور خاص شکریہ۔　　**کوثر فاطمہ**۔گلبرگہ (ایم فل کی طالبہ)

☆☆☆ جدید ادب بہترین میگزین ہے۔یورپ کی برفیلی وادیوں میں آپ ادب کی گرمی دے رہے ہیں، بڑا مجاہدانہ کام ہے۔زندہ باد!　　**ظفرالحسن**۔جے پور

☆☆☆ Respected Haider Quereshi Saheb, Adaab

This is ony a note to thank you for bringing out an excellent number of Jadeed Adab on my father, Sajjad Zaheer. You have also carried a piece by me in it, for which I am so grateful. incidentally this piece is part of a book named "Mere hisse ki Roshnai" Have you read the book. If not do send me a note with your postal address so that I can send it to you.

With warm regards and thankyou again.　　**نور ظہیر**۔دہلی

☆☆☆ روزنامہ انقلاب بمبئی کے سنڈے ایڈیشن میں ادبی صفحہ پر آپ کے رسالہ جدید ادب سے متعلق پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ جدید ادب کا تعلق آپ جیسے بلند پایہ قلم کار سے ہے لہذا اس رسالہ کے معیار و وقار کی ایک دلکش تصویر کا ذہن میں ابھرنا اک فطری عمل ہے۔ علاوہ بریں ٹائٹل جدید ادب میں بھی کچھ الگ سی کشش ہے جس کے باعث دل میں یہ خواہش جاگی کہ آپ سے رابطہ کیا جائے اور جدید ادب سے ایک تخلیقی رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ مختصر تعارف: بنیادی طور پر میں فلم رائٹر ہو۔ اور پچھلے اٹھارہ بیس برسوں سے فلموں سے وابستہ ہوں۔ میری لکھی ہوئی قریب پچیس فلمیں اب تک منتظر عام پر آچکی ہیں۔ ادبی سفر کا آغاز کوئی پانچ سال قبل ہوا۔ بالکل معجزاتی طور پر مرحوم خواجہ احمد عباس کو میں اپنا آدرش خیال کرتا ہوں۔ **مراق مرزا**۔ بمبئی

☆☆☆ حیدر قریشی صاحب کے شش ماہی شمارے جدید ادب کا تازہ شمارہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔ اس شمارے کو گذشتہ سال سے عالمگیر سطح پر منائے جانے والے صد سالہ سجاد ظہیر تقاریب کے پیشِ نظر سجاد ظہیر نمبر کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ امر یقیناً تعجب خیز ہے: جو شخص خود جدید ادب کا مدیر ہو، وہ کیسے عرفِ عام میں اس کی مخالف ہی نہیں بلکہ اس سے متصادم اور شاید متحارب ترقی پسند تحریک کے علم بردار کے نام پر یادگار دستاویز معنون کرسکتا ہے؟ اسی سوالیہ پہلو کا مدیر نے کافی لطیف پیرایوں میں جواب دیا ہے۔ اس پُرلطف اظہار کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے، تو اس سے ایڈیٹر کی عالی ظرفی اور حقیقی ادبی خدمت کے جذبے کی جھلک دِکھتی ہے۔ مضامین کے انتخاب اور ترتیب، پروف ریڈنگ اور چھپائی، ہر عمل میں دیدہ ریزی اور عرق ریزی صاف چھلکتی ہے۔ یوں کہیں کہ اس کتاب سے سجاد ظہیر کی شخصیت، فکر انگیزی، ادبی خدمات کی خوشبو جو سرورق پر نمایاں ہے، اُسی انداز میں صفحہ آخر تک بھی تشنگانِ علم کے پورے ماحول کو معطر کر دیتی ہے۔

ایک اور بات جو اکثر ادب شناس غور نہیں کرتے، اسے آج دنیا Zeitgeist کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ دراصل ایک جرمن زبان کا لفظ ہے اور اس کا اطلاق اُن افکار، تصورات اور اُس سوچ پر ہوتا ہے جو کسی دور کا خاصہ بن چکی ہوں۔ اشتراکیت اور موروثی روایات اور عقائد سے بغاوت اُس دور کی پہچان بن چکی تھی جس میں سجاد ظہیر نے قائدانہ انداز میں خامہ فرسائی کے ذریعے اپنی ایک الگ پہچان بنائی تھی۔ مگر ناانصافی ہوگی اگر ایک قلم کار کو صرف اُس کے اعتقادات، سماجی اصول و روایات کے محدود زاویوں جانچا جائے اور اُس کے عبور کردہ سنگہائے میل کو بے لاگ تخلیقی اور علمی کارناموں کی شکل میں نہ دیکھا جائے۔ حیدر قریشی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کیوں کہ انہوں نے ایک ایسا تاریخی دستاویز ترتیب دیا ہے جس میں اشترا کی طوفانوں سے اُبھرنے والی تحریروں اور علم و ادب کے لازوال میزان اُن کی جانچ، پیمائش اور تبصروں کو اِس خوبی سے یکجا کیا ہے جسے مستقبل کے محققین، ادب کے شائقین اور اردو کے عام قارئین ایک شاہکار کے طور پر یاد کریں گے اور استفادہ بھی

اُٹھائیں گے۔ **سید مزمل الدین**۔ حیدرآباد دکن

☆☆☆ آپ نے بہت عمدہ طریقے سے سجاد ظہیر نمبر چھاپا ہے۔ آپ کا اداریہ خاص طور پر اہم ہے۔ آپ نے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار سلیقے سے کیا ہے۔ **ناصر عباس نیر**۔ لاہور

☆☆☆ حیدر قریشی کا ''جدید ادب'' ہر چھ ماہ کے بعد شائع ہوتا ہے۔ اب تک اس کے پانچ شمارے طباعتی صورت کے علاوہ انٹرنیٹ پر بھی پیش ہو چکے ہیں۔ اس کا چھٹا شمارہ ترقی پسند تحریک کے بانی راہنما سجاد ظہیر کے ۱۰۰ ویں یوم ولادت پر ''سجاد ظہیر نمبر'' کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے قافلہ سالار تھے اور ''جدید ادب'' کے مدیر حیدر قریشی ''ایک مزدور کی زندگی بسر کر کے براہ راست زندگی کے بھوگ اور تخلیق کے روگ'' کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن تخلیقی ادب کی طرف آئے تو انہوں نے ترقی پسند فارمولے کے مطابق ادب تخلیق کرنے کی بجائے ''جدیدیت'' کو قبول کیا اور اب حیرت زدہ ہیں ☆ کہ وہ ایک پورا شمارہ ترقی پسند ادیب اور مارکسسٹ سیاسی راہنما سجاد ظہیر (۲۰۰۵ء۔۱۹۰۵ء) کے نام معنون کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس پرچے کے دو اداریوں میں جو نظریاتی بحث اٹھائی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک کشادہ نظر مدیر ہیں اور تنگ نظر اور نظریہ پرست ترقی پسند مدیران کی طرح ''ادبی مارشل لاء'' نافذ کر کے غیر ترقی پسندوں پر اشاعت کی قدغن نہیں لگاتے۔ انہوں نے اداریہ اول میں روشن خیالی کا بنیادی جواز تو علامہ اقبال میں تلاش کیا لیکن حالیہ دور میں ڈاکٹر وزیر آغا اور صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کو بریکٹ کر کے خود بھی چونکے اور تمام اہل ادب کو بھی چونکا دیا ☆☆ جب کہ یہ حقیقت واضح ہے کہ اوّل الذکر کی روشن خیالی مطالعہ ادب کی مرہونِ منت ہے اور پرویز مشرف کا روشن خیالی کا نعرہ سیاست گزیدہ ہے۔ دونوں کو ''بریکٹ'' کرنا کسی طرح مستحسن نہیں۔ ترقی پسند تحریک کی شدت پسندی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

''ترقی پسند تحریک زندگی کے مسائل پر بات کرتے ہوئے عملاً اتنی زیادہ خارجیت پسند ہوئی جا رہی تھی کہ انسان کے باطن سے اور روح کے اسرار سے اسے جیسے کوئی غرض ہی نہ رہی تھی ......تخلیق کار کی آزادی نظریے کی اطاعت گزاری پر مجبور کر دی گئی۔ نظریے کی پیروی کرنے والے تھرڈ کلاس......تخلیق کاروں کو بانس پر چڑھایا جانے لگا اور پارٹی لائن کی پابندی سے انکار کرنے والے لیکن کھرے اور سچے تخلیق کاروں کو نہ صرف نظر انداز کیا جانے لگا بلکہ ان کے ادبی سطح پر سوشل بائیکاٹ کے فیصلے بھی کیے گئے۔'' (صفحہ ٦) اس قسم کے فیصلوں کا پاکستان میں ایک ہدف وزیر آغا ہیں جنہیں بقول حیدر قریشی عام طور پر ترقی پسند تحریک کا مخالف قرار دیا جاتا ہے جبکہ حیدر قریشی نے اعتراف کیا ہے کہ ''ان (وزیر آغا) کے نزدیک وسیع تر زندگی اور اس سے بھی وسیع تر کائنات

کے اسرار پر غور وفکر کرنا زیادہ اہم رہا ہے اور ترقی پسند رویہ زندگی کی صرف ایک قاش کو پیش کرتا ہے۔'' ان کا موقف یہ بھی ہے کہ ''وزیر آغا اپنی بعض تحریروں میں ترقی پسند تحریک کو جدیدیت کی تحریک کی ایک ثانوی تحریک قرار دے چکے ہیں۔'' اور ان کی امتزاجی تنقید میں مارکسی، ارضی ثقافتی اور ترقی پسند روایت منسلک ہے۔'' حیدر قریشی نے اپنے مشاہدے اور مطالعے کی اساس پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''وزیر آغا ترقی پسند تحریک کے مخالف نہیں۔ بس ان کا بات کرنے کا سمجھنے اور سمجھانے کا انداز اپنا ہے۔''

یہاں ''جدید ادب'' کے فاضل مدیر نے یہ بات نظر انداز کر دی کہ وزیر آغا حلقہ ارباب ذوق کی اس تحریک کے سرکردہ رکن تھے جس کو میرا جی، ن۔م۔ راشد، ضیا جالندھری، قیوم نظر اور یوسف ظفر جیسے شاعروں نے فروغ دیا اور خارج کے مشاہدے کو اپنے باطن کی روشنی میں روبہ نظم کرنے کی سعی کی، وہ ترقی پسند تحریک کی نعرہ پسند شاعری اور بلند آہنگ ☆☆☆ کے کل بھی مخالف تھے اور آج بھی اس کی تحسین سے قاصر ہیں۔۔

اس اداریے میں یہ تجزیاتی انکشاف بھی چونکا دے گا کہ ''پاکستان میں فوج وقتاً فوقتاً جس طرح اقتدار میں آتی رہی ہے اس کی ابتدا کا داغ بھی ترقی پسندوں پر لگتا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس کے ملزمان میں جنرل اکبر کے ساتھ فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر جیسے معتبر ترقی پسند شامل تھے۔ اب یہ ترقی پسند تحریک کی بدقسمتی تھی کہ انقلاب ناکام ہوا اور بغاوت اور سازش قرار پایا۔ جیل میں قید بھگتنے کے بعد سجاد ظہیر انڈیا چلے گئے۔'' میرا خیال ہے کہ حیدر قریشی کے اٹھائے ہوئے نکتے پر مستند شہادتوں اور دستاویزات سے تجزیہ نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ ترقی پسند تحریک کی لندن میں گولڈن جوبلی منائی گئی تو اس تنظیم کے ایک سرکردہ لیڈر کو بھی مدعو نہ کیا گیا اور دروغ برگردن راوی انہیں فوج کا مخبر قرار دیا گیا اور یہ حقیقت تو بالکل عیاں ہے کہ ظہیر کاشمیری اور شوکت صدیقی جیسے ثقہ ترقی پسندوں نے سرکار دربار سے تمغے حاصل کیے اور بعض ترقی پسندوں نے تو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کے سامنے بھی گردن خم کر دی اور قطار میں کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا............ان جزوی باتوں سے قطع نظر 'جدید ادب' نے سیّد سجاد ظہیر کو ترقی پسندوں کے مقابلے میں معنی خیز انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس پرچے میں مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، قمر رئیس، علی احمد فاطمی، نور ظہیر اور پروفیسر نذر خلیق کے مضامین قلب ونظر کو متاثر کرتے ہیں۔ اس پرچے سے سجاد ظہیر کی بڑی منور تصویر مرتب ہوتی ہے جو امارت کے گہوارے میں پرورش پانے کے باوجود سچے انسانیت پرست اور غریب دوست تھے۔ ان کے سامنے پاکستان کے بیشتر ترقی پسند ادبا دولت اور شہرت کے پجاری اور ٹٹ پونجئے نظر آتے ہیں اور نظریاتی اختلافات کے باوجود سجاد ظہیر کی عظمت کا نقش مستحکم ہو جاتا ہے اس حصے میں سجاد ظہیر کی نگارشات لطیف کا انتخاب بھی دیا گیا ہے لیکن انہیں ایک بڑا ادیب تسلیم کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔

اس پرچے میں جوگندر پال سے ڈاکٹر غضنفر اقبال کی گفتگو اور مشفق خواجہ کی تحقیق نگاری پر مضمون کی نوعیت مختلف

ہے۔ ان پر مستزاد خاور اعجاز، فراز حامدی، سنجے گوڑ بولے اور ناصر نظامی کے ماہیے اور یعقوب نظامی، فیاض ناروی اور اکبر حمیدی کی کتابوں پر تجزیاتی تبصرے بھی شامل ہیں۔ ''جدید ادب'' نے اردو صحافت اور ادب کو عالمی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ حیدر قریشی اس کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ **ڈاکٹر انور سدید** ۔ لاہور

مطبوعہ ''**الحمراء**'' لاہور اپریل ۲۰۰۶ء

☆ ڈاکٹر صاحب! آپ کو سہو ہوا ہے، سجاد ظہیر نمبر چھاپتے ہوئے مجھے کوئی حیرت نہ تھی، کوئی تذبذب نہ تھا، میرا ذہن واضح تھا اور ترقی پسندی اور جدید ادب کی ساری کشمکش کے باوجود مجھے ان دونوں تحریکوں کے درمیان وہ سارا اچھا تخلیقی ادب دکھائی دے رہا تھا جو دونوں تحریکوں کے تخلیق کاروں نے اردو ادب کو دیا ہے۔

☆☆ یہاں بھی آپ کو سہو ہوا ہے۔ روشن خیالی کے حوالے سے علامہ اقبال اور ڈاکٹر وزیر آغا کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں ہوا۔ انہیں روشن خیالی کے حوالے سے جنرل مشرف کے ساتھ میں نے بالکل بریکٹ نہیں کیا۔ پتہ نہیں آپ نے ایسا کیوں محسوس کیا؟ ڈاکٹر وزیر آغا اور ترقی پسند تحریک کے تعلق کو میں نے ایک دوسرے کے قریب لانے کے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی تھی جبکہ جنرل پرویز مشرف کے حوالے سے روشن خیالی کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے اصلاً تو ان کے ترقی پسندی کے اعلانات پر حیرت اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ماضی کے ایک ''ناکام انقلاب'' کا حوالہ دیا تھا۔ یہ سب اس لئے لکھا تھا کہ مجھے کہیں ہلکا سا شبہ تھا کہ شاید جنرل صاحب ترقی پسندی کا لفظ کسی سرکاری ادیب کے کہنے پر دہرا رہے ہیں۔ چنانچہ جب سے میں نے متعلقہ حصہ کی نشاندہی کرتے ہوئے جدید ادب کا سجاد ظہیر نمبر انہیں بھیجا ہے تب سے انہوں نے ترقی پسندی کی تلقین کرنا چھوڑ دی ہے۔ اب وہ صرف روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی بات کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے میرا اپنے اداریہ میں ان کا حوالہ دینا بہتر ثابت ہوا کہ انہوں نے ترقی پسندی کا لفظ جو لغوی معنوں میں استعمال کیا تھا اس کی تاریخی حقیقت جان گئے۔ پرویز مشرف تو پھر فوجی جنرل ہیں، اردو کے ایک اہم ٹی وی چینل کے معروف دانشور بھی ترقی پسند تحریک سے بے خبری کے باعث پہلے پہل اسے لغوی معنوں میں بیان کرتے رہے۔ یہ وہی سادگی ہے جو ادب سے مراد بڑوں کا ادب کرنا سمجھتی ہے۔

☆☆☆ ادب میں بلند آہنگی اور نعرہ بازی کو وزیر آغا بھی معیوب سمجھتے ہیں، ہم، آپ بھی معیوب سمجھتے ہیں اور چند اہم ترقی پسند ناقدین نے بھی نعرہ بازی کو ادب تسلیم کرنے میں تامل کیا اور ایسے ادب کی تحسین سے گریز کیا۔ آپ سجاد ظہیر نمبر میں درج کئے گئے اقتباسات کو مجموعی طور پر دیکھیں تو توازن کی کاوش دکھائی دے گی۔ اسی لیے اس نمبر سے بعض ترقی پسند دوستوں کو 'عدم توازن' کی شکایت ہوئی ہے۔ بہر حال آپ کے تبصرہ کے لئے شکریہ! (ح۔ق)

انتظاریہ

تیرے نام کیا لکھوں!

پروفیسر حمید سہروردی (گلبرگہ)

لکھوں ہوا کے نام کیا
نہ عقل کی سبیل ہے
نہ قوت شنید ہے
نہ دید ہے
ہوا لکھوں میں تیرے نام
ہوں میں بھی تیرے نام ہی

ہے صاف
دھیمے دھیمے گنگناتے
پانیوں میں تو
ترا ثبوت
ہوا جو تیرے نام ہے
ہوا کی مثل میں بھی ہوں
کڑک ہے بجلیوں کی
جنگلوں کا شور ہے

نمازیوں کے سر
دُھلی سی اجلی ٹوپیاں
ہیں ان کے چہروں پر
چمکتی کالی داڑھیاں
ہیں رحمتیں ہی رحمتیں
چاروں اور رحمتیں

ہے چہرہ کعبے کی طرف
رکوع اور سجدے تیرے نام سب

کہ تیرا نام پاک ہے
قیام وقعدے میں بھی تُو
کہ نام تیرا ہے عزیز صبر کا ثمر
ترے ہی نام میں بھی ہوں

نہیں کہ میں
نہیں کہ وہ
نہیں نہیں
ہیں صورتیں جو اَن گنت
ہیں صورتیں یہ ہر طرف
ہر اک جہت ہے وجہ تو
بس ایک تیرا نام ہے
ترا ہی نام ہے
ترا ہی نام ہے شش جہت میں تیرا نام!

پروین شیر (کینڈا)

انوکھا گھر

بہت پیارا ہے گھر اُس کا
بہت مضبوط، اونچا، آسماں چھوتا ہوا اک گھر
بہت ہی خوبصورت، شہر کا سب سے نرالا گھر
یہ جنت کا نمونہ ہے
سنہرے در ہیں اس کے
اور ہر کھڑکی دریچے پر
چمکتی، جھلملاتی روشنی کا جال سا بُنتے
بہت سے قمقمے دل کو لبھاتے ہیں
اماوس کی سیہ راتوں میں بھی
یہ نُور کی بارش میں بھیگا جگمگاتا ہے
سجاوٹ کا ہر اک سامان ہے موجود
گھر کے سارے کمروں میں
سنہرے پھول، فوارے،
ہرے پودے ہیں پائیں باغ کی ہر اک کیاری میں

بہت پیارا ہے گھر اس کا
بہت مضبوط مرمر کی قبا پہنے ہوئے ہیں فرش، دیواریں
یہ گھر جنت نشاں ہے، شہر کا سب سے نرالا گھر
مگر ایسا انوکھا ہے
نہیں ہے کوئی چھت اس پر۔۔۔!!

پروین شیر

پیدائشی روگ

وہ عجب شخص ہے ! ر مضمحل، ناتواں
ضعفِ اعضا، نقاہت کا مارا ہوا
سب عزیز واقارب پریشان ہیں
ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ کوئی معالج تو ایسا ملے
جو بتائے کہ آخر اسے کونسا روگ ہے؟
ہیں یہ کیسے جراثیم اس کے بدن میں سمائے ہوئے
کھا رہے ہیں جو لحظہ بہ لحظہ اسے
اس کا مفلوج پیکر بھلا کونسے روگ کے خول میں قید ہے
ایک بسمل کی مانند زندہ ہے وہ
زیرلب سسکیاں، بے صدا آہ وفریاد ہے
خشک ہونٹوں پہ ہے تشنگی کا سمندر سا بکھرا ہوا
ذہن بے نور ہے، آرزو سے تہی
اَدھ کھلی آنکھیں جیسے خلاؤں پہ مرکوز ہیں
کاش کوئی بتائے کہ آخر اسے کون سا روگ ہے؟
کس دوا سے یہ موذی جراثیم مرجائیں گے؟
اور پھر ایک دن۔اک معالج نے تشخیص کر ہی لیا
یہ بتایا کہ پیدائشی روگ ہے لا دوا/اس کا جینا فقط اک
کرامت ہی ہے ر معجزہ ہے کہ اب تک وہ زندہ رہا
کوئی امید بچنے کی اب چھوڑ دیں
ایک دل اس کے سینے میں موجود ہے
ذہن کی جگہ اک دوسرا دل مگر
اُس کے سر میں بھی ہے!!